لستم پوخ

روحانیوں کے عالمی پایۂ تخت استنبول میں گیارہ دن

لستم پوخ

روحانیوں کے عالمی پایۂ تخت استنبول میں گیارہ دن

راشد شاز

ملی پبلی کیشنز، نئی دہلی

سال اشاعت ۲۰۱۵ء

Lastampokh
by
Rashid Shaz

نام کتاب	:	لستم پوخ
مصنف	:	راشد شاز
اشاعت اول	:	۲۰۱۳ء
اشاعت ثانی	:	۲۰۱۵ء
قیمت	:	۲۵۰ روپئے
مطبع	:	بوسکو سوسائٹی فار پرنٹنگ، نئی دہلی

ISBN: 978-93-81461-14-3

مصنف کی کتابیں مفت ڈاؤن لوڈ کیجئے:

www.RashidShaz.com

ناشر

ملی پبلی کیشنز

ملی ٹائمز بلڈنگ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۲۵

Tel:+91-11- 26946246, 26945499
Fax: +91-11-26946246
Email: millitimes@gmail.com
www.barizmedia.com
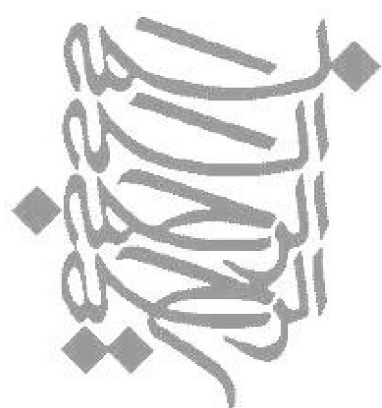
تاکہ سند رہے

یہ کتاب حقیقی مشاہدات پر مبنی ہے البتہ طوالت سے بچنے کی خاطر بعض کرداروں کو بعض کرداروں میں ضم کر دیا گیا ہے تاکہ ایک طویل بیانیے میں قاری کی توجہ محورِ گفتگو پر مرکوز رہ سکے، اور اس طرح بعض حقیقی شخصیات کی اصل شناخت کی پردہ داری کا راستہ بھی نکل آئے۔ اس کے باوجود اگر کسی شخصی، زمانی یا مکانی مماثلت کے سبب کسی کو ایسا محسوس ہو کہ اس کی ذات یہاں معرض بحث ہے تو اسے محض اتفاق پر محمول کیا جانا چاہئے۔ میں نے اپنی بساط بھر اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ اپنے مشاہدے کا لب لباب کچھ اس طرح بلا کم وکاست آپ کے سامنے رکھ دوں کہ حقائق مجروح ہوں اور نہ ہی کسی کی دل آزاری ہو۔

فہرست

اللهم أرني الأشياء كما هي

بارالہا! مجھے چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسی کہ وہ ہیں

(حدیث)

۱
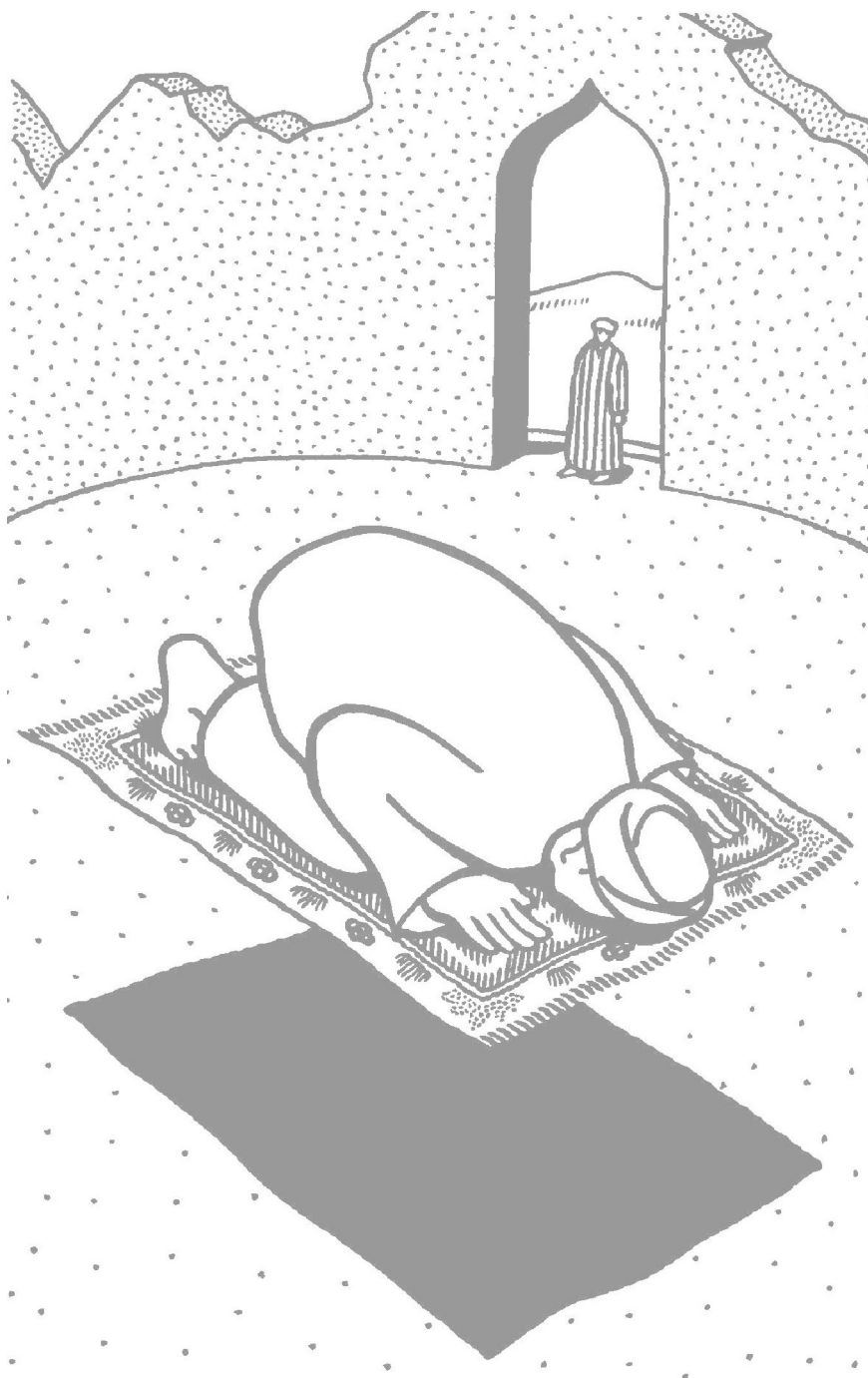
بلاوا

استنبول میں میرے قیام کا یہ تیسرا دن تھا۔ گرانڈ جواہر ہوٹل کی لابی میں خاصی چہل پہل تھی۔ ابھی کانفرنس کو شروع ہونے میں خاصا وقت باقی تھا۔ علماء کی عالمی انجمن کے شرکاء چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں باہم غیر رسمی ملاقاتوں اور تبادلۂ خیال میں مصروف تھے، کہیں طربوش کی جلوہ نمائی، کہیں سفید عماموں کی سج دھج، کہیں کج کلاہی کی فراوانی، قدسی لباسی کے اس ہنگامے میں سوٹ اور ٹائی کی کرّ وفر بھی گاہے اپنے وجود کا احساس دلا جاتی تھی۔ علماء لباسی کے اس منظر نامے کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا گویا کوئی آسمانی مخلوق زمین پر اتر آئی ہو۔

ابھی میں نے لابی کا رخ کیا ہی تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کے منحنی سے شخص نے میرا راستہ روکا۔

السلام علیکم! میرے پاس آپ کے لیے ایک انتہائی اہم پیغام ہے بلکہ دعوت نامہ کہہ لیجئے۔

میں نے کسی قدر حیرت واستعجاب سے اس کی طرف دیکھا۔ نسلاً تو وہ کوئی عام سا ترک معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے چہرے بشرے پر سکینت کی جو کیفیت طاری تھی اس سے ایسا لگتا تھا گویا وہ کسی اور دنیا کا باسی ہو۔ کہنے لگا کہ میں آپ کے لیے میزبان رسولؐ حضرت ابوایوب انصاری کا ایک پیغام لے کر حاضر ہوا ہوں۔ میں ان کا فرستادہ ہوں۔ انہوں نے آپ کو طلب فرمایا ہے۔ ابھی اور اسی وقت۔ کیا آپ میرے ساتھ چلنا چاہیں گے؟

ابھی میں کچھ سمجھنے کی ہی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کہنے لگا کہ یہاں دنیا بھر سے کوئی چار سو علماء تشریف لائے ہیں لیکن طلبی کا قرعہ صرف آپ کے نام نکلا ہے۔ ابھی یہ مکالمہ جاری ہی تھا کہ ایک مقامی ترک شناسا ہم سے

آ ملے۔شاید انہوں نے میرے تحفظ کو بھانپ لیا ہو، اشاروں اشاروں میں انہوں نے اپنی تائید کی مہر ثبت کی اور میں نے اس غیبی فرستادہ کے ہمراہ چلنے کی حامی بھر لی۔

باہر پورٹیکو میں ایک نوجوان جوڑا ٹیکسی میں ہمارا منتظر تھا۔ہم لوگوں کو دیکھتے ہی دونوں احتراماً باہر نکل آئے۔سیدی امین نے ان لوگوں سے میرا تعارف مہمانِ خاص کی حیثیت سے کرایا اور ہماری ٹیکسی آگے چل پڑی۔اب جو دورانِ سفر گفتگو کا سلسلہ دراز ہوا تو سیدی امین کی تہہ دار شخصیت سے پرتیں اٹھنے لگیں۔ یہ پر اسرار فرستادہ مرمرا یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر تھا۔کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد ہماری ٹیکسی ایک گنجان آبادی والے علاقے میں جا رُکی۔سیدی امین بجلی کی سرعت کے ساتھ کہیں غائب ہو گئے۔ چند ثانیے بعد ایک بوسیدہ سی مختصر کار میں برآمد ہوئے۔نوجوان جوڑے نے یہیں ان سے رخصت لی۔سیدی امین نے ان دونوں کے ماتھے پر اپنی شفقت کا لمس ثبت کیا۔ان لوگوں نے ان کے ہاتھ کو چومنا چاہا لیکن وہ بڑی خوبصورتی سے طرح دے گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ سیدی امین کے ساتھ ان دونوں کا رشتہ عقیدت ومحبت کا ہے۔تو کیا سیدی امین دراصل کوئی روحانی شیخ ہیں جنہوں نے پروفیسری کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے؟ ابھی میں اسی مخمصہ میں گرفتار تھا کہ انہوں نے اسٹیرنگ کو بعجلت جھٹکا دیا اور ہماری کار اصل منزل کی طرف چل پڑی۔

مقبرۂ ابوایوب کے احاطے میں جب ہم داخل ہوئے تو اس وقت وہاں کچھ زیادہ چہل پہل نہ تھی۔وسیع وعریض علاقے پر پھیلا ہوا آثار ومقابر کا یہ سلسلہ جیسا کہ انتظام وانصرام سے ظاہر تھا، دن ڈھلے زائرین کی آماجگاہ بن جاتا ہوگا۔اندر زائرین دور تک منظّم قطاروں میں اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ابھی میں اس قطار کی جانب بڑھا ہی چاہتا تھا کہ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا، جیب سے عقبی دروازے کی چابی نکالی، اپنے ہاتھوں سے دروازہ کھولا، چوکھٹ پر اپنے ماتھے کو کچھ دائیں اور کچھ بائیں جانب سے مَس کیا اور پھر میرا ہاتھ پکڑے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔منتظمین کو مقامی زبان میں کچھ ہدایات دیں اور پھر دوسری چابی سے قبرابوایوب کے گرد حجرۂ خاص کا دروازہ بھی کھول دیا۔اس توجہ خاص پر ابھی میں مبہوت ہی تھا کہ انہوں نے اپنی کوٹ کی جیب سے کیمرہ نکالا اور ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ ہم دونوں کی اس حاضری کو ان کے کیمرے میں محفوظ کر لے۔ قبر کے اردگرد زائرین کی سہولت کے لیے قالینیں بچھی تھیں۔زائرین کے چھوٹے چھوٹے گروہ مختلف گوشوں میں اوراد ووظائف کے عمل میں مصروف تھے۔البتہ بھیڑ اس گوشہ میں سب سے زیادہ تھی جہاں شیشہ کے فریم میں قدمِ حضرت ابوایوب کے نشانات آویزاں تھے۔آثارِ قدم کے اردگرد دعا پڑھنے یا مانگنے والوں کی اس بھیڑ

کو دیکھ کر میں نے اپنے میزبان سے پوچھا یہ لوگ یہاں کیا پڑھ رہے ہیں۔ کیا تمہارے ہاں کوئی دعائے قدم بھی ہوتی ہے؟ میرے اس سوال پر سیدی امین نے معنی خیز سکوت اختیار کیا۔

مزار کی عمارت سے باہر پانی کی سبیل پر کچھ لوگ پانی پی رہے تھے، کچھ وضو میں مشغول تھے اور کچھ سبیل کی جالیوں کو عقیدت سے تھامے زیرلب دعاؤں میں مصروف تھے۔ اسی مسجد کے سایہ میں سیدی امین کا دفتر بھی واقع تھا جہاں ہم لوگوں نے چائے پی۔ میز کی دراز سے سیدی امین نے روٹی کا ایک ٹکڑا نکالا۔ پھر اس کے دو حصّے کیے۔ ایک حصّہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا تبرّک تبرّک! یعنی یہ اس ضیافت خاص کی مناسبت سے ہے، اسے کھالو۔ چائے کے ساتھ خشک روٹی کا یہ ٹکڑا کھایا گیا۔ چلتے ہوئے انہوں نے مجھے پتھر کا ایک ٹکڑا پیش کیا جس پر مختلف رنگوں سے معصوم طفلانہ ہاتھوں نے قبرِ ابوایوب اور ملحقہ آثار کی شبیہہ بنا رکھی تھی۔ کہنے لگے رکھ لو فقیر کا یہ تحفہ سفر کی یادگار رہے گا۔ بظاہر یہ آرٹ کا نمونہ ہے لیکن اسے نسبت میزبان رسولؐ کی قبر سے ہے۔ اس دوران سیدی امین کا فون بجا۔ مکالمہ سے فارغ ہوئے تو کہنے لگے کہ میری بیوی اور بیٹی حضرت ابوایوب کے ہندوستانی مہمان سے ملنے کی خواہاں تھی۔ وہ دونوں یہاں آنا چاہتے تھے لیکن ابھی ابھی فون آیا کہ انہیں ایک ایمرجنسی صورت حال کے پیش نظر اپنے پروگرام میں تبدیلی کرنا پڑی ہے۔

زیارتك مبروكة یارا شد! سیدی امین نے زور سے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ ان کی آنکھوں میں وہ چمک پیدا ہوئی جو کسی اہم معرکہ کی کامیابی پر ہوتی ہے۔ میں نے جواباً شکریہ ادا کیا۔ ہوٹل کے صدر دروازے تک وہ مجھے اپنی کار میں لے کر آئے۔ نم آنکھوں کے ساتھ الوداعی معانقہ کیا۔ زیارتك انتهت کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک پیدا ہوئی اور چند ثانیے میں میزبان رسولؐ کا پراسرار فرستادہ اپنی بوسیدہ سی کار میں یہ جا وہ جا ہوگیا۔ یہ پتھر اگر میری جیب میں نہ ہوتا تو میں اسے محض ایک خواب سمجھتا لیکن ابھی تو منھ میں تبرّک والی روٹی کا ذائقہ بھی باقی تھا۔

۲

آسمانی مخلوق

اندر کانفرنس ہال کا منظر نامہ آج خاصا مختلف تھا۔شرکاء کے درمیان بیلٹ پیپر تقسیم ہو رہے تھے۔انہیں نئی میقات کے لیے نئے صدر اور نئے عہدے داروں کا انتخاب کرنا تھا لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ علماء و دانشوروں کے اس انبوہِ عظیم سے چند ناموں کا انتخاب کیسے کیا جائے سو ذمہ داروں نے اس کا حل یہ نکالا تھا کہ وہ خود ہی کچھ لوگوں کو ممکنہ امیدوار کے طور پر پیش کر دیں لیکن ان میں بہت سے اصحاب ایسے بھی تھے جن کا دائرہ اثر مقامی تھا جو اپنے اپنے شہروں میں کسی مسجد کے خطیب یا مقامی مفتی ہونے کے سبب خاصے معروف اور مؤثر تھے البتہ باہر کی دنیا ان کے مقام و مراتب سے ناواقف تھی۔عام شرکاء کے لیے امیدواروں کی یہ فہرست صرف ناموں کا مجموعہ تھی وہ اس کے پیچھے قائم و دائم شخصیت سے قطعاً ناواقف تھے۔پھر کسی خاص نام کو ترجیح دینے کی کوئی بنیاد سمجھ میں نہ آتی تھی۔ابھی میں اسی شش و پنج میں ناموں کی اس بے روح فہرست کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ مائک پر یہ صدا بلند ہوئی کہ جن لوگوں کے نام فہرست میں شامل ہیں وہ باری باری سے اسٹیج پر سامنے آئیں اور اپنے آپ کو مجمع عام میں متعارف کرائیں۔بعضوں کے لیے یہ امر شاق تھا، بعض اسے ہنسی خوشی جھیل گئے۔خاصی تگ و دو کے بعد بھی یہ گتھی نہ سلجھ سکی کہ امیدواروں کی اس طویل نامزد فہرست میں ووٹ کا مستحق کون ہے البتہ نائب صدور کے لیے یہ بات پہلے سے ہی طئے کر لی گئی تھی کہ حسب سابق ان میں ایک اہل تشیع میں سے ہوگا اور ایک نشست پر اباضی فرقہ کے عالم کو جگہ دی جائے گی کہ صدارت پر سنّی عالم کے تمکن کو استناد

اسی طرح فراہم ہوسکتا تھا۔ ہال کے ایک گوشہ سے جہاں خواتین کا جمگھٹا تھا احتجاجاً مرشحات مرشحات کی صدا بلند ہورہی تھی۔ انہیں اس بات کی شکایت تھی کہ امیدواروں کی فہرست میں ان کی قوم کو عمداً نظر انداز کردیا گیا تھا۔ منتظمین جمہوریت کے فن میں کہنہ مشق معلوم ہوتے تھے۔ وہ شاید اس بات سے واقف تھے کہ مختلف الخیال آوازوں کی یہ بازگشت جس پر اظہار خیال کی آزادی کا دھوکہ ہوتا ہے یہ سب کچھ چند گھنٹوں میں ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اور بالآخر جمہوریت کے باکس سے وہی کچھ برآمد ہوگا جو انہیں مطلوب ہے۔

کانفرنس ہال کے عین عقب میں جہاں چائے کا اہتمام تھا اب لوگ گول میزوں کے درمیان حلقوں میں بیٹھنے لگے تھے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک انتہائی مرصع سی روحانی شخصیت جن کے ایک ہاتھ میں ایک نازک سی خوبصورت چھڑی اور دوسرے ہاتھ میں ایک قلم ہے، کچھ کتابیں لیے ایک میز پر بیٹھے ہیں کبھی خلا میں گھورتے ہیں اور کبھی اپنی ڈائری میں کچھ لکھتے جاتے ہیں۔ ایسا لگا جیسے دیکھے دکھائے سے ہوں، شاید ان سے کہیں پہلے بھی ملاقات رہی ہو۔ اچھا تو یہ وہی حضرت ہیں جنہیں اس بات کا شکوہ ہے کہ علماء کی اس بین الاقوامی یونین میں صوفیوں کو نمائندگی سے محروم رکھا گیا ہے۔ شیخ احمد جیلانی استنبول میں ایک بڑا حلقۂ اثر رکھتے ہیں۔ کل شام جب وہ ملے تھے تو انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جیلانی طائفہ کے سربراہ ہی نہیں بلکہ عبدالقادر جیلانی کی ذریت سے بھی ہیں اور انہوں نے ابھی حال میں عبدالقادر جیلانی کی تفسیر قرآن چھ جلدوں میں شائع کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ لیکن کل جب ان سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس تھے، آج جو کلاہِ صوفیانہ کے ساتھ مشرقی لباس میں جلوہ گر ہوئے اور ہاتھ میں چھڑی تھام لی تو ان کے گرد تقدس مآبی کا ایک ظاہری طلسم قائم ہوگیا سو بیک نظر مجھے پہچاننے میں دشواری ہوئی۔

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب علماء لباسی کا یہ منظر مجھے خوف اور ہیبت میں مبتلا کردیتا تھا۔ تب علماء وزہاد کے بارے میں میرا تاثر دور کے جلوے پر مبنی تھا۔ اب جو قریب سے انہیں دیکھنے کا موقع ملا تو وہ خوف جاتا رہا جو اجنبیت کے سبب جنم لیتا ہے اور وہ ہیبت بھی کافور ہوگئی جس کا سبب علم و تقویٰ کا مفروضہ طلسم تھا۔ قریب سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ ان جبّہ و دستار کے پیچھے جس کا تقدس دل و نظر کو مبہوت کیے دیتا ہے عام آدمی بستے ہیں اور بسا اوقات تو بہت ہی عام آدمی۔ علماء کی اس کانفرنس میں طرحدار جبّہ پوش و دستار کے اس غیر معمولی مظاہرے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ منتظمین نے شرکاء سے یہ خاص طور پر اپیل کر رکھی تھی کہ وہ اس موقع پر اپنے اپنے ملکوں میں رائج علماء کے لباس کو زیب تن کرنے کا خاص اہتمام کریں۔ سو علماء لباسی کی اس بہار پر گاہے مولویانہ فیشن شو کا گمان ہوتا

تھا۔ افتتاحی اجلاس میں جہاں پریس کے کیمرے کہیں زیادہ فعال ہوتے ہیں، پہلی صف میں طربوش برادروں نے کچھ اس شان سے اپنی جگہ سنبھالی کہ کیمرے کی کلک کلک ان ہی کے گرد مرکوز رہی۔ پریس کی بھی بہر حال اپنی مجبوری تھی۔ علماء کے اس اجلاس کی نمائندگی جبہ و دستار کے علاوہ بھلا آخر اور کس چیز سے ہو سکتی تھی۔

تو کیا علماء کا یہ مخصوص لباس، یہ کلاہ و طربوش کے مظاہرے، شریعت کی طرف سے عائد کردہ کسی مخصوص پابندی کا حصّہ ہیں؟ میں نے ایک نوجوان مصری طربوش بردار سے پوچھا۔ پہلے تو وہ اس سوال پر ہی جز بز ہوئے پھر کسی قدر سنجیدگی سے کہنے لگے ہمارے خیال میں اس کا رشتہ مذہب سے کم اور ثقافت سے زیادہ ہے۔

کون سی ثقافت؟ وہ جو اجنبی ثقافت سے اثر پذیر ہوئی یا وہ ثقافت جس کی بنیادیں قرآن مجید اور اسوۂ رسولؐ میں پائی جاتی ہیں۔

فرمایا: ہر قوم کا ایک شعار ہوتا ہے جو اس کے لباس، رہن سہن اور طرز زندگی سے ظاہر ہوتا ہے سو علمائے اسلام کا بھی ایک لباس ہے جس سے وہ دور ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ عام لوگ ان سے اعلیٰ اخلاق و کردار کی توقع کرتے ہیں اور وہ اپنے اس عالی مقام کے سبب لوگوں کے درمیان خود کو ایک بہترین نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

لیکن مصر ہو یا لبنان، اردن ہو یا شام، ان تمام ممالک میں عیسائی، یہودی اور مسلم علماء کے جبہ و دستار میں کچھ زیادہ فرق نہیں، سوائے اس کے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی کلاہیں مختلف ہوتی ہیں اور وہ صلیب اور دوسری علامتوں سے پہچانے جاتے ہیں بلکہ عیسائی علماء تو بسا اوقات اتنے مشابہ ہوتے ہیں کہ اگر ان کے گلے میں صلیب آویزاں نہ ہو تو ان پر شیخ الاسلام ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے۔

میں اردن اور شام کی بابت تو نہیں کہتا لیکن ہمارے ہاں مصر میں ازہری علماء اپنے خاص طربوش کے سبب پہچانے جاتے ہیں اور اب اسے اتنی مقبولیت مل گئی ہے کہ ترک خلافت کے سقوط کے بعد اس طربوش نے عثمانی کلاہِ لالہ رنگ کی جگہ لے لی ہے۔

اچھا یہ بتائیے کہ لباس کی تراش و خراش تو وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ کبھی کلاہِ طویل کے بجائے طربوش نے فیشن اختیار کیا اور کبھی اماموں نے اپنی سج دھج کے نئے انداز پیدا کیے۔ البتہ یہ سوال اہم ہے کہ علماء کا لباس عام لوگوں سے مختلف کب سے ہونے لگا کہ عہدِ رسولؐ یا عہدِ صحابہؓ میں تو اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

میرے اس سوال پر شیخ یاسر نے کچھ پریشانی محسوس کی۔ دیکھئے میں تاریخ کا آدمی نہیں ہوں البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ صدیوں سے علمائے اسلام کا ایک مخصوص لباس، مخصوص رہن سہن اور علم وتقویٰ کا معیار عام لوگوں سے الگ اور بلند رہا ہے۔ ہر شخص کو اس بات کی آزادی حاصل ہے کہ وہ جیسا لباس چاہے پہنے، چاہے تو پتلون پہنے اور چاہے تو جلابیہ اختیار کرے، پھر اگر علماء نے اپنے لیے کوئی خاص لباس اختیار کیا ہے تو انہیں آپ اس حق سے کیوں محروم کرنا چاہتے ہیں؟

بات لباس کی آزادی کی نہیں بلکہ اعتراض تو مخصوص لباس کے اصرار پر ہے۔ کیا آپ نے کانفرنس کے منتظمین کی یہ ہدایات نہیں پڑھیں جس میں شرکاء سے گزارش کی گئی ہے کہ وہ افتتاحی اجلاس میں اپنے اپنے ملکوں میں رائج طبقۂ علماء کا لباس پہن کر شریک ہوں۔ کیا یہ اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ ہم ایک طرح کی سطح بینی کے شکار ہو گئے ہیں۔ ہم شاید مرصع کلاہ کے ذریعہ اپنی کج کلاہی کا مداوا چاہتے ہیں۔ ہماری تمام تر توجہ طربوش کی آراستگی اور اس کی تراش خراش پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے۔ اس صورت حال نے ہمارے سروں کو عملاً cap-stand میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ بات ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے کہ سر کا اصل کام غور وفکر اور نئے خیالات کی آبیاری ہے۔ ٹوپی، طربوش یا غترہ رکھنا نہیں۔

میری گفتگو شیخ یاسر کے طبع پر گو کہ گراں گزر رہی تھی لیکن وہ دلچسپی سے میری باتوں کو سن رہے تھے۔ کہنے لگے اچھا یہ بتائیے علماء اگر اپنے لباس سے دست بردار ہو جائیں تو عام لوگ رشد و ہدایت کے لیے کس سے رجوع کریں گے؟ اور پھر طبقۂ علماء ہی آخر تنقید کی زد پر کیوں رہتے ہیں۔ ڈاکٹر، وکیل، جج، موظف ہر کوئی اپنے مخصوص لباس سے پہچانا جاتا ہے۔

تو کیا علماء بھی دوسرے پیشہ ور ماہرین کی طرح اہل فن کا ایک طبقہ ہیں جو نجات کے روحانی کاروبار میں یدطولیٰ رکھتے ہیں؟ میں نے گفتگو کو منطقی انجام تک پہنچانے کی کوشش کی۔ عرض کیا کہ اگر ایسا ہے تو اسلام اسی صورت حال کے خاتمے کے لیے آیا تھا۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ رسول اللہ کے وصال کے تین چار صدیوں بعد ہی حریت فکری کے اس دین میں علماء وزہاد کے حوالے سے مشائخیت نے اپنی جگہ بنالی۔

شیخ یاسر کی کافی ختم ہو چکی تھی اور میرے مقامی میزبان بھی مجھے لینے کے لیے آ گئے تھے جن کے ساتھ آج شام مجھے بعض احباب سے ملاقات اور بعض مقامات کی سیر کے لیے جانا تھا۔

۳

وہ آنے والے ہیں

باہر موسم ابر آلود تھا۔ ہلکی پھلکی خوشگوار بونداباندی ہورہی تھی۔ عامر مجھے اپنے ساتھ لے کر ساحل سمندر پر واقع ایک پرفضا قہوہ خانے میں آئے۔ گولڈن ہارن کا یہ قہوہ خانہ شام ڈھلے دانشوروں اور فنکاروں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانے کا محاورہ شاید ایسی ہی جگہوں کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ چند سال پہلے تک ایک ہی وضع کے دانشور یہاں دکھائی دیتے تھے لیکن اب نئی سیاسی تبدیلی کے بعد گاہے اسکارف اور گاہے بے ریش طربوش کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ خاندانی طور پر عامر کا تعلق سعید نورسی کے ایک طائفے سے ہے لیکن وہ ادھر چند برسوں سے ترکی کی ایک نئی ابھرتی شخصیت ہارون یحییٰ کے حلقۂ مریدان میں شامل ہوگئے ہیں۔ چائے کے دوران ان کا موبائل مستقل بجتا رہا۔ پتہ چلا کہ نصف شب کو بارہ بجے اسٹوڈیو میں ہارون یحییٰ کے ساتھ میری دو گھنٹہ کی ملاقات اور گفتگو کے انتظامات مکمل ہوگئے ہیں۔ اس نے بتایا کہ یہ گفتگو اسٹوڈیو میں اس لیے منعقد کی جارہی ہے تاکہ اسے ٹیلی ویژن کے ناظرین بڑے پیمانے پر دیکھ سکیں۔

وقت مقررہ پر ہم لوگ اسٹوڈیو پہنچے۔ رات کے وقت پہاڑی سے نیچے سمندر کا منظر نصف شب کی جھلملاتی روشنی میں ماحول پر ایک پُر اسراریت طاری کررہا تھا۔ اونچے نیچے راستوں اور مختلف سیڑھیوں کو عبور کرتے ہوئے جب ہم عمارت میں داخل ہوئے تو کارکنوں کی چابکدستی سے ایسا محسوس ہوا گویا شبینہ کام کرنے والوں کی تازہ دم ٹیم نے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی ہوں۔ سامنے کے کمرے سے نیلے رنگ کے سوٹ میں ہارون یحییٰ برآمد ہوئے۔ بارہ بجے کا عمل تھا اور ان کے چہرے پر تھکاوٹ کے کوئی آثار نہ تھے۔ جبکہ میں کسی قدر تھکا ہوا شب و

روز کے معمولات کا قیدی، خود کو اپنی اس آرام پسندی پر دل ہی دل میں لعنت ملامت کر رہا تھا۔ گرم جوش استقبال اور اس سے کہیں گرم جوش معانقے کے بعد انھوں نے میری داڑھی کا بوسہ لیا۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے کہ انشاء اللہ آئندہ دس برسوں کے اندر ہمارے درمیان مہدی کا ظہور ہو جائے گا۔ ابھی میں اس اچانک حملہ سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ انہوں نے اپنی اس بشارت پر ایک بار پھر اصرار کیا۔ ہاں یقین جانو وہ بس اب آنے والے ہیں۔ دس سال کے اندر، ان شاء اللہ تم دیکھ لینا۔

جی وہ تو آ چکے ہیں، میں نے مزاحاً زیرلب کہا۔ مترجم نے شاید مصلحتاً یا سہواً میری جوابی بشارت کی سنی ان سنی کر دی۔

توقع تھی کہ فاضل مصنف کے ساتھ دو گھنٹے کے طویل دورانیے میں اسلام اور مسلمانوں سے متعلق بہت سے اہم امور پر تبادلۂ خیال ہوگا۔ لیکن ابتدا ہی میں ظہور مہدی کی بشارت سے کچھ اندازہ ہونے لگا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ گذشتہ شب فاضل مصنف کی تازہ ترین تصنیف ترک اسلامی یونین کے قیام کی دعوت مجھے دیکھنے کو ملی تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے ترک قوم اور اسلام کے احیاء کے لیے ترکوں کی قیادت میں ایک بار پھر عالم اسلام کی تنظیم نو کا منصوبہ پیش کیا تھا سو بات اسی حوالے سے شروع ہوئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ترک قوم کی تاریخی اہمیت اور عثمانی ترکوں کے ہاتھوں میں کوئی پانچ سو سالوں تک عالم اسلام کی قیادت کے سبب کسی بھی نئے منصوبے میں ان کا دعویٰ خاصا مضبوط ہے لیکن عالم اسلام کے اس نئے اتحاد کی بنیاد ترک قومیت ہوگی یا اسلام یا دونوں؟ پھر دوسری اقوام کو خواہ وہ ہندی ہوں یا ایرانی، عرب ہوں یا افریقی انہیں مرکزی اور مؤثر رول سے کیوں کر محروم کیا جا سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عالم اسلام کی فقہی اور مسلکی گروہ بندیاں، شیعہ سنّی اور حنفی وہابی کی تقسیم کسی بھی نئے احیائی منصوبے کو آگے بڑھنے سے روک دیتی ہے۔ یہ سوال اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ مستقبل کے عالم اسلام میں کس فقہ، مسلک یا گروہ کو دین مبین کے سرکاری قالب کی حیثیت سے قبول کیا جائے گا۔ ہارون یحیٰی نے اس مسئلہ کا فی نفسہٖ کوئی حل پیش کرنے کے بجائے اسے مستقبل کے مہدی کے سر ڈال دیا۔ کہنے لگے مہدی کے ظہور کے بعد یہ تمام مسائل اپنی اہمیت کھو دیں گے۔

خدا کرے ایسا ہی ہو لیکن ہماری معاصر تاریخ باہمی جدالِ فقہی سے لہولہان ہے۔ کوئی ہزار سال ہوئے، جب سے ہم مختلف مذاہب اور فقہی خیموں میں تقسیم ہوئے ہمارا فکری اور سیاسی زوال رو کے نہیں رکا۔ ابھی حال کی بات ہے افغانستان میں ہم نے وقت کی سب سے بڑی فوجی طاقت کو شکست سے ہمکنار کیا لیکن روسی

افواج کی واپسی کے بعد ہماری تلواریں آپس میں الجھ کر رہ گئیں۔ ہزاراشیعوں کے لیے سنّی اسلام کی بالادستی نا قابل قبول رہی اور خود سنیوں کے مختلف فرقوں کے لئے طالبان کا دیوبندی اسلام تعزیر و تعذیب بن کر رہ گیا۔ میں نے سوال کی دھار کچھ اور تیز کرنے کی کوشش کی ان سے یہ پوچھنا چاہا کہ وہ ان مسائل سے کس طرح نبرد آزما ہوں گے؟

فرمایا: مہدی کا ظہور ہی ان تمام مسائل کا حل ہے اور بس اب وہ لمحہ آنے کو ہے۔ میں تم سے ایک بار پھر کہتا ہوں کہ ان شاء اللہ اگلے دس برسوں کے اندر ان کا ظہور ہو جائے گا۔

لیکن اس بشارت کے لیے آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟ خدا کی کتاب اور رسول اللہ کی حدیثیں انہوں نے بڑے اعتماد سے فرمایا۔

کیا قرآن مجید ہمیں ظہور مہدی کے بابت مطلع کرتا ہے؟ میں نے تخصیص کے ساتھ جاننا چاہا۔ کہنے لگے کہ قرآن مجید میں تو صرف اشارات موجود ہیں وضاحت نہیں البتہ احادیث میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان کے ظہور کی تفصیلات موجود ہیں۔ میں نے ایسی سیکڑوں حدیثوں کو اپنی ویب سائٹ پر جمع کر دیا ہے۔

اچھا یہ بتائیے کہ دس سالوں میں ظہور کی بابت آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟

بولے: سیوطی نے ایک حدیث کے حوالے سے دنیا کی عمر سات ہزار سال لکھی ہے۔ بعثت نبوی سے لے کر اب تک جو عرصہ گزرا ہے اور جو آگے گزرنے والا ہے اس کے باریک بین تجزیے کے بعد میں نے یہ مدت متعین کی ہے لیکن آپ جس طرح کے دلائل چاہتے ہیں اور جس درجے کا اطمینان قلب آپ کو درکار ہے اس کے لیے مجھے کوئی دس بارہ گھنٹوں کا وقت چاہیئے تاکہ میں ان تمام شواہد اور دلائل کو منظم انداز سے آپ کے سامنے رکھ سکوں۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے کچھ اکتاہٹ کا اظہار کیا اور اپنے رفقاء کو اس بات کا عندیہ دیا کہ یہ ملاقات اب کبھی اور ہوگی۔

مجھے جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ شاید میں نے ابتداء ہی میں مہدی کے مسئلہ میں الجھ کر اصل گفتگو کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ لیکن جب ساری تان مہدی کے ظہور پر ٹوٹتی ہو تو پھر میں کرتا بھی کیا۔ صورت حال کی درستگی کے لیے میں نے عرض کیا کہ میرے ان سوالات سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کا مخالف ہوں یا آپ کو زچ کرنا میرا مقصد ہے، میں تو آپ کے ان کاموں کا قدرداں ہوں جو ڈارون کی مخالفت میں آپ نے انجام دیئے ہیں اور جس کے طفیل نئی نسل میں اسلام کی طرف واپسی کا داعیہ پیدا ہوا ہے۔ البتہ جب معاملہ مہدی سے

متعلق روایتوں کا آئے گا تو وحی اور عقل کی روشنی میں اس کی چھان بین ضروری ہوگی کہ ہم اپنے مستقبل کو سنی سنائی بے اصل خوش گپّیوں کے حوالے نہیں کر سکتے لیکن اس صفائی سے اب بات کہاں بننے والی تھی۔ ہارون یحییٰ نے گفتگو کے التواء کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔

انشاءاللہ پھر کبھی اگلے سفر پر باقاعدہ مفصل گفتگو ہوگی۔ چائے نوشی اور ہلکی پھلکی ضیافت کے بعد خلیقانہ مسکراہٹ کے ساتھ وہ مجھے الوداع کہنے کے لیے دروازے تک آئے اور مہدی کا ظہور اگلے سفر تک کے لیے مؤخر ہوگیا۔

رات کے ڈیڑھ بجے استنبول کی ویران سڑکوں پر ہماری کار ہوٹل کی جانب محوِ خرام تھی۔ میں سوچ رہا تھا ظہورِ مہدی کی بے بنیاد روایتوں نے کوئی ہزار سالوں سے کس طرح ہمارے بہترین دل و دماغ کو مسموم کر رکھا ہے۔ مہدی، دجّال، امام زماں، مجدد اور مسیح کی آمد ثانی کے انتظار میں نہ جانے کتنی نسلیں اس دارِفانی سے کوچ کر گئیں لیکن ان بے بنیاد قصے کہانیوں سے اب تک ہمارا پیچھا نہ چھوٹ سکا۔ محمد بن حنفیہ سے لے کر آج تک نہ جانے کتنے مہدی ہمارے درمیان ظاہر ہوتے رہے لیکن ایک ایسا مہدی جو ہماری آرزوؤں کی تسکین کر سکے، جو ہماری خوش فہمیوں اور امانیات کو سیراب کر دے، اس شخص کا انتظار آج بھی باقی ہے۔ قرآن مجید میں ان قصے کہانیوں کے لیے کوئی بنیاد نہیں لیکن صدیوں سے امت ان خیالات باطلہ کی اسیر ایک آنے والے کی راہ تک رہی ہے جو اسے تمام مسائل سے نجات دلا کر دوبارہ اس کا جاہ وحشم بحال کر دے گا۔

عامر نے مجھے غور وفکر میں ڈوبا دیکھ کر میرا کندھا تھپتھپایا۔ ہماری گاڑی ایک ٹریفک لائٹ پر رک گئی تھی۔ اس نے بٹوے سے اپنا کارڈ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو ظہور مہدی کے سلسلہ میں آپ کے مفصل خیالات کو سننے کا موقع ملتا۔ ہمارا ٹیلی ویژن نوجوان لڑکے لڑکیوں میں خاصا مقبول ہے وہ اسے بڑی دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ ہم لوگ بڑی شدت سے مہدی کی آمد کے منتظر ہیں جس کی بابت ہماری مذہبی کتابوں میں تفصیلات موجود ہیں اور جن کے ظہور کا وقت، ایسا لگتا ہے، اب قریب آپہنچا ہے۔

عامر کے مضطرب لہجہ سے صاف لگتا تھا کہ وہ مجھ پر اس خیال کی تبلیغ نہیں کر رہا ہے بلکہ صدق دلی سے یہ سمجھتا ہے کہ وہ ظہورِ مہدی کے طرب انگیز لمحات میں اس عظیم وقوعہ کے شاہد کے طور پر استنبول میں موجود ہے جسے شاید خدائی اسکیم میں مدینۃ المہدی کا شرف حاصل ہونے والا ہے۔ گفتگو کا سلسلہ جب ذرا اور دراز ہوا تو

عامر کو یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی کہ قرآن مجید مہدی، مجدد، امام غائب یا مسیح کی آمد ثانی کے تذکرے سے یکسر خالی ہے۔

لیکن حدیث میں یہ بشارتیں تو موجود ہیں ناں! اس نے اپنے موقف کی صداقت پر کسی قدر اصرار کرتے ہوئے کہا۔

حدیث میں نہ کہو ہاں یہ کہہ سکتے ہو کہ روایات و آثار اور حکایات و تاریخ کی کتابوں میں اس قسم کے باہم متضاد اور لاطائل قصے پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ مہدی کا ظہور یا مسیح کی آمد ثانی کا مسئلہ کبھی بھی مسلمانوں میں عقیدے کا مسئلہ نہیں رہا ہے۔ اور یہ ابتداء ہی سے علمائے اسلام کے درمیان مختلف فیہ چلا آتا ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ اس خیالی آمد کے قائل رہے ہیں ان کا ذہن بھی اس بارے میں صاف نہیں رہا ہے کہ آنے والا مہدی ہوگا یا مسیح یا امامِ زماں یا محض مجدد؟ بس ایک انتظار ہے جس سے ان کی ناعملی کو کسی قدر تسکین ہوتی ہے کہ آنے والا آئے گا اور ان کے سارے دلدّر دور کر دے گا۔ عہد اموی میں آل بیت کے حلقہ سے جو بغاوتیں ہوئیں یا فاطمی اور عباسی دعوت ابتداء میں جس طرح زیر زمین آگے بڑھی ان سبھوں نے ظہور مہدی کے تراشیدہ اسطورہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ حال کی تاریخ میں مہدی سوڈانی نے اسی اسطورے کے سہارے باقاعدہ ایک ریاست کی تنظیم بھی کر ڈالی۔ برصغیر ہندو پاک میں ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے مرزا غلام احمد نے اولاً اپنی مجدّدیت پر اصرار کیا اور پھر باقاعدہ مسیح موعود ہونے کا دعویٰ بھی کر ڈالا۔ لیکن بارہ سو سالوں کی اس تاریخ میں چھوٹے بڑے سیکڑوں مہدی، مجدّد، محدث، مفہم اور ظلی نبیوں کی گاہے بگاہے ظہور کے باوجود اصلاحِ احوال کی توقعات پوری نہ ہوئیں اور ان سبھوں کے دنیا سے چلے جانے کے بعد تاریخ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے دعویٰ میں سچا نہ تھا۔

تو کیا آپ کے نزدیک مہدی کے ظہور کی باتیں محض قصےّ کہانیاں ہیں؟

جی ہاں تراشیدہ اسطورہ، میں نے وضاحت کی۔

یہ اسطورہ کیا ہوتا ہے؟

انسانوں کے اجتماعی حافظہ میں بعض ناآسودہ آرزوئیں حقیقی دنیا سے پرے عالمِ خیال میں اپنی جگہ بنالیتی ہیں۔ یہ عالمِ خیال بھی بڑی عجیب چیز ہے۔ تمام تخلیقی کام، طبع زاد خیالات، انقلاب انگیز باتیں اور طرب انگیز مستقبل کی ابتدائی شکل بھی یہیں جنم لیتی ہے۔ اگر ان خیالات کے پیچھے عمل کی قوت موجود ہو اور انہیں ممکن

کر دکھانے کا جذبہ پایا جاتا ہو تو یہی عالم خیال ایک ٹھوس اور ناقابل تردید حقیقت کی شکل اختیار کر لیتا ہے لیکن اگر عمل کی بساط بے بنیاد اسطورے پر سجائی جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ منصوبے کا ایک بڑا حصہ محیرالعقول کرشماتی قوت کے سہارے انجام پائے گا تو یہ اسطورہ یا تو ہمیں انتظار جیسے کارِلایعنی میں مبتلا کر دیتا ہے یا پھر عین نازک لمحات میں متوقع کرشمہ کے عدم ظہور کے سبب ہم سخت مایوسی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ آنے والا آچکا۔ آخری نبیؐ کے بعد اب کوئی نہ آئے گا۔ اب تاریخ کے آخری لمحہ تک اقوامِ عالم کی رشد و ہدایت کا تمام کام آخری نبیؐ کے متبعین کو انجام دینا ہے۔

لیکن ایک آنے والے کا انتظار تو اہل یہود کو بھی ہے۔

جی ہاں یہ عقیدہ بھی دراصل ہمارے ہاں ان ہی کے ہاں سے آیا ہے۔ اہل یہود آج بھی اپنی دعاؤں میں مسیح کی آمد کی تمنا کرتے ہیں۔ وہ داؤد و سلیمان کے خانوادے سے ایک ایسے کرشماتی قائد کے ظہور کے منتظر ہیں جو ان کی عظمت رفتہ دوبارہ انہیں لوٹا دے گا۔ ''بس اگلے سال یروشلم میں'' جیسے دعائیہ جملے ان کے ہاں زبانِ زدعام ہیں۔ یہ وہ اسطورہ ہے جو انہوں نے عالم خیال میں تخلیق دیا ہے اور جس پر گزرتے وقتوں کے ساتھ امانیات کی دھند دبیز ہوتی گئی ہے۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کی شکل میں اس آنے والے کا ظہور کب کا ہو چکا۔ جسے اہل یہود کے بعض لوگوں نے صدق دل سے قبول کیا اور بعض اس کے انکاری ہو گئے۔ وہ جنہوں نے انکار کیا وہ آج تک مسیح کی راہ تکا کرتے ہیں۔ یہ ہے اسطورہ کی وہ قوت جو انسانوں کو حقائق سے بے خبر امانیات کا اسیر بنا دیتی ہے۔ جب ایک بار قوم اسطورہ میں گرفتار ہو جاتی ہیں تو انہیں اس اسطورہ کے پیچھے چلنا فطری وظیفۂ حیات معلوم ہوتا ہے۔ دوسری صدی عیسوی میں بارکوخبا کی قیادت میں پوری یہودی قوم رومی سلطنت سے راست ٹکر لینے پر آمادہ ہو گئی حتی کہ ربائی اکیوا جیسے معتبر عالم نے اس کی مفروضہ کرشماتی دعوت کو قبول کر لیا۔ لیکن کہاں رومیوں کی منظّم فوج اور کہاں بارکوخبا کی اسطوروی خوش گمانیاں اور خالی خولی نعرہ بازیاں۔ پوری یہودی قوم ایک ایسی عبرتناک شکست سے دوچار ہوئی کہ عرصہ ہائے دراز تک کسی نے دوبارۂ دعوائے مسیحائی کی ہمت نہ کی۔ سترہویں صدی میں سباتائی زی وی نے پوری شدّ و مد کے ساتھ اس اسطورہ کو متحرک کرنے کی کوشش کی۔ ایک بار پھر اساطیر اور امانیات کی اسیر یہودی قوم کا ایک بڑا طبقہ سباتائی زی وی کے ہاؤ ہو میں شامل ہو گیا۔ زی وی کا دعویٰ تھا کہ وہ آسمانی فرستادہ ہے، وہ وہی ہے جس کا انتظار مدت سے اہل یہود کو ہے۔ اس نے اپنے متبعین کو یقین دلا رکھا تھا کہ جب خلیفہ اسے دیکھے گا تو وہ پگھلتا

جائے گا۔زی وی گرفتار ہو کر خلیفہ کے دربار میں لائے گئے۔خلیفہ تو انھیں دیکھ کر نہ پگھلا ہاں وہ خود اس قدر ضرور پگھل گئے کہ انہوں نے تادیباً ان خیالات سے توبہ کی اور غالباً اپنی جان بچانے کی خاطر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

لیکن یہ باتیں تو ہماری مذہبی کتابوں اور خاص کر حدیث کے مجموعوں میں تفصیل سے بیان ہوئی ہیں ہمارے ہاں خاص مہدی کے ظہور کے سلسلے میں کئی معلومات افزا ویب سائٹس موجود ہیں جس میں سیکڑوں روایتیں بے شمار ماخذ سے جمع کر دیئے گئے ہیں۔کبھی موقع ملے تو آپ اسے ضرور دیکھئے گا، عامر نے کچھ تجسس اور کچھ اعتراض کے لب ولہجہ میں گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنے کی کوشش کی۔

آپ کا اعتراض بجا ہے لیکن یہ ساری غلط فہمی دراصل روایات وآثار کی کتابوں کو حدیث قرار دینے کے سبب پیدا ہوئی ہے۔حدیث یعنی رسولؐ اللہ کا قول اگر ہمیں کسی بات پر مطلع کرے تو اسے قبول نہ کرنے کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کی حیثیت سے آپؐ کی ہر بات پر ایمان لانا اور اسے شک وشبہ سے بالاتر سمجھنا ہمارے ایمان کا لازمہ ہے۔لیکن جب تک کسی قولِ رسولؐ کے بارے میں یہ بات پائے ثبوت کو نہ پہنچے کہ وہ واقعتاً آپ کا قول ہے اس کے پیچھے کسی کذاب راوی کی فتنہ سامانیاں نہیں پائی جاتیں تب تک اس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ قول رسولؐ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ذرا غور کیجئے! مہدی کے ظہور، دجال کی آمد، مسیح کی آمد ثانی کی باتیں اگر واقعی مدارِ دین ہوتیں تو اتنی اہم اطلاع سے قرآن مجید کے صفحات کیوں کر خالی ہوتے۔مسلمانوں میں یہ سارا فسادِ فکر وعمل اسی وجہ سے تو پیدا ہوا کہ انہوں نے قرآن مجید جیسی مبین، مبرّہن اور قطعی کتاب کو چھوڑ کر قصےّ کہانیوں کو اپنا دین بنا ڈالا۔قرآن مجید آخری امت کی حیثیت سے ہم سے عمل کا طالب ہے۔وہ چاہتا ہے کہ آخری نبیؐ کے متبعین اقوامِ عالم کی ہدایت کے لیے ہمہ تن متحرک رہیں۔اس کے برعکس ہمارا ثانوی دینی لٹریچر جو مختلف عہد میں تاریخ وآثار اور سیاسی وسماجی حوادث کے زیر اثر تشکیل پا تا رہا ہے، جس میں ثقہ راویوں کے ساتھ کذاب ومفتری دماغوں کی کارفرمائیاں بھی کم نہیں، وہ ہمیں ان تراشیدہ اساطیر کا خوگر بناتی ہیں جس کے مطابق پردۂ غیب سے کوئی ظاہر ہو کر ہمارے تمام دکھوں کا مداوا کر دے گا۔ ہمارے بہترین دماغ قرآن مجید کے متفقہ اور غیر محرف پیغام کو اپنا نشانِ راہ بنانے کے بجائے صدیوں سے ساری قوت اس بحث میں صرف کرتے رہے ہیں آیا آنے والا کب اور کہاں آئے گا، اس کی علامات کیا ہوں گی، وہ مہدی ہوگا یا مسیح کی نبوی حیثیت کے بجائے مجدد کی بشری حیثیت سے آئے گا؟ مسلمانوں کے بعض

فقہی گروہ تو یہاں تک سمجھتے ہیں کہ حضرت مسیح اپنی آمد ثانی کے عہد میں ان کے فرقے کے امام کی قیادت میں نماز پڑھیں گے، دجال مارا جائے گا اور ساری دنیا میں یہودیوں کو جائے پناہ نہ ملے گی۔ بلکہ بعض روایتوں کے مطابق کسی درخت یا حجر کے پیچھے کوئی یہودی چھپا ہوگا تو درخت اور پتھر خود ہی پکار اٹھیں گے کہ دیکھو ایک یہودی ادھر چھپا ہے اسے قتل کر ڈالو۔ ظاہر ہے اس طرح کی بے سر وپا باتوں کا اسلام اور پیغمبر اسلام سے کیا تعلق؟ جب یہ حکایتیں اور قصے کہانیاں روایت کی کتابوں میں جمع ہو رہی تھیں تو کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ انھیں مخصوص عہد کی سماجی دستاویز کے بجائے مجرد حدیث کی کتابوں کی حیثیت حاصل ہو جائے گی اور لوگ ان غیر ثقہ باتوں کو اقوالِ رسولؐ کی تقدیسی حیثیت دے ڈالیں گے۔

ہماری کار اب ہوٹل کے پورٹیکو میں داخل ہو رہی تھی۔ عامر کے چہرے پر شوق اور استعجاب کی ملی جلی کیفیت طاری تھی۔ ان کے سوالات ابھی باقی تھے اور وہ چاہتے تھے کہ گفتگو کا یہ سلسلہ ابھی دراز رہے لیکن رات کافی ہو چکی تھی اور صبح مجھے استنبول کے نواحی علاقوں کا سفرِ شوق درپیش تھا۔

'Take Care یعنی اپنے آپ کو سنبھال کر رکھو مستقبل کا مہدی تمہارے تعاقب میں ہے'، میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے اس سے رخصت لی۔

۲

حرم سرا

کانفرنس ختم ہو چکی تھی۔ اب میں سلطان احمد کے علاقے میں اٹھ آیا تھا۔ استنبول کا یہ علاقہ اپنی تاریخی عمارتوں اور آثار کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اَیا صوفیاء کا عظیم الشان گرجا گھر اور جامع سلطان احمد کی پرشکوہ عمارت بیک وقت دو تہذیبوں کے ٹکراؤ اور اس کے باہمی تعامل کے علامیے بن گئے ہیں۔ اسی سے ملحق توپ کاپی سرائے کا وسیع وعریض محل ہے جس کے صدر دروازے پر السلطان ظل اللہ کی عبارت اہل نظر کو دعوتِ عبرت دے رہی ہے۔

ایک دن میں شام کی سیر کو نکلا، موسم خوشگوار تھا، خیال تھا کہ سمندر کے کنارے کچھ دیر چہل قدمی کروں گا۔ اَیا صوفیاء کے عقب سے نکلتے ہوئے ساحل سمندر کی طرف مڑنے والا تھا کہ اچانک میری نظر توپ کاپی سرائے کے صدر دروازے پہ پڑی۔ دروازے کا ایک پٹ بند اور دوسرا قدرے کھلا تھا۔ ایک پہرے دار مشین گن سنبھالے اپنی ڈیوٹی پر مامور تھا۔ میں نے جو دروازہ کھلا دیکھا تو خیال ہوا کیوں نہ توپ کاپی کے سبزہ زاروں کی سیر کی جائے۔ گو کہ میرا پہلے بھی کئی بار یہاں آنا ہوا تھا لیکن ہر مرتبہ وقت کی تنگی، سفر کی بھاگ دوڑ اور گونا گوں مصروفیات کے سبب تشنگی کا احساس لیے واپس گیا تھا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ زائرین کے داخلے کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اب جو لوگ پہلے سے اندر موجود ہیں ان کے باہر آنے کا انتظار ہے۔ ویسے بھی چھ بجنے میں اب پندرہ بیس منٹ رہ گئے ہیں اتنی دیر میں بھلا تم کیا دیکھ پاؤ گے؟ پہرے دار نے کچھ ہمدردی اور کچھ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معذرت پیش کی۔

میں آیا تو کئی بار ہوں لیکن اب تک حرم سرا کا حصہّ دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔

حرم کا نام سن کر وہ زیرِلب مسکرایا۔ کہنے لگا میرے دوست! اب وہاں کچھ بھی نہیں۔ تم نے واقعی آنے میں دیر کی۔ صرف چند گھنٹے ہی نہیں بلکہ کوئی دوسو سال دیر سے پہنچے ہو۔ اب حرم ویران ہے، اور مہ رخوں کی جلوہ سامانیاں گلیوں، بازاروں اور تفریح گاہوں میں ہر طرف عام ہیں۔ اس جمہوری دور میں اب دلربائی پر صرف خلفاء و امراء کی اجارہ داری نہیں۔

توپ کاپی سرائے میں پہلے پہل میری آمد ایام طالب علمی میں ہوئی تھی۔ وہ بھی کیا دن تھے جب سفر کو نکلیے تو ایسا لگتا تھا کہ پوری کائنات آپ کے راستے میں دیدہ ودل فراش کیے دیتی ہے۔ نہ سامانِ سفر کی تیاری کی ضرورت نہ توشۂ سفر کا خیال۔ نہ خورد ونوش کی فکرمندی اور نہ ہی منزل کی مشکلات کی کوئی پرواہ۔ برسہا برس گزرے مختصر سا پوٹلی نما بیگ اٹھائے ملکوں ملکوں کی خاک چھانتا پھرا۔ کبھی کسی کانفرنس میں شرکت، کبھی قیام امن کے جلسے، کبھی نوجوان تحریکوں کے جلسے جلوس اور کبھی اسلامیوں کی مجلسیں۔ تب گھر سے نکلتے ہوئے واقعتاً ایسا لگتا تھا کہ

ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے۔

گاہے ایسا بھی ہوا کہ جیب میں پھوٹی کوڑی ندارد اور سر میں عالمی سفر کا سودا۔ اعتماد کا یہ عالم کہ مڑے تڑے کپڑے بیگ میں ٹھونسے، جو کثرت استعمال سے پوٹلی کی شکل کا ہو گیا تھا، اور ادھوری تیاری اور اس سے بھی کہیں کم توشے کے ساتھ نکل کھڑا ہوا۔ تب ایک زندہ خدا کی مشائیت کا ہر لحہ احساس ہوتا۔ ایسا لگتا جیسے کوئی پردۂ غیب سے میرے سفر کا گوشوارہ ترتیب دیتا ہو اور اس نے مجھے مختلف ملکوں اور قوموں کے مشاہدے پر مامور کر رکھا ہو۔ تب تجربہ کم اور مشاہدہ انتہائی حساس اور تیز ہوا کرتا تھا بلکہ کہہ لیجئے کہ تجربے نے مشاہدے کی دھار کو کند نہ کیا تھا۔ اشیاء اپنی اصل ماہیت میں فی الفور منقح ہو جاتی تھیں۔ گویا غیب سے تجلّی کی کوئی کوند ہو جو چشم زدن میں چیزوں کی اصل حقیقت پر مطلع کر دیتی ہو۔ کسی اٹپٹی چیز پر نظر پڑتی ہی فوراً اس کے اٹپٹے ہونے کا احساس ہو جاتا۔ کہتے ہیں کہ اٹپٹی چیز کو اگر بار بار دیکھتے رہیئے یا اسے مسلسل انگیز کیے رہیے تو وہ معمول کا عمل لگنے لگتا ہے۔ سو بظاہر مرصع مگر فی الاصل بے ہنگم زندگی کی خرابیاں اور فتنہ سامانیاں اس وقت اپنی جملہ ابعاد کے ساتھ نظر آتیں۔ اس وقت پہلی ہی نظر میں توپ کاپی کے صدر دروازے پر السلطان ظل اللہ کی عبارت طلائی حرفوں میں کندہ دیکھ کر میں ایک لحہ کے لیے ٹھٹک سا گیا تھا۔ تب قلب ونظر میں کسی مجہول قول کو پڑھ کر ایک

الارم سا بج اٹھتا تھا۔ آج ربع صدی کے مطالعہ و تحقیق کے بعد صرف اتنا فرق واقع ہوا ہے کہ میں ان التباسات پر علمی دلائل کے انبار لگا سکتا ہوں۔ سوصدر دروازے میں داخلے سے پہلے ہی اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ عثمانی ترکوں کی بنیاد کا پہلا پتھر ہی فکری التباسات سے مملو تھا۔ بھلا کہاں خدائے بزرگ و برتر اور کہاں خطا ونسیان کا پتلا انسان۔ اسے کب یہ زیب دیتا ہے کہ وہ خود کو زمین پر خدا کا سایہ قرار دے، اور اپنی اہانت کو خدا کی اہانت پر محمول کرے۔ اسلام تو آیا ہی اسی لیے تھا کہ وہ انسانوں کی گردنوں کو مذہبی پیشوائیت کے ظلم و جبر سے نجات دلائے۔ ایک طرف قرآن مجید کا یہ بیان کہ اس کا رسول انسانوں کی گردنوں کو اصر و اغلال سے نجات دلاتا ہے اور دوسری طرف خلیفۂ وقت کا یہ اصرار کے وہ اس سرزمین پر خدا کا نامزد کردہ نمائندہ ہے جس کی اہانت یا حکم عدولی گویا خدا کی نافرمانی کے مماثل ہے۔ کوئی پانچ سو سالوں تک عثمانی ترکوں اور اس سے پہلے عباسی، اموی اور فاطمی خلفاء کی عمومی پالیسی (باستثنا چند) اسلام کی عطا کردہ حریت فکری سے مسلسل مزاحم ہوتی رہی۔ شیخ الاسلام کا سرکاری اسلام دین مبین کے مستند قالب کی حیثیت سے رائج کیا جاتا رہا لہٰذا جب ترک ناداں نے خلافت کی قبا چاک کی تو اس شر سے صدیوں بعد ایک خیر کے ظہور کا امکان پیدا ہو چلا۔ بقول اقبال اب تک ملوکیت کے زیر اثر اسلام کی جو تعبیر مستند سمجھی جاتی رہی تھی اور جس پر بڑی حد تک خلیفۂ وقت کا کنٹرول تھا اب سقوط خلافت کے بعد ان تمام سیاسی مصالح اور متوارث التباسات سے ماوراء اسلام کو اپنی اصل ہئیت میں سمجھنے کا امکان پیدا ہو چلا تھا۔

ایام طالب علمی کا استنبول میرے لیے ایک خوابیدہ سا شہر تھا۔ جدھر جائیے مسجدوں کے سر بہ فلک مناروں کے سایے میں سجی سجائی مرصع قبروں کا ایک سلسلہ اور ان ہی کے درمیان جا بجا مختلف قبوؤں میں نسبتاً معروف شخصیات کی قبروں کی دیکھ ریکھ کے لیے سرکاری طور پر مجاور مامور۔ کہیں کسی حکمراں یا اہلکار یا ان کے اہل خانہ کی قبریں حسب مراتب تزک و احتشام سے سجی ہیں، کہیں ان پر کلاہیں رکھی ہیں اور کہیں مخمل کے غلافوں پر قرآنی آیات کی خطاطی سے انہیں رونق بخشنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حیرت ہوئی کہ ترک خلافت کے اس سابق دارالسلطنت میں جسے صدیوں عالمی دارالحکومت کی حیثیت حاصل رہی آخر قبروں کے انتظام و انصرام پر اتنا زور کیوں ہے۔ اس وقت یہ عقدہ تو حل نہ ہو سکا بس قلب و نظر میں مسلسل الارم بجتے رہے۔

ساحل سمندر کی جانب جہاں دور تک چہل قدمی کے لیے خاص راستے بنائے گئے ہیں۔ جا بجا سُستانے کے لیے بنچوں کا سہارا بھی موجود ہے۔ اب جو میں ذرا دم لینے کو بیٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سمندر کے دوسری

جانب استنبول کے ایشیائی حصّہ سے ذرا پرے، جہاں سمندر تا حد نظر وا ہوگیا ہے، دور افق پر سورج کی ڈوبتی کرنیں سنہرے طلسم کا تانا بانا بُننے میں مصروف ہیں۔ ہر ڈوبتا سورج جاتے جاتے اپنے تزک واحتشام کی legacy سے کام چلانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ زوال کے اس عمل پر سحر انگیز کرنوں سے پردہ ڈال دے تاکہ وقتی طور پر ہی سہی ناظرین کو یہ یقین ہوجائے کہ ابھی چراغ میں بہت سا تیل باقی ہے۔ اپنے زوال سے پہلے عثمانی ترکوں نے بھی تنظیمات کی اصلاحی کرنوں سے قلب ونظر کو مخمور کرنے کی کوشش کی۔ بعد کے دنوں میں جب سقوطِ خلافت کے بعد مغرب ہمارے لیے حتمی معیار کے طور پر سامنے آیا تو ہمارے مسلسل گرتے گراف کو مغرب زدگی کی کرنوں میں چھپانے کی کوشش کی گئی۔ کہیں یہ سمجھا گیا کہ مشرقی لباس کے بجائے مغربیوں کی سی وضع قطع اختیار کرنا، مئی جون کی سخت گرمی میں سوٹ ٹائی میں بندھے رہنا، فرش پر دسترخوان سجانے کے بجائے ٹیبل کرسی پر چھری کانٹے سے کھانا، ہمارے زوال کا سدباب کرسکتا ہے۔ بلکہ بعض مصلحین اور دانشوروں نے تو ہمیں یہاں تک یقین دلایا کہ کسا کسایا مغربی لباس ہمیں چاق وچوبند رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ حتیٰ کہ داڑھی کا منڈانا بھی ہماری روشن خیالی کا ضامن بن سکتا ہے۔ عہد استعمار کی اس سراب آسا تبلیغ نے اس قدر ہماری تقلیب ماہیت کردی کہ دیکھتے دیکھتے ہماری وضع قطع اور صورت شکل مسخ ہوکر رہ گئی۔ ہمارے دانشوروں کی زبانوں سے چبی چبائی فرانسیسی اور انگریزی اصطلاحات کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ ہماری عورتوں کے سیاہ خوبصورت بالوں میں مصنوعی بھورے پن اور بے رونق سنہری لکیریں نمایاں ہوگئیں۔ وہ آنکھ جس کے عشوہ وغمزے زندگی کو معنویت عطا کرتے اور جن کی گہری جھیل میں شاعر ڈوب جانے کی تمنا کرتا، وہ اجنبی تراش خراش کے ہاتھوں مثلہ ہوگئیں۔ پچھلے ڈیڑھ سو سالوں میں ہم نے اپنے زوال پر پردہ ڈالنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ آنے والا ہر لمحہ ہمارے زوال کی سنگینی کا کہیں شدت سے احساس دلاتا رہا۔

جھٹپٹے کے خاتمے کے ساتھ سنہری کرنوں کا طلسم انگیز تماشا بھی ختم ہوا۔ طلوع شب کی حقیقت کا انکار یقیناً مشکل ہے اب اس سے نجات کا اس کے علاوہ اور کیا راستہ ہے کہ ہم ایک نئی صبح کے قیام کو حرکت دیں لیکن ہاں کسی ابتداء سے پہلے یہ خیال رہے کہ یہ راستہ صبح کاذب کی طرف نہ لے جاتا ہو۔

اگلی صبح ذرا سویرے ہی طلوع ہوگئی۔ ابھی میں فجر کی نماز سے پوری طرح فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ نیچے لابی میں احمد اردگان تشریف لے آئے تھے کہنے لگے کہ رات بھر میں بے چین سا رہا۔ سوچتا رہا کہ کسی طرح ایک بار اور آپ سے ملاقات کا موقع مل جائے اور اس طرح میرے اضطراب کی تسکین کا کچھ

سامان ہو۔آپ سے جکارتہ کی کانفرنس میں شرکت کا وعدہ بھی لینا ہے اور ہم لوگ یہاں ترکی میں جو کام کر رہے ہیں اس بارے میں بھی مشورہ مطلوب ہے۔ احمد کے ساتھ ان کے بعض پر جوش احباب بھی آئے تھے۔ نوجوانوں کا یہ گروہ عالم اسلام کی تنظیموں اور تحریکوں کو منظّم کرنے کا خواب رکھتا ہے۔ نئے بدلتے عالمی منظر نامے میں انہیں توقع ہے کہ ترک نوجوان اپنا تاریخی قائدانہ کردار پھر سے ادا کر سکتے ہیں۔

ہمیں علماء کی انجمنوں یا عربوں کی رفاہی تنظیموں پر قیاس نہ کریں۔ہم عملی لوگ ہیں لسانی اور نسلی تعصب سے اوپر اٹھ کر کام کرنا چاہتے ہیں۔ہم یہ چاہتے ہیں کہ نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر اس امت کو ایک لڑی میں پرو دیں، بنیان مرصوص میں تبدیل کر دیں۔کل FM Radio پر انٹرویو کے دوران آپ نے ترکی کے نئے احیاء اور اس کے تاریخی رول کے ستائش کے ساتھ ترک قومیت پر شبہات وارد کیے ہیں۔ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ پر ہمارا نظری کنفیوژن دور ہو۔کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تاریخی طور پر ترکوں کی مختلف نسلوں اور قبیلوں نے خلافت عباسیہ کے اضمحلال سے لے کر ۱۹۲۴ء میں خلافت کی با قاعدہ معطّلی تک عالمی اسٹیج پر ایک کلیدی رول انجام دیا ہے۔پچھلی پون صدی ہماری تاریخ سے ہمیں نا آگاہ رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن رفتہ رفتہ دوبارہ ہم نے اپنی جڑوں کو تلاش کر لیا اور اب ہم عالم اسلام کی شیرازہ بندی میں پھر سے ایک کلیدی رول انجام دینا چاہتے ہیں اور دوسری مسلمان اقوام کے مقابلے میں شاید ہم اس کام کے لیے کہیں زیادہ سزاوار بھی ہیں۔

احمد کی بات ابھی مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ نجم الدین نے عالم عرب کی بے عملی کا شکوہ شروع کر دیا۔ان کا کہنا تھا کہ عالم اسلام کا مستقبل عالم عرب کے احیاء کے ساتھ ہرگز مشروط نہیں ہے۔عربوں کو یہ امتیاز ضرور ہے کہ وہ رسالۂ محمدی کے پہلے مخاطب ہیں لیکن عالم اسلام کی تاریخ میں دوسری اقوام کا حصہ ان سے کم نہیں، بلکہ بعض معاملات میں تو بڑھ چڑھ کر ہے۔خاص طور پر سقوطِ بغداد کے بعد تو ترکوں نے مسلسل کوئی پانچ سو سالوں تک خلافت کا علم تھامے رکھا ہے۔حال کی تاریخ تک جبکہ مسلمانوں کو دنیا کے سیاہ وسفید پر اختیار حاصل تھا، دنیا کے تینوں بڑے امپائر مسلمان تھے یعنی عثمانی ترک، صفوی ایران اور مغل ہندوستان اور تینوں خالصتاً غیر عرب ریاستیں تھیں۔عربوں کا کام تاریخ نے ان سے ابتدائی عہد میں لے لیا۔وہ بنیاد کا پتھر رکھ گئے اور شاید اس عظیم بنیادی عمل میں ان کی ملی قوت کی کل جمع پونجی کام آ گئی۔اب تاریخ بعد کی مخاطب قوموں سے کام لینا چاہتی ہے۔نجم الدین کی گفتگو ترک نوجوانوں کے چہرے پر فخر وانبساط کے ملے جلے جذبات کو جنم دینے کا سبب بن رہی تھی۔علمی تحلیل وتجزیے سے کہیں زیادہ نسلی اور قومی حمیت کی کارفرمائی تھی سو میں نے مداخلت کے لیے موقع

غنیمت جانا۔

اولاً تو یہ بات صحیح نہیں کہ کوئی قوم تاریخ کے کسی مرحلے میں عظیم الشان کارنامہ انجام دینے کے سبب اپنی خلاقانہ یا قائدانہ صلاحیت کھو دیتی ہے۔ عربوں کا حال لاکھ خراب صحیح لیکن دوسری اقوام کے دامن بھی بحیثیت قوم اخلاقی، روحانی خرابیوں سے نا آلودہ نہیں۔ پھر یہ کہ اگر عالم اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا کام کوئی قوم ایک قومی پروجیکٹ کے طور پر اپنے ہاتھ میں لیتی ہے تو خطرہ ہے کہ مختلف نسلی، لسانی اور مسلکی گروہ آگے بڑھنے سے پہلے ہی باہم دست و گریباں ہو جائیں۔ جس طرح عربوں نے ترکوں کی خلافت کا قلادہ اتار پھینکا اور جس کے ردعمل میں ترکوں نے عربی زبان حتیٰ کہ اس کے رسم الخط کو مسترد کر دینا اپنا قومی فریضہ جانا اسی طرح قومیت کا نیا عفریت ایک بار پھر ہمارے احیاء کے منصوبے کو خاکستر کر دے گا اور ہم خود کو ایک نئی خانہ جنگی میں مبتلا پائیں گے۔ نہ ایرانی عربوں کی قیادت قبول کریں گے اور نہ برصغیر ہندو پاک کے مسلمانوں کا یہ دعویٰ تسلیم کیا جا سکے گا کہ عالم اسلام کی نئی شیرازہ بندی میں اپنی تاریخی خدمات، جغرافیائی اہمیت اور کثرتِ تعداد کے سبب وہ دوسروں سے کہیں زیادہ اس بات کے اہل ہیں کہ امت اسلامیہ کی قیادت ان کے ہاتھوں میں سونپ دی جائے۔ اس لیے میرے خیال میں اسلام کی آفاقی تہذیب کو قومی ایجنڈے کے طور پر دیکھنا خطرے سے خالی نہیں۔

لیکن مجھے یہ بات ہضم نہیں ہوتی کہ عربوں کو اسلامی ڈسکورس کی قیادت کرنے یا Islamic arena پر dominate کرنے کی صرف اس لیے کھلی چھوٹ دے دی جائے کہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا ہے، کریم جنہیں میں اب تک شرمیلا اور کم سن نوجوان سمجھتا تھا انہوں نے اپنی خاموشی توڑی۔

ان کے لہجہ میں قومی افتخار کے بجائے دردمندی کہیں زیادہ نمایاں تھی۔ کہنے لگے: اتحاد علماء کے جلسوں میں آپ نہیں دیکھتے، میں تو تین دنوں تک وہاں والینٹئر کی خدمات انجام دیتا رہا، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ علماء کی عالمی انجمن میں عربوں کو غلبہ کیونکر حاصل ہے جبکہ وہ مجموعی طور پر امت اسلامیہ کی مجموعی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ بھی نہیں۔ ترک، افغان، ایرانی، ہندی، ملیشیائی اور انڈونیشیائی علماء کو خاطر خواہ نمائندگی سے کیوں محروم رکھا گیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صرف پچیس فیصد عرب اقلیت کی خاطر تنظیم کی رسمی زبان عربی ہونے کا آخر کیا جواز ہے۔ کیا ہم اہل ترک کی طرح آپ بھی یہ محسوس نہیں کرتے کہ اس طرح کے جلسوں میں مناقشے کے محور اور intellectual space پر عربوں نے محض اپنی عربیت کے حوالے سے غیر ضروری طور پر قبضہ کر

رکھا ہے۔ لہذا غیر عرب اقوام اسلام سے اپنی تمام تر وفاداریوں اور قربانیوں کے باوجود خود کو حاشیے پر پڑا پاتے ہیں۔ اسلام اگر محض عرب تہذیب کا نام ہے تو ترکی، ایرانی، ہندی اور دوسری غیر عرب اقوام کو اس سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟

نجم الدین کی باتوں میں درد بھی تھا اور وزن بھی۔ اصل اسلام تو یہ ہے کہ فارس کے سلمان کی قومیت اسلام قرار پائے اور وقت کا رسولؐ اسے فارسی نژاد مسلمان کی حیثیت سے دیکھنے کے بجائے اس کا اندارج اپنے خاندان کے فرد کی حیثیت سے کرائے۔ عہد رسولؐ کی وہ ثقافت جب فارس کے سلمان، روم کے صہیب اور حبشہ کے بلال نے قرشی النسل مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک آفاقی تہذیب کو جنم دیا تھا وہاں عربی زبان کے بڑے بڑے جغادری، شعر وخطابت کے ماہرین اپنے کفر ونفاق کے سبب حاشیے پر جا پڑے تھے۔ تہذیب کے نبوی قالب نے ایک ایسی صورت حال کو جنم دیا تھا جہاں ایک آزاد کردہ نوجوان غلام کی قیادت میں عرب معاشرے کے سرخیل جنگی مہم میں شرکت پر خود کو بہ سروچشم آمادہ پاتے۔ اگر عربیت وجہ امتیاز ہوتا تو تہذیب کا وہ آفاقی قالب، جس نے آنے والے دنوں میں یدخلون فی دین الله افواجا کی صورت پیدا کردی، متشکل ہوتا اور نہ ہی غیر عرب اقوام اسلام کے دامن میں سکینت اور سرخروئی کا سامان پاتیں۔ عربیت کو اسلام کے فطری قالب کی حیثیت سب سے پہلے عبدالملک کے عہد میں دی گئی جنہیں عبداللہ بن زبیر کی متبادل خلافت کا سامنا تھا۔ عبدالملک نے عرب بیوروکریسی بلکہ ابن خلدون کی اصطلاح میں کہہ لیجئے عرب عصبیت کو ایک مثبت عنصر کے طور پر حکومت کے استحکام کے لیے استعمال کیا۔ سرکاری رجسٹروں، آمد ورفت کے گوشواروں اور انتظامی معاملات کی زبان عربی قرار دے ڈالی گئی۔ اس ایک اقدام سے آنے والے دنوں میں اہل عرب کے لسانی تفوق کا سامان فراہم ہوگیا۔ آج بھی اگر عربی زبان اور عربیت کو عالم اسلام کی داخلی صف بندی کے لیے غیر ضروری اہمیت دی گئی تو خطرہ ہے کہ اسلام کے نام پر ایک بار پھر عرب عصبیت اپنی تمام تر فتنہ سامانیوں کے ساتھ واپس آجائے اور وقت کا ابن تیمیہ خود کو اس التباس میں مبتلا پائے کہ فارسی زبان کا سیکھنا من تشبه بقوم فھو منھم والی حدیث کی رو سے جائز نہیں اور احمد سرہندی سے لے کر شاہ ولی اللہ تک ہمارے علماء اس غلط فہمی میں مبتلا نظر آئیں کہ عربیت اسلام کا اصل الاصل قالب ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلام جیسے آفاقی دین کا، جسے ازل سے ابد تک، تمام ہی اقوام وملل کی رہنمائی کا کام انجام دینا ہے، کوئی ایک تہذیبی قالب نہیں ہوسکتا۔ دین حنیف کی اصل ہیئت تہذیبی مظاہر سے ماوراء ہے۔ مختلف تہذیبوں پر یہ اثر انداز تو ضرور ہوگا لیکن کسی ایک تہذیب

میں یہ وسعت نہیں کہ وہ اس کی جملہ ابعاد کو پوری طرح متشکل کر سکے۔ اسلام تو دراصل نام ہے والہانہ سپردگی کا، یہ جبّہ اور عمامہ میں بھی اسی طرح جلوہ گر ہو سکتا ہے جس طرح پتلون اور ٹائی یا دھوتی اور بنیان میں۔ اگر ایک ہندوستانی عالم دھوتی اور کرتے میں ملبوس لحن داؤدی میں قرآن پڑھتا ہو اور خشیت الٰہی سے اس کا دل معمور ہو تو اسے اسلامی تہذیب کے توسیعہ کے طور پر ہی دیکھا جانا چاہئے۔ اسلام دلوں کی دنیا بدلتا ہے ورنہ اگر لباس، زبان اور عرف و عادات تہذیب کا اظہار ہوتے تو ابوجہل اور ابولہب بھی وہی زبان بولتے اور ویسا ہی لباس پہنتے تھے جو وقت کے رسولؐ اور اس کے جاںنثار اصحاب کا تھا لیکن اپنی تمام تر عربیت کے باوجود وہ اسلامی تہذیب کے دائرہ سے باہر ہی سمجھے گئے۔

گفتگو کا سلسلہ شاید کچھ اور دیر جاری رہتا لیکن اس دوران ہمارے دوست مصطفیٰ اوغلو تشریف لے آئے تھے۔ آج ہمیں استنبول کے ایشیائی حصے میں جانا تھا جہاں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اہل علم کی ایک مجلس ہماری منتظر تھی۔

۵

تاریخ سے جنگ

مصطفیٰ اوغلوایک نوجوان اسکالر ہیں۔یہی کوئی تیس پینتیس کی عمر ہوگی۔صوفی میوزک کے دلدادہ۔اللہ اللہ کی دُھن پر جب ترک موسیقارِطرب انگیز دھمال ڈالتا ہےتو وہ دنیا ومافیہا سے بےخبر ہوجاتے ہیں۔کار کے اندر میوزک کی لَے جب تمام ہوئی تو ایسا لگا کہ ان کا رُواں رُواں جذب وسرور اور بےخودی وسرمستی میں شرابور ہوگیا ہو۔استنبول میں جابجا سیاحتی مقامات پر مختلف قسم کے سوونیئر کے ساتھ صوفی میوزک کی سیڈیاں (CDs) بھی بکتی دکھائی دیتی ہیں۔آخر اس کی اس قدر مقبولیت کا راز کیا ہے؟ میں نے مصطفیٰ اوغلو سے جاننے کی کوشش کی۔

بولے:اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ لوگ سیکولرزم اور جدیدیت کی پرشور تبلیغ سے تنگ آکر ایک ایسی دنیا میں واپس جانا چاہتے ہیں جہاں انہیں سکون کے کچھ لمحات میسر آسکیں اور دوسری وجہ غالباً نئی نسل میں ماضی کی طرف پایا جانے والا ایک رومانوی رجحان بھی ہوسکتا ہے۔انہوں نے ایک طویل عرصے تک ثقافتی دہشت گردی کا سامنا کیا ہے۔اس دوران ان کا سب کچھ بدل گیا لیکن ایک ایسی ترک قوم تیار نہ ہوسکی جو جدید دنیا میں اپنی سبقت کا جھنڈا گاڑسکتی۔عام لوگ اس صورتِ حال سے غیر مطمئن اور مستقبل سے مایوس ہیں پھر اگر وہ اس ماضی کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں جہاں صوفی رقص اور وجدوحال کی مجلسیں انھیں سکون وانبساط کے چند لمحات عطا کرسکتے ہوں تو یہ سب کچھ ناقابل فہم نہیں۔

مصطفیٰ اوغلو کا لب ولہجہ خاصا دانشورانہ تھا۔ پتہ چلا کہ انہوں نے استنبول یونیورسٹی سے شہریت اور شناخت کے مسئلہ پر فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ہے اور اب ایک تحقیقی ادارے میں جدید ترکی کی تاریخ پر کام کر رہے ہیں۔

یہ آپ کے نام میں اوغلو کا لاحقہ کیوں ہے؟ میں کئی دنوں سے غور کر رہا ہوں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہاں کوئی اوغلو ہے تو کوئی اردگان، کوئی اربکان ہے تو کوئی...... حالانکہ ترک قوم کے جغرافیائی، نسلی اور تاریخی رشتے اہل عرب، اہل فارس اور اہل ہند سے خاصے قدیم ہیں اور اسلام اس کے رگ و پے میں صدیوں سے سرایت کیے ہوئے ہے۔ پھر ناموں کی اس اجنبیت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

مصطفیٰ اوغلو معنیٰ خیز انداز سے مسکرائے۔ کہنے لگے: جی ہاں یہ سب کچھ اسی ثقافتی دہشت گردی کے ثمرات ہیں جس کی طرف ابھی میں نے اشارہ کیا۔ ۱۹۲۴ء میں سقوط خلافت کے بعد نئی ترکی ریاست نے اس بات کی بزور بازو کوشش کی کہ سلطنت عثمانیہ کے ملبے پر جو نئی عمارت قائم ہو اس میں پرانی تہذیب کی کوئی خوبو باقی نہ رہے۔ یہ ساری تبدیلی آناً فاناً چھ سات سالوں کے اندر ہوگئی۔ ریاستی سطح پر پروپیگنڈے کے بل بوتے پر ایک ایسی غلغلہ انگیز، بلکہ ہیجان انگیز کیفیت پیدا کی گئی کہ کسی کے لیے اس پر بند باندھنا ممکن نہ رہا۔ ۱۹۲۵ء میں پارلیامنٹ نے قانون سازی کے ذریعہ ترکی کلاہ فِض کے استعمال پر پابندی عائد کردی اور اس کی جگہ انگریزی طرز کے ہیٹ نے لے لی۔ مصطفیٰ کمال نے اپنی تقریر میں اپنے اس کارنامے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> لوگو! فِض کو دیس نکالا دینا ضروری تھا جو ایک مدت سے ہماری قوم کے سروں پر جہالت، تنگ نظری اور رجعت پسندی کی علامت کے طور پر براجمان تھی اور یہ بہت ضروری تھا کہ اس کی جگہ مغربی طرز کے ہیٹ (hat) کو رائج کیا جائے جسے آج مہذب دنیا استعمال کرتی ہے تا کہ دنیا کو اس بات کا پتہ چل سکے کہ ترک قوم بھی تہذیب میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔

ادھر مردوں کے سروں سے فِض اتارا گیا اور ادھر عورتوں نے جوشِ تہذیب میں ترکِ پردہ کا اعلان کرڈالا۔ جن عورتوں نے اس معاملہ میں ذرا بھی سستی دکھائی وہ بازاروں میں اور شاہراہوں پر تمسخر، استہزا حتی کہ مہذب شہریوں کی دست درازی کا ہدف بنیں۔ ۱۹۲۶ء میں اسلامی کلینڈر کے بجائے گریگورین کلینڈر رائج کیا گیا اور اس طرح اچانک پوری قوم مشرق کے بجائے مغربی ٹائم زون میں سانس لینے پر مجبور کی گئی۔

پھر تو شروع میں کلینڈر اور وقت کی تبدیلی نے بڑا کنفیوژن پیدا کیا ہوگا؟ میں نے پوچھا۔

جی ہاں! ایک عرصہ تک ہمارے بڑے بوڑھوں کے لیے یہ مشکل بنی رہی کہ آج کون سا دن ہے اور گھڑی میں کیا بجے ہیں کہ ہم اچانک مغربی ٹائم زون میں آ گئے تھے۔ ترک قوم ابھی ان حملوں سے سنبھلنے نہ پائی تھی کہ ۱۹۲۸ء میں رسم الخط کی تبدیلی کا اعلان کر دیا گیا۔ روایتی عربی فارسی رسم الخط کے بجائے اب رومن رسم الخط کو سرکاری حیثیت دے دی گئی۔ کہا یہ گیا کہ اس فرسودہ رسم خط کے سبب ہی ہمارے ہاں تعلیم کا حال پتلا ہے۔ لیکن جب رسم الخط کی تبدیلی کے بعد بھی حالات بہتر نہ ہوئے بلکہ کنفیوژن میں اضافہ ہوا تو اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ترکی زبان سے حتی الامکان عربی فارسی کے الفاظ خارج کر دیئے جائیں۔ ایک خالص ترک زبان کی تشکیل کے لیے ۱۹۳۲ء میں مصطفیٰ کمال نے ایک قومی انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جسے اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ اناطولیا اور وسط ایشیا کے علاقوں سے ترکی الفاظ کی چھان بین کے ذریعہ ایک نئی زبان تشکیل دے۔ ۱۹۳۴ء میں law of last name وضع کیا گیا جس کے مطابق شہریوں سے یہ حق بھی چھین لیا گیا کہ ان کے نام کا آخری حصہ ان کی خاندانی وجاہت یا جغرافیائی تعلق کا پتہ دے۔ دیکھتے دیکھتے خواجہ، آغا، پاشا، بے، آفندی اور خانم جیسے القاب ہمارے ناموں سے غائب ہو گئے اور اس کی جگہ بے جان مصنوعی ناموں نے لے لی۔

تو کیا اوغلو آپ کا سرکاری نام ہے؟

میرے اس سوال پر وہ زور سے ہنسے۔ نہیں، ہرگز نہیں! اوغلو کے معنی ہوتے ہیں son of۔ جیسے عربی میں کہتے ہیں نا ابنِ فلان۔ مصطفیٰ اوغلو کے معنی ہوئے مصطفیٰ کا بیٹا۔ میرا پورا نام سلطان مصطفیٰ اوغلو الماس ہے۔

اوہ، آئی سی! تو گویا کسی کو اوغلو کہہ کر مخاطب کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہمارے ہاں نادان لوگ کسی کو محض ابنِ یا عبدل کہہ کر پکارتے ہیں۔ دیکھئے جہالت کیا کیا گل کھلاتی ہے۔

مجھے اپنی جہالت اور نادانی کا ایک اور واقعہ یاد آیا۔ استنبول کے پچھلے سفر میں اکمل الدین احسان اوغلو سے ایک کانفرنس کے دوران سامنا ہو گیا۔ وہ جن دنوں IRCICA کے ڈائریکٹر تھے میری ان سے مراسلت رہ چکی تھی۔ اب وہ OIC کے سکریٹری جنرل کی حیثیت سے کانفرنس میں تشریف لائے تھے اور لوگوں میں گھرے تھے۔ خیال آیا کہ انھیں برادر اوغلو کہہ کر مخاطب کروں۔ وہ تو کہیے کہ اس کی نوبت نہ آئی اور انھوں نے خود ہی بڑھ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا ورنہ اپنی قابلیت کا بھرم سر بازار ٹوٹ جاتا۔

مصطفیٰ اوغلو کی گفتگو جاری تھی: یہ جو آپ ہمارے ناموں میں شمشیک، اردگان، کورکماز، دعان،

دیکمن، اوزگان جیسے لاحقے دیکھتے ہیں یہ سب اسی کمالی قانون کا کمال ہے۔ بسا اوقات حکومت کے اہلکاروں نے نام کا آخری حصہ خود اپنی ہی ایماء سے الاٹ کر دیا۔ اس طرح لوگوں کے لیے اپنی خاندانی روایت اور اپنی تاریخ سے واقف رہنا بھی مشکل ہوگیا۔ رسم الخط کی تبدیلی نے ہمارا تعلق روایتی علمی اور تہذیبی ماخذ سے یکسر منقطع کر دیا۔ ہم راتوں رات جاہل ہوگئے۔ پرانے رسم الخط میں پائے جانے والے کتابوں کے انبار اور عظیم الشان لائبریریاں ہمارے لیے بے معنی ہوگئیں۔

اس جبر کے خلاف، جسے آپ ثقافتی دہشت گردی کہتے ہیں، کوئی عوامی بغاوت نہیں ہوئی؟

ہوئی کیوں نہیں۔ مگر کامیاب نہ ہوسکی۔ مصطفیٰ کمال کے قریبی حلقے میں ان اقدام سے پھوٹ پڑ گئی۔ تحلیلِ خلافت کے اعلان نے پوری قوم کو سکتے میں ڈال دیا۔ شیخ سعید جو نقشبندی سلسلہ کے ایک کرد لیڈر تھے انہوں نے اعلان بغاوت کر دیا، جلد ہی یہ عوامی تحریک مختلف علاقوں میں پھیل گئی۔ بہت سے چھوٹے شہروں اور قریوں میں انقلابیوں نے حکومتی دفاتر قبضے میں لے لیے۔ لیکن ریاستی مشنری کے آگے یہ لوگ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ شیخ سعید گرفتار کر لیے گئے اور انہیں پھانسی دے دی گئی۔

مصطفیٰ کمال کے قریبی رفقاء میں سے کسی نے اس جبر و ظلم پر آواز بلند نہ کی؟ میں نے مزید جاننا چاہا۔

کیوں نہیں! خود ان کے قریبی رفقاء میں سخت بے چینی تھی۔ بعض لوگوں نے تحلیل خلافت کے منصوبے کی مخالفت بھی کی۔ ان کے بعض رفقاء نے اس اندیشے کا برملا اظہار کیا کہ ہم کسی اور سمت نکل آئے ہیں۔ یہاں تک کہ مصطفیٰ کمال کو اس بات کا احساس ہونے لگا کہ وہ خود اپنی پارٹی میں اقلیت میں ہوگئے ہیں۔ سال ۱۹۲۴ء کے اختتام تک ناراض گروپ نے Progressive Republic Party (PRP) کے نام سے ایک علیحدہ گروپ بھی تشکیل دے ڈالا۔ ۱۹۲۶ء میں مصطفیٰ کمال کے قتل کی سازش بے نقاب ہوئی۔ خدا جانے اس میں کتنی صداقت تھی۔ مگر اس بہانے بڑی تفتیش ہوئی، مقدمے چلائے گئے۔ تقریباً تمام ہی اہم مخالفین، بشمول کارا بکر، جاوید بے، احمد شکری، عصمت جاں بلوت تختہ دار پر چڑھا دیئے گئے۔ اس کے بعد مصطفیٰ کمال کی خودسری کو لگام دینے والا کوئی نہ رہا لہٰذا انہوں نے بزعم خود اپنے آپ کو اتاترک یعنی بابائے قوم قرار دے ڈالا۔ اتاترک سرکاری طور پر ان کے نام کا آخری حصہ قرار پایا جسے کسی اور کے لیے اختیار کرنا ناقابل معافی جرم سمجھا گیا۔

اب کیا صورت حال ہے؟ اس بدلتی صورتِ حال میں لوگ اپنے بابائے قوم کو کس طرح دیکھ رہے ہیں؟

ابھی بھی استنبول کا ائیر پورٹ مصطفیٰ کمال کے نام سے منسوب ہے۔ پبلک مقامات پر جابجا ان کی

تصویریں آویزاں ہیں۔ترکی کرنسی پران کی تصویریں چھپ رہی ہیں۔ بچے آج بھی اپنے اسکولی ترانوں میں مصطفیٰ کمال کی ہیروورشپ (hero-worship) سے مملو نغمے گارہے ہیں:

اے بیوک اتا ترک! اچتن یولدا گسترد ین ہیدیفی درمادان یورئیجین آنتی چریم۔
وارلیم ترک وارلیناارمان آلسو۔نےمتل نے ترکیہ ای نے۔
یعنی: اے مصطفیٰ کمال! تو نے ہمیں جو راہ دکھائی ہے ہم اس پر آگے بڑھتے جائیں گے۔ ہماری زندگی ترک قوم کے لئے وقف ہے۔کتنا خوش نصیب ہے وہ جو کہے میں ترک ہوں۔

آپ نے صحیح فرمایا۔ بظاہر تو یہی کچھ نظر آتا ہے۔ کچھ اندر کی صورتِ حال پر روشنی ڈالئے، میں نے اتاترک کی عوامی مقبولیت کا حال جاننا چاہا۔

اب تو صورت حال خاصی بدل گئی ہے۔مجموعی طور پر ترک قوم کو یہ احساس ہو چلا ہے کہ ماضی سے کٹ کر اور اپنی ملی تاریخ کو بھلا کر اس نے قومی خودکشی کا ارتکاب کیا ہے۔ایک وہ زمانہ تھا کہ مصطفیٰ کمال نے ترک تاریخ کواز سرنو لکھنے کی کوشش کی اور اب صورت حال یہ ہے کہ لوگ عثمانی خلافت کے ایام کو پھر سے لوٹانا نہیں تو کم ازکم تازہ کرنا ضرور چاہتے ہیں۔استنبول اور انقرہ میں جدھر جائیے آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ لوگ اپنے ماضی کو علامتی طور پر ہی سہی پھر سے زندہ کرنا چاہتے ہیں۔عہد عثمانی کا لباس، اس عہد کا فیشن حتیٰ کہ اب ریسٹوراں میں Ottoman Food کا رواج بھی عام ہو چلا ہے اور آپ کو حیرت ہوگی کہ بہت سے نوجوان لڑکے لڑکیاں قدیم ترکی رسم الخط سیکھ رہے ہیں۔

اب ہماری کار فاتح سلطان محمد پل کے قریب آچکی تھی۔ میں نے جب بھی توپ کاپی سرائے سے فاتح سلطان محمد پل کو دیکھا مجھے ایک مہیب پر اسراریت کا احساس ہوا۔ایشیا اور یوروپ کے دو براعظموں کو ملانے والے اس نازک اور خوبصورت پل پر جلال و جبروت کا ایک طلسم آشکار دیکھا۔قصر خلافت کا تاریخی دبدبہ اور باسفورس کی فطری دلکشی اس کے فن تعمیر سے کچھ اس طرح ہم آہنگ ہوگئی ہے کہ اس پر کسی نئی تعمیر کا گمان مشکل سے ہی ہوتا ہے۔ نئے سیاح پر یہ امر بھی آشکارا نہیں ہوتا کہ جس ترکی میں ماضی کے سارے حوالے ناقابل التفات قرار پائے ہوں وہاں جدید طرز کا ایک پل جس کی تعمیر ۱۹۸۶ء میں ہوئی، سلطان فاتح کے نام سے کیونکر منسوب ہوسکتا ہے۔فاتح سلطان پل ترکوں کی خودشناسی کا علامیہ بھی ہے اور اس بات کا اعلان بھی ہے کہ

محمد فاتح کے حوالے کے بغیر استنبول کو اعتبار نہیں مل سکتا۔

استنبول دو علامتوں کا امتزاج ہے۔ ایک کی نمائندگی میزبانِ رسولؐ حضرت ابو ایوب انصاری کا مقبرہ کر رہا ہے۔ پہلی نسل کے مسلمان شہر کی فصیل کے باہر ایک صحابی کی قبر کی شکل میں اپنی موجودگی کی ایک ابدی علامت چھوڑ گئے تھے۔ دوسری علامت محمد فاتح کے آثار و تذکرے ہیں جس کی بازگشت کوئی پانچ سو سالوں سے استنبول کی فضا میں مسلسل سنائی دیتی ہے۔ ان دو علامتوں کے بیچ، خواہ آپ اسے ان دونوں کا امتزاج کہیئے یا عوامی قالب، قونیہ کی جانب سے آنے والے فکری و نظری اثرات ہیں جن سے استنبول اور اس کے اطراف کی آب و ہوا صدیوں سے مملو ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ استنبول کو دینی اعتبار حضرت ابو ایوب کے حوالے سے ملتا ہے، سلطان محمد فاتح اس شناخت کو استحکام بخشنے والوں میں ہیں البتہ دل و دماغ پر سکہّ شاہِ قونیہ مولانا روم کا چلتا ہے۔

تاریخ بھی کیسی عجیب چیز ہے۔ جب ایک بار اہل ایمان کے ہاتھوں سے اس کی لگام پھسل جائے تو یہ انہیں گم نام سمتوں میں لیے پھرتی ہے۔ بعد والوں کے لیے اس کا تحلیل و تجزیہ بھی کچھ آسان نہیں کہ عمل اور اسطورہ دونوں بیک وقت اس کی تعمیر میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ حضرت ابو ایوب (ساتویں صدی) سے لے کر فتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء) تک کوئی سات آٹھ صدیوں پر مشتمل جہد مسلسل کی یہ داستاں اس خیال سے عبارت ہے کہ مٹھی بھر تہی دست لوگ بھی اگر کسی بڑی سے بڑی مہم پر صدق دلی سے آمادہ ہو جائیں تو خواہ وہ فوری طور پر کامیاب نہ ہوں مستقبل کی کامیابی کی بنیاد تو رکھ ہی دیتے ہیں۔ مسلمان اہل فکر کے لیے یہ بات آج بھی عقدۂ لاینحل ہے کہ پندرہویں صدی کا وسط جو عالمی اسٹیج پر عثمانی ترکوں کے جلالت و جبروت کے اظہار کا عہد ہے اسی صدی کے آخری سرے پر ۱۴۹۲ء میں سقوط غرناطہ کا سانحہ پیش آیا۔ پھر کیا وجہ تھی کہ ترکوں کی جانب سے مسلم اسپین کو بچانے کی کوئی مؤثر کوشش نہ ہوئی۔ شاہ مراکش کی طرف سے بھی غرناطہ کی آخری لڑکھڑاتی ریاست کو کوئی بر وقت مدد نہ مل سکی۔ حالانکہ ترک تو ۱۶۷۲ء تک عسکری طور پر اس پوزیشن میں تھے کہ وہ اقدامی عمل کے طور پر ویانا کا محاصرہ کر لیتے تھے۔ سولہویں صدی میں ملکہ برطانیہ ترکوں کے پاس مدد کے لیے سفارتیں بھیجتی تا کہ پوپ کے مقابلے میں انگلستان کو عثمانی ترکوں کی پناہ مل سکے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو لوگ سترہویں صدی کے آخر تک دنیا کے سیاہ و سفید کے مالک تھے اچانک انیسویں صدی میں عبرتناک زوال کا شکار کیونکر ہو گئے۔ میں جب بھی استنبول آیا یہ سوالات میرا تعاقب کرتے رہے۔

٦

بلغ العلا بکمالہ

ایک دن سلطان محمد فاتح کی جامع مسجد میں ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا، جمعہ کی نماز ختم ہو چکی تھی۔ لوگ بغلوں میں جوتیاں دبائے دروازوں کی جانب ہجوم کر رہے تھے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ صورت، قدآور شخص اپنے چند مصاحبین کے جلو میں میری طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ نگاہیں چار ہوئیں، سلام کا تبادلہ ہوا اور میں ان کی مسکراہٹوں کے جواب میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پوچھا کہاں کے رہنے والے ہو، کدھر سے آئے ہو اور کدھر کا ارادہ ہے؟

ہندوستان سے۔

ہندووووستان! انہوں نے بڑی گرم جوشی کا اظہار فرمایا اور پھر اپنے مریدین کے ساتھ حلقہ بنا کر وہیں بیٹھ گئے۔ عمر یہی کوئی ساٹھ سے اوپر ہوگی۔ سفید لمبی داڑھی جو استنبول کے منظرنامے میں غیر معمولی طور پر طویل محسوس ہوتی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا جبہ نما لباس پہنے، سر پر عمامہ اور ٹوپی کی مشترکہ موجودگی کے سبب یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ٹوپی عمامہ کے اوپر پہنی گئی ہے یا عمامہ ٹوپی کے اوپر باندھا گیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہاتھوں میں عصائے پیری کے بجائے ایک لمبی بانسری جس کے ایک سرے پر قدیم طرز کی چاندی کی گھنٹیاں بندھی تھیں۔ انگلیوں میں کئی انگوٹھیاں جن میں سبز و سرخ رنگ کے پتھر ٹانک رکھے تھے۔ البتہ چاندی کی قدرے بڑی انگوٹھی ان سب میں نمایاں تھی جس پر سنہرے رنگ میں محمدؐ رسول اللہ کی مہر نبوت کندہ تھی۔

فرمایا: وقت قریب آ گیا ہے اب وہ عنقریب ظاہر ہوں گے۔ مشرق سے ایک روشنی اٹھے گی جس سے تمام عالم منور ہو جائے گا۔ مغرب سے سیاہ بادل نمودار ہوں گے اور ایک ایسی آگ سر نکالے گی جو دشمنوں کو خاکستر کر دے گی۔ لوہے کا آسمانوں میں مثلِ سحاب پھرنا، آسمان سے آتشِ باراں کا ہونا، اہل اسلام کے دلوں میں وہن کا پیدا ہو جانا اور تمام اقوام عالم کا اس پر ٹوٹ پڑنا، یہ سب اس بات کی علامات ہیں کہ ہم قربِ قیامت کے آخری لمحات میں سانس لے رہے ہیں۔ بشارت کہ وہ آنے والے ہیں۔ مبارک کہ تم اپنی آنکھوں سے اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ دیکھو گے۔

جی مگر یہ سب کچھ آپ کس کی بابت فرما رہے ہیں؟ میری اس مداخلت کا انہوں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ ان کے فرمودات اور بشارتوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔

ان کا نام محمد مہدی ہوگا اور تم ان کے حامی و ناصر بنو گے۔ میں تمہاری پیشانی پر خدا کے نور کی جھلک دیکھ رہا ہوں۔

جی آپ نے صحیح فرمایا۔ نحن ابناء النور؛ ہم لوگ آلِ نور میں سے ہیں، میرے والد کا نام نور ہے۔ میں چھ بھائیوں میں چوتھا ہوں۔ میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے ان کے اس قول کی توجیہہ کی۔ لیکن وہ تو اپنی دھن میں تھے، وہ کہاں سننے والے تھے۔ ان کے فرمودات کا سلسلہ جاری رہا۔

صاحبزادے خدا تمہیں دجال کے فتنے سے محفوظ رکھے! عنقریب وہ مہدی کے مقابلے پر آئے گا۔ بڑا قتل و خون ہوگا لیکن بالآخر فتح حق کی ہوگی۔

لیکن یہ سب کچھ آپ کو کیسے پتہ چلا؟

کہنے لگے خدا کا خوف کرو دین کی باتوں میں شبہ نہیں کرتے۔ ان کی جلالی آواز مزید بلند ہوگئی۔

قرآن پڑھو صاحبزادے قرآن کہ اسمیں اگلی پچھلی تمام باتیں موجود ہیں۔ شک نہ کرو کہ شک شیطان کا ہتھیار ہے۔

مگر قرآن تو مہدی کے حوالے سے خالی ہے۔ میں نے طالب علمانہ معصومیت سے اعتراض وارد کیا۔ گو کہ قرآن میں مھتدی کا لفظ بعض جگہوں پر استعمال ہوا ہے لیکن ظہور مہدی کی خبر اگر واقعی جزو دین ہوتی تو خدا ضرور مومنین کو اس بابت آگاہ کرتا۔

شیخ کے چہرے پر کچھ تشویش کچھ پریشانی اور کچھ غصّہ کے تاثرات پیدا ہوئے۔ فرمایا میاں تم کیا جانو

قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، ایک متن ہے اور ایک روح اور باطن سے صرف اہل اللہ ہی واقف ہیں جنہوں نے اس امر کی شہادت دی ہے کہ آخری زمانہ میں مہدی کا ظہور ہوگا۔ بہت سی نشانیاں ظاہر ہو چکی ہیں۔ اب ان کے ظہور کو کوئی نہیں روک سکتا۔ شکوک وشبہات کے اندھیروں سے نکلو۔ حدیث پڑھو حدیث۔

لیکن جناب بخاری اور مسلم کی کتابیں بھی مہدی کے قصے سے خالی ہیں۔ میری اس صراحت پر ان کے جلال میں مزید اضافہ ہو گیا۔ فرمایا رسالۂ نور پڑھو رسالۂ نور۔ سعید نورسی نے لکھا ہے کہ مہدی رسولؐ اللہ کے خانوادے سے ہوگا۔ اسے سب سے زیادہ سادات کے حلقے سے حمایت ملے گی سو مومنین کو چاہئے کہ وہ حلقۂ اہل بیت کے گرد خود کو مجتمع رکھیں۔ اور یہ جو تم نمازوں میں پانچ وقت آل محمدؐ پر صلوٰۃ وسلام بھیجتے ہو تو یہ اسی سبب تو ہے کہ آخری زمانہ میں سادات کی کثیر آبادی بالآخر منظّم ہو کر دین کی حفاظت اور اس کے غلبہ کے لیے سامنے آئے گی۔ مہدی کے ظہور کی پیش گوئی اگر سچ نہ ہوتی تو پھر آلِ محمدؐ پر صلوٰۃ وسلام کو جاری رکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اس سے پہلے کہ میں مزید کوئی اعتراض وارد کرتا، شیخ نے پہلو بدلا، بانسری پر لگی گھنٹی کے ارتعاش سے گفتگو کے خاتمے کا عندیہ دیا اور اس کی سریلی لَے پر بلغ العلا بکمالہ کے وجد آفریں نغمے نے ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ شیخ کے ساتھ ان کے مریدین نے لَے میں لَے ملائی اور اس طرح جلالی پیشن گوئیوں کا یہ سلسلہ جمالی انبساط پر اپنے اتمام کو پہنچا۔

۷

خوابیدہ اسطورہ

استنبول بھی عجیب شہر ہے۔ میں جتنی بار بھی یہاں آیا ہر مرتبہ پہلے سے کہیں زیادہ اس کی پراسراریت کا احساس ہوا۔ نہ جانے کب کس موڑ پر کون سا اسطورہ اور کون سی تاریخ آپ کا راستہ روک کر کھڑی ہو جائے۔ یہاں ٹوٹی فصیلوں کے سایوں اور خوابیدہ تربت کے الواح نے مل کر اسطورے اور تاریخ کا ایسا تانا بانا تشکیل دیا ہے کہ بسا اوقات ایک کا دوسرے سے الگ کرنا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ جس پتھر کو اٹھایئے اس کے نیچے ایک تاریخ خوابیدہ ہے۔ یہ بازنطین کا شہر ہے، ابوایوب کی آرام گاہ ہے اور محمد الفاتح کی اولوالعزمی کا علامیہ ہے۔ تاریخ اگر چشم عبرت سے پڑھی جائے تو اس کی بے سمتی کے ازالے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور اگر اس پر اسطورہ کی گرد جم جائے تو قافلے کی بے سمتی کا احساس جاتا رہتا ہے۔ اب یہ ہمارے اوپر ہے کہ ہم ان پتھروں کے نیچے سے اسطورہ برآمد کرتے ہیں یا تاریخ۔ ترکوں نے اپنے زوال کو روکنے کے لیے ابتداً اسطورہ کو کام میں لگایا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کی زوال پذیر عثمانی سلطنت میں طلسماتی داؤ پیچ کی کتابیں بڑی مقبول ہوئیں۔ مزعومہ قرآنی وفق ونقوش کے ماہرین نے صورت حال پر بند باندھنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔ خلفاء اور امراء کو اثراتِ بد سے محفوظ رکھنے اور دشمنوں کے ضرر سے بچانے کے لئے ایسے ملبوسات تیار کیے گئے جن پر اوّل تا آخر پورا قرآن مرقوم ہوتا۔ قرآن مجید کے تعویذی نسخے بھی خوب مقبول ہوئے لیکن دافع بلیات کی یہ تمام کوششیں زوال کی اس رفتار میں اضافہ ہی کرتی رہیں۔ کہتے ہیں کہ عباسی خلفاء بھی اس التباس فکری کے شکار

تھے ورنہ بغداد کا عالمی دارالحکومت اتنی آسانی سے تباہ نہ ہوتا۔ان کے ہاں یہ خیال عام چلا آتا تھا کہ رسول اللہ کی ایک چادر جو کبھی اموی خلفاء کے قبضہ میں تھی اور جو اب آل عباس کی تحویل میں چلی آتی تھی، اسے اگر کوئی شخص اوڑھ لے تو محاذ جنگ پر یا خطرے کی گھڑی میں اس کا بال بیکا نہ ہوگا۔ کہتے ہیں کہ آخری عباسی خلیفہ جب قالین میں لپیٹ کر گھوڑوں کی سموں سے کچلا گیا اس وقت اس نے یہی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اکیسویں صدی کے استنبول کی شاہراہوں پر چلتے پھرتے، قہوہ خانوں میں گفتگو کرتے اور پبلک مقامات پر لوگوں سے ملاقات کے دوران اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ آج بھی اہل ترک کسی ایسی قبا کی تلاش میں ہیں جو انہیں دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھ سکے۔معاملہ اب صرف محفوظ رکھنے کا نہیں بلکہ اس صورت حال سے نجات دلانے کا بھی ہے جس نے ترک قوم کو اس کے تاریخی جاہ وحشم اور عظیم قائدانہ رول سے محروم کر رکھا ہے۔شاید اسی لیے ایک مرد ے از غیب کے ظہور کا انتظار شدید سے شدید تر ہوتا جاتا ہے۔

میں نے مصطفیٰ اوغلو سے پوچھا تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے۔کیا واقعی وہ عنقریب ظاہر ہونگے ؟

جی ہاں سننے میں تو یہی آرہا ہے۔ بلکہ چند برسوں پہلے تو نوجوان لڑکے لڑکیوں میں ان کی متوقع آمد کا بڑا غلغلہ تھا۔ ہر لمحہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ پتہ نہیں کب کس ویران گلی یا خوابیدہ مدفن سے کوئی سفید ریش بزرگ ہاتھوں میں تسبیح ہزار دانہ لیے برآمد ہو اور وہ اپنے مہدی ہونے کا اعلان کردے،لیکن ادھر چند سالوں سے وہ غلغلہ انگیز کیفیت باقی نہیں رہی۔

تو کیا آپ کسی مہدی کے منتظر نہیں؟

میرے اس استفسار پر مصطفیٰ اوغلو مسکرائے، باسفورس کی آہستہ خرام لہروں پر ایک نظر ڈالی، کہنے لگے ہم میں سے ہر شخص مہدی ہے۔آپ بھی مہدی اور میں بھی مہدی۔اب تاریخ کی درستگی کا کام ہم سبھوں کو مشترکہ طور پر انجام دینا ہے۔آخری رسولؐ کے بعد اب کسی اور کا انتظار کارِلایعنی ہے۔

لیکن یہاں استنبول میں تو ان کے آنے کی خبر خاصی گرم ہے۔

جی ہاں آپ کا اندازہ صحیح ہے۔ یہ دراصل لوگوں کا اضطراب ہے، وہ بہرصورت حالات کو بدلنا چاہتے ہیں۔اور جب ان کا بس نہیں چلتا تو وہ ایک مرد ے از غیب کے سہارے اپنی محرومیوں کی تلافی کی کوشش کرتے ہیں۔افسوس کہ دینی اور سیکولر دونوں حلقے اسی اساطیری طرز فکر کے شکار ہیں۔وہ جلدی میں ہیں اور کسی شارٹ کٹ کی تلاش میں۔

تو کیا آپ کے خیال میں مذہبی علماء کی طرح اتاترک بھی اساطیری طرزِ فکر کے شکار تھے؟

جی ہاں! بالکل۔ اسطورہ غیر عقلی رجحان اور اوہام کے بطن سے جنم لیتا ہے۔ اس کا شکار ہونے کے لئے مذہبی یا سیکولر ہونے کی شرط نہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو سیکولر لوگوں کے ہاتھوں کہیں زیادہ خطرناک اور مہلک اسطورہ جنم لیتا ہے۔

اتاترک نے نئی قومی شناخت کے قیام کے لیے ترک قوم کو ایک اساطیری تاریخ کا حامل بتایا جو اس کے تراشیدہ اسطورہ کے مطابق ۵۰۰۰۰ سال قبل مسیح سے کسی خیالی براعظم مو پر آباد چلی آتی تھی۔ کہا گیا کہ ماحولیات کی تبدیلی کے سبب یہ براعظم غائب ہو گیا۔ لوگ مختلف علاقوں میں منتشر ہو گئے۔ اناطولیہ کے Hittites ترک قوم کا تسلسل ہیں جنھوں نے ایک زمانے میں عظیم سلطنت قائم کر رکھی تھی۔ آج بھی انقرہ میں Hittitie تہذیب کا شمسی دائرہ ترکوں کی تراشیدہ عظمت کی علامت کے طور پر آویزاں ہے۔ کچھ اسی قسم کے توہمات نے ہٹلر کے دل و دماغ میں جرمن قوم کے فطری تفوق کا خیال راسخ کیا۔ وہ اس خیال کا اسیر ہو گیا کہ خیالی سیارہ اٹلانٹس کے مکیں سفید فام جرمن قوم کو تمام اقوامِ عالم پر حکمرانی کے لیے بنایا گیا ہے۔ ہٹلر کی طرح اتاترک نے بھی تمام سابقہ اساطیر اور تاریخ کو یکسر مسترد کر دیا۔ وہ اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ ہمیشہ سے انسانی تہذیب کی گاڑی مختلف اقوام و ملل کے مشترکہ وسائل اور ایندھن سے چلتی رہی ہے۔ اس کی حیثیت انسانیت کے اجتماعی سرمایے کی ہے۔ اس اجتماعی اِنرشیا کے بغیر ایک نئی ابتداء ہمیشہ non-starter رہے گی۔ اتاترک کا تراشیدہ اسطورہ پچھلوں کے اِنرشیا سے محروم تھا سو اس گاڑی کو جتنا بھی دھکا دیا گیا وہ اسی رفتار کے ساتھ پیچھے کی طرف لوٹ آئی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اس عمل میں ترک قوم کی کوئی پون صدی ضائع ہو گئی۔

باتوں باتوں میں یہ پتہ ہی نہ چلا کہ ہم سلطان محمد فاتح پل کب کا عبور کر چکے۔ اور اب جو سامنے نظر پڑی تو دفعتاً احساس ہوا کہ ہماری کار ایک ایسی عمارت کے سامنے کھڑی ہے جو او، آئی، سی اور مختلف مسلم ممالک کے جھنڈوں سے آراستہ ہے۔ مسلم تاریخ و تہذیب اور فنون کے مطالعے کا یہ مرکز گذشتہ تین دہائیوں میں بڑے نادر وثائق اور اہم دستاویزات شائع کر چکا ہے۔ ان میں قرآن مجید کے وہ نسخے بھی ہیں جنہیں حضرت عثمانؓ سے منسوب کیا جاتا ہے اور جس کی زیارت کا شوق استنبول کے پہلے سفر میں مجھے توپ کاپی سرائے تک لے گیا تھا۔ اب عام شائقین کو اس نسخہ کی زیارت کے لیے توپ کاپی سرائے جانے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ مرکز مطالعۂ تاریخ نے اس نسخہ کا عکس بڑے تزک و احتشام سے شائع کر دیا ہے۔ مصر میں سیدنا حسین کی مسجد میں بھی

حضرت عثمانؓ سے منسوب قرآن مجید کا ایک نسخہ مشہور چلا آتا ہے۔ اس کی اشاعت کے لیے بھی محققین کمر کس رہے ہیں۔ دنیا بھر میں کم از کم سات ایسے قرآنی نسخے پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ بوقت شہادت حضرت عثمانؓ کے مطالعہ میں تھے اور جن پر ان کے خون کے دھبّے موجود ہیں۔ جن میں سب سے مشہور تاشقند کا نسخہ ہے۔ اب ان نسخوں کی اشاعت سے کم از کم اتنا تو ہوگا کہ تاریخ پر اسطورہ کی جو گرد جم گئی ہے اسے دور کرنے میں مدد ملے گی۔ توپ کاپی سرائے کے پہلے سفر میں ہی مجھے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ حضرت یوسفؑ کی پگڑی ہو یا رسولؐ اللہ کی نعلین مبارک، حضرت علیؓ کی ذوالفقار ہو یا دوسرے مقدس آثار، ان کا تقدس اسطورہ کے دم سے قائم ہے۔ تاریخ کے معیار پر ان کی حیثیت منسوب الیہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ مصحف عثمانؓ کے مختلف نسخوں کی اشاعت سے عام لوگوں کے لیے اس بات کا اندازہ لگانا آسان ہو جائے گا کہ دنیا بھر میں موئے مبارک، نشانِ قدم اور دوسرے آثار و نوادرات کی واقعی حقیقت کیا ہو سکتی ہے، خاص طور پر ایک ایسے دین میں جو اشیاء میں تقدیس کا حوالہ مٹانے آیا ہو۔

مرکز مطالعۂ تاریخ کا سارا زور تاریخ و تراث کی حفاظت پر ہے۔ اسے جدید دنیا سے کچھ بھی علاقہ نہیں۔ بیسویں صدی میں عالم اسلام کے مختلف حصّوں میں جو جابر بادشاہتیں یا آمریتیں قائم ہوئیں انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ اسلام کو ایک زندہ اور معاصر دین کے طور پر دیکھا جائے سو انہوں نے اپنے آپ کو اسلامی تاریخ و آثار کے محافظ کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ اسلام بھی دوسرے قیمتی نوادرات کی طرح میوزیم کی چیز بن گیا۔ خلیجی ممالک ہوں یا شمالی افریقہ کی مسلم ریاستیں یا خود جدید ترکی، دینی جذبے کی تسکین کے لیے تاریخ و تراث کی حفاظت اور کسی حد تک اس کی آبیاری کو کافی سمجھا گیا۔ تب شاید حکمرانوں کو اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ تاریخ خواہ کتنی ہی خوابیدہ نظر آئے ماحول سازگار ہو تو بول اٹھتی ہے۔ پھر تاریخ کے نقار خانے میں حکمرانوں کی آوازیں، خواہ اس کے پیچھے ریاست کی کتنی ہی بڑی قوت کیوں نہ ہو، کان پڑے سنائی نہیں دیتی۔ عالم عرب میں تاریخ و تراث کی خاموش کلامی بالآخر ایک عوامی انقلاب پر منتج ہوئی۔ نئی نسل کو جب ایک بار یہ پتہ چل گیا کہ اس کا تعلق ان تہذیبی نوادارت سے ہے جسے ماضی کے پس منظر میں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اس کے آباء و اجداد اس تاریخی رزمیہ کے کلیدی کردار رہے ہیں جس سے عالمی تہذیب کی جلوہ سامانیاں عبارت ہیں تو اس کے لیے ممکن نہ رہا کہ وہ بے چارگی کی اس مصنوعی صورت حال پر قانع رہ سکے۔ استنبول میں بھی چلتے پھرتے ہر لمحہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تاریخ آپ کو کچھ کر گزرنے پر اکسا رہی ہو، نئی نسل جو قدیم رسم الخط سے

ناواقف ہے اس کے اضطراب میں اس وقت مزید اضافہ ہوجاتا ہے جب وہ یہ دیکھتی ہے کہ قبروں پر لگے کتبے اور عمارتوں پر لگے الواح اس کے لیے بے معنیٰ ہو کر رہ گئے ہیں۔ استنبول کی تمام تاریخی عمارتیں، مساجد اور اس سے ملحقہ قبرستان خوبصورت خطاطی سے معمور ہیں جو مضطرب نوجوانوں کو مسلسل یہ دعوت دیتے رہتے ہیں کہ آؤ مجھے دریافت کرو، مجھے عبور کیے بغیر تم خود اپنے شہر میں آخر کب تک اجنبی رہو گے؟

۸

یا صاحب الزماں! ادرکنی، ادرکنی، الساعۃ

مرکز مطالعۂ تاریخ کی لائبریری اپنے حسنِ انتظام، آرائش وزیبائش اور کتابوں کے حسن انتخاب کے سبب اپنے اندر دلچسپی کا وافر سامان رکھتی ہے۔ اسلامی تاریخ وتراث کی حفاظت کا اس قدر اہتمام شاید ہی کہیں اور ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دنیا بھر سے شائقین و محققین کی آمد کا یہاں تانتا بندھا رہتا ہے۔ ابھی میں قرآن مجید کے ایک قدیم قلمی نسخہ کی ورق گردانی میں مصروف تھا کہ لکڑی کے زینہ پر قدموں کی دھمک اور نسوانی آوازوں کا ارتعاش سنائی دیا۔ وہ چند لڑکیاں تھیں جو غالباً کسی کی تلاش میں تھیں۔ اب جو قریب آئیں اور علیک سلیک ہوئی تو ایسا لگا کہ آواز کچھ مانوس سی ہو۔ شکل صورت بھی دیکھی بھالی ہو۔ اچھا تو یہ بسمہ الخطیب ہیں۔ ابھی چند مہینے پہلے ان سے استنبول ہی میں ملاقات ہوئی تھی تب وہ اسلام، شہریت اور شناخت کے موضوع پر منعقد ہونے والی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شریک تھی۔ کہنے لگی مجھے آپ کی آمد کا کل ہی علم ہو گیا تھا، یہ ہیں ہماری سہیلی نحلہ، ان کا تعلق بھی موصل سے ہے، آپ تصوف کے ارتقاء پر آئیر لینڈ میں پی ایچ ڈی کر رہی ہیں، اس نے ایک روشن کتابی چہرے والی خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور یہ ہیں صنم، خاص استنبول کی رہنے والی ہیں جو آج کل خطاطی سیکھ رہی ہیں اور قدیم ترکی رسم الخط میں فن خطاطی کی اہمیت پر تحقیق کا ارادہ رکھتی ہیں۔ اور یہ ہیں ایلاہ جو استنبول یونیورسٹی میں ایم، اے، سیاسیات کی طالبہ ہیں۔ اور ہاں مجھے سب سے پہلے تو آپ سے معذرت کرنی ہے کہ میں بغیر کسی اجازت اور طے شدہ پروگرام کے آپ کے مطالعہ

میں مخل ہوئی۔ ہم لوگ تو صرف یہ کہنے آئے تھے کہ آج ظہرانے کے دوران یا اس کے فوری بعد اگر ممکن ہو تو آپ ہمیں کچھ وقت دیں۔ ہمارے پاس بہت سے سوالات ہیں، ایسے سوالات جو اگر جستجو کی شاہراہ پر چل نکلیں تو ایک نئی دنیا تعمیر ہو جائے۔

بسمہ کی گفتگوئی دنیا، فجر جدید، نئے فکری شاکلے اور نئے پیراڈائم جیسی اصطلاحات سے مملو رہتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ کسی ایسی دنیا کی باسی ہو جس کا وجود میں آنا ابھی باقی ہو۔ وہ حال سے کہیں زیادہ مستقبل میں جیتی ہے۔ گذشتہ دنوں جب وہ مسلم شہریت اور شناخت کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کر رہی تھی تو اس کے ہر جملہ سے اس احساس میں اضافہ ہوتا جاتا تھا کہ بسمہ جیسی مسلمانوں کی نئی نسل نئی سیاسی حد بندیوں میں اپنی شہریت اور شناخت کے سلسلے میں شدید ابہام اور اضطراب کا شکار ہے۔ ماضی اس کی دسترس سے باہر، حال ساقط الاعتبار اور مستقبل اندیشوں اور امکانات کے پردوں میں مستور۔

استنبول کی مذکورہ کانفرنس کے انعقاد کا مقصد تو یہ تھا کہ مغرب میں مسلمانوں کی یورپی شناخت اور شہریت کے قضیہ کو حل کیا جائے۔ یوروپی ممالک کے شہری کی حیثیت سے ملّی اور اسلامی شناخت کے مقابلے میں ملکی شناخت کی اہمیت کیا ہے اور یہ کہ مسلمانوں پر ان ملکوں کی شہریت کے سبب کیا کچھ فرائض واجب الادا ہیں؟ لیکن جب بات سے بات نکلی تو مغربی ملکوں کی شہریت کے مسئلہ کو کیا پوچھیے خود مسلم قومی ریاستوں کی شہریت مشکوک اور ساقط الاعتبار ہو گئی۔ جب سے عالم اسلام میں اہل فکر نوجوانوں کی ایک نئی نسل پیدا ہوئی ہے اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا ہے کہ عالم اسلام کی مرکزی سرزمین میں عراقی، کویتی، سعودی، اماراتی، مصری، تیونسی جیسی مختلف اور متحارب شہریتیں ہمارے ملی وجود پر کیوں تھوپ دی گئی ہیں۔ اور یہ کہ ان تراشیدہ شناختوں کی واقعی حقیقت کیا ہے۔ کویت کا قومی مفاد عراق کے قومی مفاد سے متصادم، کردستان کا وجود شام اور ترکی کے لیے نا قابل انگیز، سوڈانی، مصری اور مراکشی لیبیا کے فطری وسائل سے محروم اور جزیرۃ العرب میں سعودی، کویتی، اماراتی، یمنی، عمانی جیسی مصنوعی شناختوں کی تشکیل کے ذریعہ امت واحدہ پر اس کے فطری وسائل کا دروازہ بند کر دینا، یہ سب کچھ آخر اسلام کی کس تعبیر کے سبب ہے۔ حالانکہ جب مسلمان ایک امت تھے، ان کی شہریت اور شناخت صرف اور صرف اسلام تھی تو ملائشیا سے لے کر مراکش بلکہ مسلم اسپین تک عالم اسلام کے وسیع و عریض خطے میں مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم اقوام بھی خدا کے عطا کردہ فطری وسائل سے یکساں مستفید ہوتیں۔ خوشحال زندگی کے نئے امکانات کے سبب ایک خطہ سے دوسرے خطہ میں نقل مکانی معمول کی بات سمجھی

جاتی۔ بلخی، سمرقندی، ہندی، خراسانی، اوراسفہانی لاحقوں کے ساتھ نزیل مکہ یا نزیل استنبول لکھنا معمول کی بات تھی۔ تب مسلمانوں کی شہریت مصنوعی قومی سرحدوں سے ماوراء تھی۔ اسلام ان کا دین بھی تھا اور شہریت بھی۔

بسمہ ویسے تو قرآنیات کی طالبہ تھی لیکن اس کے سوالات کے تیر مختلف سمتوں میں چلا کرتے تھے۔ کبھی تاریخ، کبھی سیاست، کبھی تصوف اور کبھی روایت۔ وہ ایک مضطرب روح تھی جو اپنے سوالات کی تیز دھار سے دوسروں کو مجروح کرنے کا ہنر جانتی تھی۔ اس کا ہر سوال ایک نئے سوال کو جنم دیتا بلکہ یہ کہیے کہ وہ ہر سوال کا جواب ایک نئے سوال سے دیتی۔

اس کے ہاتھ میں کسی تازہ کتاب کے چند نسخے تھے۔ کہنے لگی ابھی ابھی شائع ہوئی ہے یہ کہہ کر اس نے کتاب کھولی، مصنفہ کی حیثیت سے اپنے دستخط ثبت کیے اور میرے ہاتھوں میں تھما کر یہ کہتی چلی گئی کہ انشاءاللہ اب ظہرانے پر ملاقات ہوگی۔ خلاصة المقال فی المسیح الدّجال ، میں نے ایک نظر کتاب پر ڈالی اور دوسری نظر مصنفہ پر، زیرلب مسکرایا اور وہ یہ جا وہ جا اپنی سہیلیوں کے ساتھ رخصت ہوگئی۔

ظہرانے میں ہمہ ہمی اور چہل پہل کا سماں تھا۔ خاص موصل یونیورسٹی سے طلباء وطالبات کی دو بسیں آئی تھیں۔ جغرافیائی قربت کے سبب ترکی میں اہل موصل کی آمد بنی رہتی ہے اور غالباً اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ عراقی کردوں کی رشتہ داریاں ترکی میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ابھی میں ڈائننگ ہال میں داخل ہی ہوا تھا کہ ایک ترک لڑکی ہمارے میزبان مصطفی اوغلو کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی آئی اور ترک زبان میں ان سے کچھ کہنے لگی۔ میری سمجھ میں بس اتنا آیا کہ وہ شیخ عائض کے متعلق کچھ کہہ رہی ہے۔ پتہ چلا میرے لیے شیخ عائض اور دوسرے مہمانان خصوصی کے ساتھ یکجا نشست کا اہتمام کیا گیا ہے۔ شیخ عائض پہلے ہی سے تشریف فرما تھے۔ یہی کوئی ساٹھ پینسٹھ کی عمر ہوگی۔ چہرے پر گوکہ ریش مبارک نہ تھی لیکن ہاتھ میں خوبصورت تسبیح اور اس سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت بلکہ پر جلال عصا تھامے ہوئے تھے۔ لباس گوکہ مغربی طرز کے سوٹ پر مشتمل تھا لیکن کلاہ لالہ رنگ پر سفید دائروی پٹی نے مشرقی جاہ وجلال کا منظر قائم کر رکھا تھا۔ گفتگو میں افہام وتفہیم کے بجائے فرمان کا سا انداز نمایاں تھا۔ تسبیح کو انگشتِ شہادت پر گردش دیتے ہوئے بڑی قطعیت کے ساتھ اپنے فرمودات کچھ اس طرح عطا کر دیتے گویا یہ نکتہ ابھی ابھی کسی ناموس نے اس کے کان میں پھونکا ہو۔ ابھی علیک سلیک اور تعارف کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ انہوں نے اپنی تسبیح کو انگشتِ شہادت سے حرکت دی، ہوا میں کچھ دیر اسے دائروی گردش دیتے رہے اور پھر کسی قدر بلند آہنگی سے فرمانے لگے:

عجل یا امام زماں! عجل یا مہدیٔ آخرالزماں!

حاضرین کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور فرمایا: بس اب وہ آنے والے ہیں۔ کسی وقت اور کسی لمحہ بھی اچانک تم ان کے ظہور کی خبر سنو گے۔ کہتے ہیں کہ بعض اہل کشف نے انہیں دیکھا بھی ہے اور وہ ان سے ملاقات بھی کر چکے ہیں۔ خیال اغلب ہے کہ وہ استنبول ہی میں ہیں، مناسب وقت کے انتظار میں، یہاں تک کہ تمام نشانیاں ظاہر ہو جائیں۔

ہم جیسے نو وارد مہمانوں کو شیخ کی بات کچھ سمجھ میں آئی اور کچھ نہ آئی۔ البتہ ان کے حلقۂ مریداں کی زبانوں پر زیرلب مختلف اوراد و وضائف کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ گاہے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سب اپنے اذکار و مراقبہ کے زور پر مستقبل کے مہدی کو برآمد کر کے ہی دم لیں گے۔ چند ثانیے بعد زیرلب پراسرار وظائف کا زور تھما۔ اور اہل محفل عام شب و روز کی کیفیت میں واپس آ گئے۔

شیخ عائض کو تصور مہدی میں اس قدر غرق دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ ان سے مہدیٔ مستور کا اتا پتا معلوم کیا جائے۔ کیا پتہ وہ ان گلیوں اور بازاروں سے واقف ہوں جہاں مستقبل کے مہدی نے مناسب وقت کے انتظار میں اپنے ظہور کو روکے رکھا ہے۔ کھانے کی میز پر ڈشیں بدلتی رہیں، کارندے بڑی مستعدی کے ساتھ ایک ڈش کے اختتام پر دوسری ڈش سجاتے رہے لیکن میرا ذہن اسی کرید میں لگا رہا کہ شیخ عائض جو مہدی منتظر کے خیال میں اس قدر مستغرق بلکہ لت پت زندگی جیتے ہیں آخر اس کا سبب کیا ہے؟ صبح و شام بلکہ ہر گھڑی اور ہر لمحہ ظہور مہدی کے امکانات و اندیشے کے ساتھ جینا کیا ان کے ہاں کسی ہلو سے کے سبب ہے یا یہ سب کچھ ان غیبی اشارات کا حصہ ہے جن پر اہل تصوف اور اہل تشیع بلکہ خوش عقیدہ مسلمانوں کا ایک قابل ذکر طبقہ بے سوچے سمجھے ایمان لے آیا ہے۔

کھانے کے بعد جب طلبا کے ساتھ انٹرایکشن کی مجلس قائم ہوئی تو میں نے بسمہ سے خاص طور پر درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو شیخ عائض کو بھی اس مجلس میں شرکت کی دعوت دیں۔ وہ ایک زندہ legend ہیں۔ ان کی موجودگی ہمارے لیے کشف و اکتشاف کا باعث ہوگی اور کیا عجب کہ ان کے توسط سے ہمیں مہدی منتظر کا پتہ ہاتھ آ جائے۔ خدا کا کرنا شیخ نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

ڈائننگ ہال سے متصل کانفرنس روم کا کمرہ قدرے کشادہ اور مرصع جگہ تھی جہاں وسیع و عریض دائروی میز پر کوئی تیس پینتیس مائکروفون لگے تھے۔ کمرے کے چاروں طرف دیواروں کے سہارے مزید آرام دہ

نشستیں لگیں تھیں۔ دیوار پر ایک طرف اسکرین آویزاں تھی جس پر پروجیکٹر جیسے آلات کی مدد سے نئی ٹکنالوجی کے شائق مقررین شغل کیا کرتے ہوں گے۔ ان دائروی میزوں کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ یہاں خطیب اور سامع تقریباً ایک ہی سطح پر ہم کلام ہو سکتے ہیں۔ ورنہ مشرق کی مشائخانہ روایت میں جہاں واعظ بلند مقامی سے خطاب کرتا ہے سامعین کے لیے آمناً وصدقناً کہنے کے علاوہ اور کوئی چارا نہیں رہ جاتا۔ خاص طور پر ترکی کی جامع مسجدوں میں واعظ کی بلند بامی کا احساس کچھ زیادہ شدت کے ساتھ ہوتا ہے۔ شیخ عائض کے لیے بھی غالباً یہ قدرے غیر مانوس تجربہ تھا۔ انہوں نے ابتداہی میں یہ بات صاف کر دی کہ آج وہ کوئی خطبہ دینے کے بجائے اپنے دل کا درد بیان کرنا چاہیں گے اور ان کی خواہش ہوگی کہ وہ اس درد کو نئی نسل کو منتقل کر سکیں کہ یہ وہ سرمایا ہے جو انہوں نے زندگی بھر سنبھال سنبھال کر رکھا ہے، اس کی آبیاری کی ہے اور اب اس کی منتقلی کا وقت آپہنچا ہے۔ فرمایا:

عزیزانِ من! آپ پر خدا کی سلامتی ہو۔

میں آپ کے درمیان جبل سنجر سے ایک پیغام لے کر آیا ہوں بلکہ اسے ایک بشارت کہہ لیجئے۔ اس سے پہلے کہ میری آنکھ بند ہو جائے میں چاہتا ہوں کہ یہ پیغام آپ تک پہنچا دوں۔ دنیا قرنہا قرن کے سفر کے بعد اب آخری مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ کوئی لمحہ اس کے اختتام کا اعلان ہونے والا ہے لیکن اس سے پہلے کہ ایسا ہو خدا کی اسکیم ہے کہ اس کے نام لیوا سر بلند ہوں، دنیا امن وانصاف سے بھر جائے۔

نشانیاں ظاہر ہو چکی ہیں! ہم امام مہدی کے ظہور کی آخری ساعت میں ہیں۔ نہ جانے کب، کس طرف سے ان کے ظہور کی خبر آجائے۔ ایسا لگتا ہے جیسے مسلسل کوئی میرے دل کے نہاں خانے میں مجھ سے سرگوشی کرتا ہو کہ وہ لمحہ، مبارک اور متبرک لمحہ اب قریب، بہت قریب آپہنچا ہے۔

عزیز طلباء وطالبات!

میرا تعلق جبل سنجر کے اس خانوادے سے ہے جس پر شیطان کی عبادت کا الزام عائد کیا جاتا ہے اور شاید یہ کچھ غلط بھی نہیں۔ میں یزیدی خاندان میں پیدا ہوا جو اپنے آپ کو اہل حق اور دوانسی کہتے ہیں۔ بنیادی طور پر ہم کردوں کی نسل سے ہیں لیکن مذہبی اعتبار سے ہماری شناخت ایک الگ مذہبی طائفے کی رہی۔ موصل سے کوئی ساٹھ کلو میٹر شمال مشرق میں شیخ عدی بن مسافر کی قبر کو ہماری زیارت گاہ کی حیثیت حاصل ہے جو غالباً بارہویں صدی میں کوئی اسمعیلی مبلغ ہوا کرتے تھے۔ ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ خدا نے دنیا بنائی اور اس کے انتظام

وانصرام کو فرشتوں کے حوالے کر دیا۔ ملک طاؤس جوان فرشتوں میں سب سے بڑا ہے وہی شیطان کا روپ بھی ہے سو اس کی ناراضگی مول لینا بھی مناسب نہیں۔ ہم بیک وقت شیطان اور رحمٰن کی عبادت کرتے تھے اور ان دونوں کی رضا و خوشنودی کو اپنا مقصود جانتے تھے کہ بابا شیخ نے ہمیں یہی بتایا تھا یہاں تک کہ شیخ نورسی کی تحریروں سے میری واقفیت ہوئی۔ شیخ نورسی کا رسالۂ نور میرے ہاتھ کیا لگا اس نے میرے دل کی دنیا بدل ڈالی۔ شیخ سعید نورسی کی تحریریں معرفت کا بیش بہا خزانہ ہیں۔ میں جس قدر اس میں ڈوبتا گیا میری روح ابھرتی گئی، مصفیٰ اور مجلیٰ ہوتی گئی۔ آج عمر کے ترسٹھویں سال میں ہوں جو سنت کے مطابق طبعی عمر کی تکمیل کا سال ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے لیے اس دنیا سے کوچ کا وقت آ پہنچا ہے۔ لیکن ایک کام ابھی باقی ہے اور شاید اسی لیے خدا نے میری مہلت دراز کر رکھی ہے۔ میں گذشتہ چالیس سال سے اس عظیم عالی مرتبت ہستی کے انتظار میں سوتا جاگتا رہا ہوں۔ ہر لحہ اس کے ظہور کی طلب سے میری دعائیں اور آہ وزاریاں معمور رہی ہیں۔ شیخ نورسی نے لکھا ہے اور بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ آخری زمانے میں جب حق مغلوب ہو جائے گا، حق تعالیٰ اس کی سربلندی کے لیے عبدالقادر جیلانی اور شاہ نقشبندی کے سلسلے سے وقت کے مہدی کو ظاہر کرے گا۔ تمام سادات اور آلِ بیت مہدی کے گرد جمع ہو جائیں گے۔ نورسی نے آیت کریمہ قل لا أسئلكم عليه أجرا إلا المودة في القربى کی تعبیر میں صاف لکھا ہے کہ رسول اللہ کی یہ خواہش کہ امت ان کے اہل خانہ کے گرد جمع ہو اس سبب ہے کہ مستقبل میں امت کی رشد و ہدایت کا کام ائمۂ اہل بیت اور سادات سے لیا جانا ہے۔

عزیزانِ من! امت میں تجدید و احیاء کی جتنی بڑی تحریکیں اٹھیں ان سبھوں کی قیادت سادات نے کی۔ ان میں سے بعض نے مہدیت کا دعویٰ کیا اور بعض کو خلائق نے اس منصب کا مستحق سمجھا۔ سید احمد سنوسی (متوفیٰ ۱۹۰۲ء) یا سید ادریس (متوفیٰ ۱۹۵۰ء) ہوں یا سید یحییٰ (متوفیٰ ۱۹۴۸ء) یہ سب سادات کے خانوادے سے اٹھے تھے اور یہی حال سید عبدالقادر جیلانی (متوفی ۱۱۶۸ء) سید ابوالحسن الشاذلی (متوفی ۱۲۵۸ء) اور سید احمد البدوی (متوفی ۱۲۷۶ء) کا ہے جو سادات کے خانوادے سے اصلاح احوال کے لیے اٹھے اور جن کی خدمات کی ایک دنیا قائل ہے۔

بدیع الزماں سعید نورسی نے ہمیں یہ بھی خبر دی ہے کہ مہدی بنیادی طور پر تین امور کو انجام دے گا۔ اولاً وہ مادیت کے سیلاب پر بند باندھے گا جس کے نتیجہ میں ایمان کی فصل لہلہا اٹھے گی۔ ثانیاً وہ اسلامی شعائر کو زندہ کرے گا جس سے اسلام میں پھر سے زندگی کے آثار پیدا ہو جائیں گے۔ ثالثاً وہ تمام مومنین کو اور خاص طور

پر علماء وصلحاء وسادات کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرے گا جس کے نتیجے میں ایک بار پھر دنیا پر اسلامی شریعت کا پھریرا لہرائے گا۔ آج مادی افکار، خاص طور پر ڈارون ازم، فرائیڈ ازم اور کیپٹل ازم کے غبارے سے ہوا نکل چکی ہے۔ کافرانہ hat اور بے حجابی کی جگہ داڑھیوں اور اسکارف کا چلن عام ہوتا جا رہا ہے۔ اسلامی فنانس، اسلامی بینکنگ، حتیٰ کہ اسلامی طریقۂ ادویات اور علاج کو بھی غیر معمولی مقبولیت مل رہی ہے۔ شریعت کے نفاذ اور خلافت کے قیام کی باتیں بھی ذوق وشوق سے کی جا رہی ہیں۔ اب ایک ذرا سی کسر رہ گئی ہے جس نے ظہور مہدی کو روک رکھا ہے اور وہ ہے عامۃ المسلمین، علماء وصلحاء اور خاص طور پر سادات کا ایک مرکز کے گرد اتحاد۔ پھر اس کے بعد مہدی کے ظہور کو کوئی چیز نہیں روک سکتی وہ یقیناً آ کر رہیں گے بلکہ اہل کشف تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ آ چکے ہیں، ہمارے درمیان موجود ہیں، ہماری سڑکوں اور بازاروں میں بہ نفس نفیس رونق افروز ہیں۔ بس اس بات کے منتظر کہ آخری کسر پوری ہو اور وہ ہمیں مزید زحمتِ انتظار سے نجات دلائیں۔

عزیز نوجوانو! پتہ نہیں مجھے وہ دن دیکھنا نصیب ہو یا نہ ہو لیکن تم جب مہدی کا زمانہ پاؤ تو ان کے ہاتھوں پر بیعت میں تاخیر نہ کرنا، انہیں اپنا ہر ممکن تعاون دینا، ان پر اپنا جان ومال نچھاور کر دینا۔ اللهم عجل لوليك الفرج! اللهم إني اسألك يا الله يا الله يا الله يا من لايقهر... یہ کہتے ہوئے شیخ عائض کی آواز رندھ گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

شیخ عائض کی دلگرفتہ تقریر اور ان کی آہ وبکا نے مجلس پر یک گونہ سکوت طاری کر دیا۔ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ایک طرف شیخ کے حفظ ومراتب اور ان کی کبر سنی کا خیال اور دوسری طرف مہدی موہوم کی جستجو، بظاہر ایسا لگا جیسے کسی سنجیدہ، بے لاگ علمی گفتگو کے لیے اس مجلس میں اب کوئی موقع باقی نہیں رہ گیا۔ لیکن بسمہ بھی کب ہار ماننے والی تھی اس نے اپنا مائکروفون آن کیا مجلس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور کچھ اس طرح گویا ہوئی:

دوستو! آج کی یہ غیر رسمی مجلس جس شخص کے اعزاز میں منعقد کی گئی ہے اس کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہمیں اساطیر اور تاریخ کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے اور انھیں اس کی اصل حیثیت سے برتنے کا فن سکھایا ہے۔ میری مراد ڈاکٹر شاز کی ذاتِ گرامی سے ہے جن کی تحریروں نے مجھے بعض اہم سوالات کے جوابات ہی فراہم نہیں کیے بلکہ نئے سوالات قائم کرنے کا فن سکھایا۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے آپ کی جو سب سے پہلی تحریر میرے ہاتھ لگی وہ مجلّہ فیوچر اسلام کا ایک اداریہ یوروپی مسلم شناخت کے مسئلہ سے متعلق تھا۔ پھر تو میں نے تلاش تلاش کر آپ کی چیزیں پڑھ ڈالیں۔ میں نے اگر ان تحریروں سے کوئی ایک بات سیکھی ہے تو وہ یہ

کہ مسلمات کو محض مسلمات قرار دیے جانے کے سبب بغیر تحقیق و تفتیش کے قبول نہیں کر لینا چاہئے۔ تحلیل و تجزیہ کی میزان پر عقل اور وحی کی روشنی میں ہر مسلمہ، ہر لحہ قابل جرح ہے۔ اس منہج پر ہمارا علمی اور فکری سفر ہمیں ان بہت سے التباسات اور اساطیر سے نجات دلا سکتا ہے جو گزرتے وقتوں کے ساتھ عقائد اور مسلمات کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

شیخ عائض کی میں دل سے قدر کرتی ہوں۔ انہوں نے اپنے احساسات کو بلا کم و کاست اور بلا خوف لومۃ لائم ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ وہ صدق دلی سے یہ سمجھتے ہیں، جیسا کہ ان کی ذاتی زندگی اور زہد و تقویٰ اس پر دال ہے کہ ان کے پاس ایک پیغام ہے، مہدی منتظر کی آمد کا پیغام، جسے آپ نے نئی نسل کو منتقل کر دیا ہے۔ آپ کی صاف گوئی کے لیے بہت بہت شکریہ۔ البتہ ہم، جنہیں شیخ کے بقول مستقبل کے مہدی کا دست و بازو بننا ہے، جو صدیوں سے آ کر نہیں دیتا اور اگر آتا بھی ہے تو اس کے جانے کے بعد پتہ یہ چلتا ہے کہ وہ دراصل مہدیٔ مطلوب نہیں تھا۔ تو کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم اس مسلمہ کو عقل اور قرآن کی روشنی میں از سرِ نو تحقیق و تجزیہ کا موضوع بنائیں۔

آپ کی دلچسپی کے لیے ایک واقعہ عرض کروں۔ سنہ ۲۰۰۴ میں جب میں آئر لینڈ میں اپنی Ph.D. کے مقالہ پر کام کر رہی تھی، بغداد پر امریکی اور مغربی اتحادی فوجوں کی یلغار جاری تھی۔ صدام حسین اقتدار سے بے دخل کیے جا چکے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب کویت کی جانب سے امریکی ٹینک عراق میں داخل ہو رہے تھے اور اتحادی طیاروں نے اندھا دھند بمباری کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا اسی دوران اخبارات میں ایک صحرائی آندھی کا بڑا ذکر پایا جاتا تھا۔ خوش گمان عوام اس خیال کے اسیر ہو گئے تھے کہ یہ صحرائی آندھی صدام کی تائید غیبی کا مظہر ہے لیکن جلد ہی یہ خوش فہمیاں کافور ہو گئیں۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ سنہ ۲۰۰۴ء میں اتحادی فوجیوں کا مہدی آرمی (جیش المہدی) سے راست ٹکراؤ ہوا۔ اندیشہ تھا کہ مقتدیٰ الصدر گرفتار ہو جائیں۔ اس دوران آئر لینڈ کے ایک شیعہ اسلامی مرکز میں میرا کثرت سے آنا جانا تھا۔ بہت سے عراقی احباب تھے جو فون پر مسلسل اپنے عزیز و اقارب کی خبریں معلوم کرتے رہتے تھے۔ اس دوران جب ایک دن میں مرکز میں گئی تو مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی کہ بعض نوجوان لڑکے لڑکیاں مہدی منتظر کی خدمت میں یہ عریضہ لکھ رہے ہیں کہ یا صاحب زماں! اتحادی ٹوٹ پڑے ہیں۔ خدارا اب اپنے ظہور سے ہم کمزوروں کو طاقت بخشیے:

یـاعلی یامحمد اکفیانا فانکما کافیان و انصرانا فانکما نا صران یا مولانا
یـا صـاحب الزمان الغوث الغوث الغوث ادرکني ادرکني ادرکني الساعة
الساعة الساعة۔

میں نے پوچھا یہ کیا قصہ ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ وہ عریضہ ہے جو مہدیٔ منتظر کو ارسال کیا جائے گا۔ پتہ چلا کہ یہاں آئرلینڈ کے اسلامی مرکز میں ہی نہیں بلکہ بصرہ اور کربلا میں جہاں مومنین پر حالات سخت ہیں اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی جہاں اہل ایمان حالات کی اس سنگینی کو محسوس کر رہے ہیں، مہدی کے نام عریضہ ارسال کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ زعفران سے عریضہ لکھیئے، خوشبو میں اسے بسایئے اور پھر آٹے یا پاک مٹی میں لپیٹ کر دریا، نہر یا گہرے کنویں میں اسے صبح دم ڈال آیئے۔ ڈالتے ہوئے کہیئے :

یا حسین بن رَوْح! آپ پر سلامتی ہو آپ خدا کی بارگاہ میں زندہ ہیں۔ آپ ہمارا یہ رقعہ صاحبِ امر کی خدمت میں پہنچا دیجئے۔

عزیز دوستو! آپ نے نقش و تعویذ کی کتابوں میں اس سبز پرندے کی بابت پڑھا ہوگا جس کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ چالیس دنوں تک مسلسل روحانی عمل کے بعد صبح صادق سے پہلے دریا کے کنارے ظاہر ہوتا ہے۔ سیانوں نے سپیدیٔ سحر کا یہ وقت اس لیے متعین کیا ہے تا کہ طالبِ مضطرب کو ہر پرندے کے رنگ پر سبز رنگ کا دھوکہ ہو۔ نہ اصلی سبز پرندہ آج تک وقت مقررہ پر دریا کے کنارے آیا ہے اور نہ ہی امام زماں نے ان عریضوں کو آج تک قبولیت بخشی ہے۔ ہم جو حاملین وحی ہیں اور جس کے پاس وحی کی تجلّی اور اس کی ہدایت اور روشنی پائی جاتی ہے، کیا ہمارے لیے یہ مناسب نہیں کہ ان اساطیر اور اباطیل کا بے لاگ محاکمہ کریں، اور یہ دیکھیں کہ اس کی اصل واقعی کیا ہے، یہ سب کچھ کب سے چلا آتا ہے، اس کا موجد اور صانع کون ہے؟ میں زیادہ وقت نہیں لوں گی بلکہ چاہوں گی کہ اس موضوع پر اگر ممکن ہو سکے تو آج کی مجلس کے معزز مہمان ہمیں اپنے خیالات عالیہ سے مستفیض فرمائیں۔

بسمہ کی افتتاحی تقریر نے مجلس سے آہ و بکا کا رنگ کسی قدر زائل تو کر دیا البتہ مصیبت یہ ہوئی کہ اس دوران شیخ عائض اپنے مریدوں کے جلو میں کب رخصت ہو گئے اس کا کسی کو اندازہ نہ ہو سکا۔ شیخ دیدار مہدی کی طلب میں جس طرح برسوں سے جیتے آئے تھے اور جس ذہنی کیفیت کا شکار تھے اس میں کسی گفتگو، افہام و تفہیم یا re-thinking کی کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ اگر کوئی امکان تھا تو ہلوسہ کا اور وہ شب و روز اپنے چشمِ تصور

سے استنبول کی گلیوں میں ایک ایسے مہدی کو چلتے پھرتے دیکھ رہے تھے جو تاریخ کے آخری دور میں اذنِ ظہور کا منتظر ہو۔

میں نے سوچا کہ مہدی تو ہماری اساطیری طرزِ فکر کی محض ایک علامت ہے۔ اگر گفتگو صرف اسی موضوع تک محدود رہی تو نوجوان اہل علم کی اس مجلس سے کماحقہ استفادے کا امکان جاتا رہے گا۔ لیکن شیخ عائض کی دلگرفتہ گفتگو اور اس پر بسمہ کی برجستہ تنقید نے کچھ ایسی پیش بندی کر دی تھی کہ اس موضوع سے دامن بچانا بھی مشکل تھا۔ سوچا تقریر کا موقع نہیں اور نہ میں تقریر کا آدمی ہوں کیوں نہ اپنی توجہ چند اہم سوالات کی ترتیب وتشکیل تک محدود رکھی جائے سو پہلے تو میں نے اس بات کی وضاحت کی کہ خدا کے آخری پیغام کے حاملین کی حیثیت سے ہم تمام مسلمان خواہ مرد ہو یا عورت، ہماری حیثیت اپنی ذات میں ایک امکانی مہدی کی ہے۔ رسول اللہ کے غیاب میں اب آخری لمحہ تک اقوام عالم کی رشد وہدایت کا فریضہ ہم کمزور نفسوں کو انجام دینا ہے۔ ہمیں اس خام خیالی سے نکلنا ہوگا کہ اب اصلاح احوال کے لیے آسمان سے کوئی مسیح نازل ہوگا یا کسی دامنِ کوہ سے کوئی مہدی ظہور کرے گا۔ اصلاحِ احوال کے لیے ظہور مہدی کی تمنا اور آہ وزاریاں یا وفق ونقوش کی تیاریاں یا صبح دم سبز پرندے کی آمد ایسا کوئی بھی عمل کارگر نہ ہوگا۔ اب یہ کام ہم متبعین محمدؐ کو انجام دینا ہے

عزیز نوجوانو! جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مہدی آل رسولؐ میں سے ہوگا جس کے گرد سادات اور صلحائے امت جمع ہو جائیں گے وہ اس نکتہ کو کیونکر فراموش کیے دیتے ہیں کہ آج اس سرزمین پر رسولؐ اللہ کی کوئی آل موجود نہیں ہے۔ قرآن مجید ما كان محمد أبا أحد من رجالكم کا فلک شگاف اعلان کرتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس سے بڑی دھاندلی شاید اور کوئی نہ ہوئی ہو جب رسولؐ اللہ کے منقطع نسلی سلسلے کو، جس پر قرآن مجید کی صریح شہادت موجود ہو، نرینہ اولاد کی عدم موجودگی کے باوجود بیٹی کی اولاد سے یہ سلسلہ جاری سمجھا گیا ہو، اور پھر عجیب بات یہ ہے فاطمہؓ کے بعد پھر یہ سارے نسلی سلسلے حسن اور حسین اور ان کے اولاد ذکور سے جاری سمجھے جاتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی جلالت شخصی اپنی جگہ اور فاطمہؓ کے سعادت مند بیٹوں حسن وحسین کے مراتب ومناقب سے بھی انکار نہیں لیکن ان دونوں کو رسولؐ اللہ کی اولاد قرار دینا عقل اور وحی دونوں کا انکار ہے۔ سید بمعنی آل محمدؐ جب اس دنیا میں موجود ہی نہیں تو پھر ان کے خانوادے سے مہدی کا ظہور یا سادات کی قیادت میں اہل ایمان کی آخری معرکہ آرائی کی باتیں محض ایک بے بنیاد فسانہ ہے۔ مہدی کا اسطورہ ہو یا آل محمد کی تفضیل کا قصّہ، جس نے امت کو صدیوں سے ایک لایعنی انتظار میں مبتلا کر رکھا ہے، دراصل تیسری چوتھی صدی

ہجری کے سیاسی بحران کا پیدا کردہ ہے۔ طویل گفتگو کا موقع نہیں، آپ سب لوگ اہلِ علم وتحقیق ہیں۔ اگر اس عہد میں عباسی اور فاطمی خلافتوں کی باہمی رقابت اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ادب پر آپ کی نگاہ ہو تو آپ اس نکتہ کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ مسائل دین واعتقاد سے کہیں زیادہ سیاسی پروپیگنڈے کی رہین منت ہیں۔ مصیبت یہ ہوئی کہ تیسری اور چوتھی صدی میں مناقب اور پروپگینڈے کی روایتیں آلِ بویہ، فاطمی خلافت اور عباسی علماء کی کتابوں میں مدون ہوگئیں۔ متبادل خلافتیں تو ختم ہوگئیں لیکن بدقسمتی سے ان کے تیار کردہ مخالفانہ اور معاندانہ لٹریچر اور روایتوں کے مجموعے باقی رہ گئے۔ آنے والوں نے صرف یہ دیکھا کہ کلینی نے یوں لکھا ہے اور شیخ مفید نے یوں تذکرہ کیا ہے، صحاح ستہ کے مصنفین کا موقف یہ ہے یا طوسی اور ابن بابویہ اس خیال کے حامل ہیں۔ گزرتے وقتوں کے ساتھ تاریخ وآثار کے ان متحارب اور بسا اوقات گمراہ بیانات کو تقدیسی حیثیت حاصل ہوتی گئی۔ پھر اگلوں کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ اس معاندانہ سیاسی پروپیگنڈے سے ماوراء اسلام کے اس پیغام کو متشکل کرپاتے جو اہل ایمان کو کسی لایعنی انتظار میں وقت ضائع کرنے کے بجائے جہد وعمل پر آمادہ کرتا ہے۔ آج جب کوئی ہزار سال گزرنے کے بعد اساطیر کی دھند خاصی دبیز ہوگئی ہے، عام انسانوں کے لیے ان التباسات کو عبور کرنا کچھ آسان نہیں۔ لیکن میں ناامید نہیں ہوں۔ وحی ربّانی کا غیر محرف وثیقہ اپنی تمام تر آب وتاب کے ساتھ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ بس ضرورت اسے از سرِ نو کھولنے کی ہے۔ ذرا غور کیجیے جس مہدی کی قیادت میں آخری معرکہ کی صف بندی ہونی ہے اور جس مسیحؑ کی آمد ثانی ہمارے ملی تجدید واحیاء کا سبب بننے والی ہے اس کے ذکر سے، اتنی بڑی اور اہم خبر کے تذکرے سے، قرآن کے صفحات کیوں خالی ہیں؟ اس بات پر مت جائیے کہ فلاں صاحبِ کشف نے یہ کہا ہے یا فلاں راوی نے یوں نقل کیا ہے بلکہ یہ دیکھئے کہ خدا کی کتاب آپ سے کیا کہتی ہے؟

میری گفتگو گو کہ مختصر تھی لیکن اس مختصر سے وقفہ میں بھی پچھلی صف میں بیٹھے ہوئے بعض نوجوانوں کے ہاتھ مسلسل اٹھتے رہے۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں یا ان میں اپنے موقف کے خلاف کچھ سننے کی تاب نہ تھی۔ یہ پانچ چھے نوجوان تھے جنہوں نے اپنی گردنوں میں فلسطینی طرز کا سیاہ وسفید رومال لپیٹ رکھا تھا اور غالباً یہ شیخ عائض کے قافلے کے ساتھ موصل سے آئے تھے۔ ایک دبلا پتلا نوجوان، جس کی زلفیں شانوں تک آرہی تھیں، نے سوال کی اجازت چاہی۔ کہنے لگا کہ علامہ سعید نورسی نے آلِ محمدؐ کے جواز پر ایک حدیث بیان کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا اے علی! ہر نبی کی اپنی اولاد تھی البتہ میری اولاد تم میں سے ہوگی۔ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

نو جوان قدرے مشتعل اور جذباتی سا ہو رہا تھا۔ میں نے کہا میرے بھائی شیخ نورسی کا احترام اپنی جگہ لیکن میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ یہ روایت عقل اور وحی دونوں کے خلاف ہے۔ اس قسم کی روایتیں یا اشعار مثلاً اسمٰعیلیوں کا یہ نغمہ:

لی خمسة أطفيء بها مرالو باء الحاطمة

المصطفیٰ والمرتضیٰ وابناهما والفاطمة

جو حسن و حسین کو رسول ؐ اللہ اور حضرت علیؓ کی مشترکہ اولاد بتاتے ہیں، دراصل عقیدت اور غلو کے پردے میں آپ ؐ کی ذات اقدس پر افتراء اور بہتان باندھتے ہیں۔

آج بھی آلِ محمد ؐ کے تصور پر اس امت میں شدید اختلاف چلا آتا ہے۔ بعض لوگ پنجتن تک آل محمد کو محدود رکھتے ہیں، بعض ائمہ اثنا عشر، ائمہ سبعہ یا اسمٰعیلیوں کی طرح امام حاضر کو اس سلسلہ میں شامل سمجھتے ہیں۔ بعض کے نزدیک حسنی حسینی سادات کے تمام سلسلے آل محمد ؐ میں شامل ہمارے صلوٰۃ وسلام کی برکتوں سے مستفیض ہو رہے ہیں اور بعضوں کے نزدیک حدیث ِکسا کے حوالے سے آلِ عباس بھی اس اعزاز میں شریک ہیں جن کے بارے میں اگر روایتوں پر یقین کیجئے تو رسول اللہ نے خود یہ دعا فرمائی ہے کہ اللهم اغفر للعباس وولده مغفرة ظاهرة و باطنة لاتغادر ذنبا اور یہ کہ ان میں خلافت کو ہمیشہ باقی رکھ (واجعل الخلافة فيهـــــم)۔ اب تاریخ نے اس امر کو فیصل کر دیا ہے کہ آل عباس میں خلافت کے بقا کی نبوی دعا ایک تراشیدہ اسطورہ تھی۔ ورنہ ان کی خلافت اس روایت کے مطابق ظہورِ مسیح تک باقی رہنی چاہئے تھی۔ جس طرح آلِ عباس کے دعویٰ خلافت کی حقیقت ایک سیاسی پروپگنڈے سے زیادہ نہ تھی اسی طرح فاطمی اور عباسی خلفاء کا آل محمد ؐ میں سے ہونے کا دعویٰ یا إعطاء آل محمد حقهم یا الرضامن آل محمد کے نعرے سیاسی پروپگنڈے کی پیداوار تھے۔ آل کا یہ سارا کاروبار جس نے آگے چل کرامت کی حریتِ فکری سلب کر لی، دراصل تیسری چوتھی صدی کی سیاسی رقابت اور معرکہ آرائیوں کی پیداوار ہے۔ قرآن مجید کو کھلی آنکھوں سے پڑھیئے یہاں نہ صرف یہ کہ رسول ؐ اللہ کے نسلی سلسلہ کے انقطاع کا اعلان ہے بلکہ بار بار، باسالیب مختلف، یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ قرآن جس معاشرے کے قیام کا داعی ہے وہاں انسانوں کے تفوق وافتخار کی بنیاد صرف اور صرف تقویٰ ہے: إن أكرمكم عندالله أتقاكم۔ اہل ایمان سے مطالبہ ہے کہ وہ پوری طرح مسلم حنیف بنیں، ایسے ربّانی بنیں جن کا وجہ امتیاز صرف اور صرف صبغۃ اللہ ہو۔

فاضل مصنف گو کہ آپ کی بات دل کو لگتی ہے لیکن اتنی آسانی سے حلق سے اترنے والی نہیں۔ایک ترک خاتون نے جواب تک بڑے ضبط سے اس مناقشے کو سن رہی تھیں، نے قدرے دانشورانہ لب ولہجہ میں مداخلت کی۔ کہنے لگیں اگر آپ کی یہ باتیں مان لی جائیں تو اندیشہ ہے کہ مروجہ اسلام کی عمارت ہی زمین بوس ہو جائے۔میں تو جمعہ کی نماز میں جب بھی جاتی ہوں اہل بیت اطہار کی تفصیل میں خطیبِ جمعہ کو رطب اللسان پاتی ہوں۔ہمیں تو بچپن سے یہ بتایا گیا ہے کہ خلفائے راشدین چار ہیں اوران کے علاوہ مزید چھ لوگ عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں۔حضرت حمزہ شہدائے جنت کے سردار ہیں۔حسن اور حسین کو نوجوانانِ جنت کی سرداری حاصل ہے اور حضرت فاطمہ کو جنت کی عورتوں کی سیادت عطا کی گئی ہے۔اب اگر آپ آل کے تصور کو مسترد یا منہدم کر دیں گے تو ہمارا سارا خطبہ بے معنیٰ ہو جائے گا۔کیا آپ نہیں سمجھتے کہ آپ ایسا کر کے ایک بڑے فکری بحران کو دعوت دے رہے ہیں؟

ترک خاتون تو اپنا مختصر سوال کر کے بیٹھ گئیں لیکن ان کی گفتگو نے بڑے مسائل کھڑے کر دیے۔ جمعہ کے حنفی خطبے، خاص طور پر خطبۂ ثانیہ، جو ایک اعتبار سے اہل سنت والجماعت کے اعتقادات کا مستند بیان سمجھا جاتا ہے، کیا از سرِ نو اس کے محاکمہ کی ضرورت ہے؟ موضوع تفصیلی گفتگو کا طالب تھا جس کا یہاں موقع نہ تھا سو میں نے محض یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ جمعہ کے یہ مقفیٰ اور مسجّع خطبے جسے ابن نباتہ جیسے اہل فن نے چوتھی صدی ہجری میں مرتب کیا اور جس نے آگے چل کر غیر عرب مما لک میں مسجّع اور مقفیٰ تحریری خطبوں کی روایت قائم کی، مختلف ارتقائی ادوار سے گزرے ہیں۔حضرت معاویہ کے عہد تک بلکہ اموی سلطنت کے کسی دور میں بھی چار خلفاء کا تذکرہ خطبوں میں نہیں ہوتا تھا۔مؤرخین نے لکھا ہے کہ عہدِ معاویہ میں ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کے تذکرے پر بات ختم ہو جاتی تھی۔لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت علیؓ کی خلافت چونکہ پوری طرح قائم ہی نہ ہو پائی تھی اوران کے نام پر امت میں اتفاق قائم نہ ہوا تھا سوان کا نام متفقہ خلفاء کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔متوکل کے عہد میں پہلی بار ابن حنبل کی ایماء پر حضرت علیؓ کو چوتھے خلیفۂ راشد کی حیثیت سے خطبہ کا حصہ بنایا گیا۔رہا مناقب آل بیت کی روایتوں کا خطبہ میں شامل ہونے کا معاملہ تو یہ فاطمی اور عباسی رقابتوں کے نتیجہ میں ممکن ہو سکا۔دونوں ہی بنیادی طور پر شیعہ تحریکیں تھیں جو قرابت رسولؐ کے حوالے سے منصب خلافت کی طلبگار تھیں۔مناقب کی وہ روایتیں جن کا ہم سنّی خطبوں میں کثرت سے تذکرہ سنتے ہیں اور جو کثرت سماعت سے ہمارے لاشعور کا حصّہ بن گئی ہیں، قرآن کے بنیادی پیغام سے متصادم ہیں اور اسی لیے ان کی حیثیت رسول اللہ کی حدیثوں کی نہیں

بلکہ آپؐ پر کذب وافترا کی ہے۔

ہماری گفتگو خاصی سنجیدہ رخ اختیار کر چلی تھی اور وہ بھی ان حساس امور پر جہاں لوگ مدت سے بعض خیالات کو عقائد کی طرح سینے سے لگائے بیٹھے ہوں ان پر پے بہ پے سوالات قائم کرنا بعض لوگوں کے لیے ناقابل انگیز ہوسکتا تھا۔ بسمہ نے حاضرین کی توجہ اس امر پر دلائی کہ آج کی یہ مجلس مہدی کے مسئلہ کو فیصل کرنے کے لیے نہیں بلائی گئی ہے۔ اگر ہم ایک ہی مسئلہ اور اس کی تفصیلات میں الجھتے گئے تو اندیشہ ہے کہ ہمہ جہتی گفتگو کا امکان جاتا رہے اور ہم فاضل مہمان سے خاطر خواہ استفادہ نہ کرسکیں۔ لیکن ان تنبیہات کا کچھ زیادہ اثر نہ ہوا۔ ایک ترک نوجوان، جس کی عمر یہی کوئی بیس بائیس سال ہوگی، کہنے لگا کہ معاف کیجئے گا میں پہلے ہی سے ایک ذہنی خلجان میں مبتلا تھا اب آپ کی گفتگو سن کر تو ایسا لگتا ہے جیسے میرے قدموں تلے سے زمین ہی کھسک گئی ہو۔ یہاں استنبول میں ایک صاحب ہیں، جو خاص طور پر نوجوان لڑکے لڑکیوں میں خاصے مقبول ہیں، ان کے مریدوں کی ایک بڑی تعداد خاموش طور پر یہ سمجھتی ہے کہ شاید وہی مستقبل کے مہدی ہوں۔ بعض نوجوان خصوصاً متمول گھرانوں کی لڑکیاں جو ان کے حلقۂ مریداں میں شامل ہیں، اس احساس تلے جیتی ہیں کہ ہم آخری ساعت میں جی رہے ہیں جہاں کسی بھی لمحہ مہدی کا ظہور ہوسکتا ہے اور کیا عجب کہ ہمارے شیخ اور ہمارے ماسٹر جنہیں خدا نے ظہور مہدی کی بشارت پر مامور کیا ہے اور جو نسلی طور پر سید بھی ہیں، خود بہ نفس نفیس مستقبل کے مہدی ہوں۔ انہوں نے خود اس بات کا دعویٰ تو نہیں کیا ہے، لیکن وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ سعید نورسی، جنہیں ہمارے ہاں بڑے احترام سے دیکھا جاتا ہے، وہ مہدی نہیں تھے کہ خود نورسی کے مطابق وہ تین کام جو مہدی کو انجام دینا ہیں وہ ان کے ہاتھوں انجام نہیں پاسکے۔ نورسی کی پہلی شرط کہ مہدی مادیت پر فتح حاصل کرے گا، ان کے ہاتھوں پوری نہیں ہوئی بلکہ ڈارونزم کے قلعہ کو مسمار کرنے کا کام تو دراصل انھوں نے انجام دیا ہے۔ رہی عالم اسلام کی وحدت اور اس کے احیاء کا کام یا بالآخر شریعت کے نفاذ اور اس کے غلبہ و تفوق کا معاملہ تو یہ کام بھی ٹرکش اسلامی یونین کی دعوت کے ذریعہ وہی انجام دے رہے ہیں۔ میری مشکل یہ ہے کہ میں چند سال پہلے سلسلہ قادریہ میں بیعت ہوا ہوں، باپ دادا کی طرف سے مسلکاً حنفی ہوں، اب تک تو اسی مسئلہ میں پھنسا ہوا تھا کہ عبدالقادر جیلانی کی بیعت کے بعد جو مسلکاً حنبلی تھے، میرے لیے حنفی مسلک پر باقی رہنا جائز ہے یا نہیں؟ کیا میں اپنے روحانی شیخ کے علاوہ فقہی مسائل میں کسی دوسرے مسلک کو اختیار کرسکتا ہوں، خاص طور پر جب مہدی کی آمد کا زمانہ قریب ہو؟ کیا شیخ عبدالقادر جیلانی اور امام ابوحنیفہؒ کے خیموں سے

بیک وقت وابستہ رہنا شرعی طور پر جائز ہے اور پھران وابستگیوں کی موجودگی میں نئے مہدی سے بیعت کی حیثیت کیا ہوگی؟ کیاان کی آمد پر حنفی، قادری یاان جیسے دوسرے تقلیدی مراکز اپنا جواز کھودیں گے؟ اب چونکہ آپ نے سادات کے جواز پر ہی سوالیہ نشان لگا دیا ہے تو غور وفکر کا میرا پرانا ڈھانچہ ہی زمیں بوس ہوگیا۔لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اتنے سارے لوگ جونقشبندی قادری سلسلہ میں بیعت ہیں یا جوظہور مہدی کی روایتوں پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب بیک وقت غلط ہوسکتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ نوجوان اپنی نشست پر جا بیٹھا۔

ایک دوسرے طالب علم نے اپنی معلومات کی زنبیل سے یہ حدیث پیش کی کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ جس نے خروج مہدی کا انکار کیا اس نے ان تمام چیزوں کا انکار کیا جو مجھ پر نازل ہوئی ہیں۔غرض یہ کہ وہ کافر ہوگیا۔کیا کہتے ہیں آپ اس حدیث کے بارے میں؟ کیا انکار مہدی کے بعداب آپ کا شمار کافروں میں نہ ہوگا؟اس کا انداز قدرے جارحانہ تھا۔بعض منتظمین کی جبینیں شکن آلود ہوگئیں لیکن بسمہ نے حسب معمول اس سوال کو بھی ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ قبول کیا۔کہنے لگی سوالات بہت ہیں اور وقت کم۔کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس بارے میں اگر کسی اور کو بھی کچھ کہنا ہو تو وہ کہہ گزرے تاکہ فاضل مہمان کم ازکم اجمالاً ان تمام سوالوں کا جواب دے سکیں۔

جی ہاں مجھے مہدی کی طویل العمری کے بارے میں پوچھنا ہے۔کہا جاتا ہے کہ وہ بارہ سو سال سے کہیں روپوش ہیں۔تو کیا وہ ہماری طرح کھاتے پیتے اور زندہ آدمی کی طرح رہتے ہیں یا ان پر اصحاب کہف کی طرح نیند طاری کردی گئی ہے۔قرآن وحدیث کی روشنی میں بتائیں کہ حقیقت کیا ہے؟

یہ تو آپ ان سے پوچھئے جنہوں نے اپنے عقائد کے نہاں خانوں میں ایک خیالی مہدی کو گذشتہ بارہ سو سالوں سے بسا رکھا ہے اور جس کے انتظار میں ان کے شب وروز گذرتے اور جن کے ظہور کی دعا کو وہ دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔البتہ ایک بات میں ضرور کہنا چاہوں گا کہ مہدی کے مسئلہ پر اسلامی تاریخ میں کبھی بھی کوئی متفقہ رائے نہیں پائی گئی ہے۔علماء کے ایک قابل ذکر حلقہ نے ہمیشہ ان روایتوں کے بے اصل ہونے کا اعلان کیا ہے۔رہی یہ بات کہ مہدی کی روایتوں کے انکار سے ایمان جاتا رہتا ہے تو ایسا کہنا ایک بہت بڑی جسارت ہے۔اگر یہ اتنی ہی اہم بات ہوتی تو قرآن ہمیں مہدی کی بابت ضرور آگاہ کرتا۔

اب میں چند ایک جملے اس نوجوان کی بابت بھی کہہ دوں جو عبدالقادر جیلانی الحنبلی کے سلسلے سے بیعت کے بعد حنفی مسلک پر قائم رہنے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لیجئے کہ یہ بیعت

و بیعت کا سلسلہ، پیری مریدی کی زنجیریں، یہ وہ باتیں ہیں جس کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بعد کے لوگوں کی ایجاد واختراع ہیں۔

عزیز من! یہ آپ سے کس نے کہا کہ آپ سلسلہ قادریہ میں بیعت ہو جائیں یا ابوحنیفہؒ کی اقتداء کو لازمۂ ایمان جانیں؟ اور اس بیعت سے حاصل کیا ہونے کو ہے؟ عبدالقادر اور ابوحنیفہ تو ہماری اور آپ کی طرح عام انسان تھے۔ نہ ان حضرات کو نبوت ملی، نہ ہی انہیں صحابہ کی صحبت نصیب ہوئی اور نہ ہی ان سے بیعت اور ان کی اقتداء کا ہمیں حکم دیا گیا۔ اسلام تو ان جیسی تمام بیعتوں کے خاتمے کے لیے آیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بندے کا تعلق براہ راست خدا سے جوڑ دے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم تمام مسلمانوں نے رسولؐ اللہ سے بیعت کر رکھی ہے، ہم میں سے ہر شخص آخری وحی کی تکمیل کا شرف رکھتا ہے۔ اور جس کے ہاتھوں میں وحی کی تجلیاں تھما دی گئی ہوں اسے یہ کب زیب دیتا ہے کہ وہ قرآن مجید اور ذات نبیؐ کے علاوہ کسی اور کی طرف دیکھے۔ ہمارے لیے تو خدا کی کتاب اور رسولؐ کا اسوہ ہی کافی ہے۔ اگر ہم نے اسے تھام لیا تو ہمیں بہت سے فکری التباسات اور عملی خرافات سے نجات مل جائے گی۔

میری گفتگو تو ختم ہو گئی لیکن حاضرین کے چہروں پر اضطراب و جستجو کی رمق اسی طرح باقی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ سلسلہ جاری رہے لیکن مصطفیٰ اوغلو کی بار بار مداخلت کے سبب بسمہ کو مجلس کے اختتام کا اعلان کرنا پڑا۔ کہنے لگی حاضرین! جی تو چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ دراز ہو۔ میری سہیلیوں کے تو سارے سوالات دھرے کے دھرے رہ گئے لیکن اس بات سے خوشی ہوئی کہ اس فیض میں سب لوگ شریک ہوئے اور ہاں آخری انتباہ کے طور پر ایک بات کہتی چلوں کہ غور وفکر کے اس منہج کو جاری رکھیئے گا۔ سوالات قائم کیجئے اور اس کا جواب تلاش کیجئے اور اس تلاش و جستجو میں ہر صاحب علم سے مدد لیجئے۔ اگر ہم نے اس طریقے کو جاری رکھا تو یقین جانیے ہم صحیح سمتوں میں آگے بڑھیں گے۔ یہ تمام غیر قرآنی حوالے جو ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے تراشے ہیں اپنا اعتبار کھو دیں گے۔ صرف خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کا اسوہ باقی رہ جائے گا۔

میں خود ایک سنی حنفی گھرانے میں پیدا ہوئی۔ قرآنیات میری تحقیق کا موضوع تھا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے میں اس لازوال کتاب کو کھولتے ہوئے ڈرتی تھی کہ کہیں میرا دل و دماغ قرآن مجید میں وہ معانی و مفہوم نہ دیکھے جو اسلاف کے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ نہ ہو۔ سو میں کتاب کھولتی کم اور بند زیادہ کرتی رہی۔ پھر ایک دن جب میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہی تھی مجھے ایسا لگا جیسے خدا براہ راست مجھ سے مخاطب ہو۔ انما اشکوا بثی و حزنی

الی اللہ پر جب میں پہنچی تو رو پڑی، پھر ایسا لگا جیسے حضرت یعقوب کی طرح خدا نے میرے دل پر بھی سکنیت نازل کر دی ہو۔ میں ان دنوں بعض ذاتی نوعیت کے مسائل سے پریشان تھی۔ اب جو میں نے قرآن مجید کو اپنی داخلی کیفیت اور سربستگی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تو ایک نئے تجربے سے دوچار ہوئی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میں معرفت یا سلوک کے کسی منصب پر فائز تو نہ ہوئی اور نہ ہی مجھے شیخہ ہونے کا دعویٰ ہے لیکن ہاں پھر اس کے بعد مجھے کسی شیخ کا دامن تھامنے کی ضرورت نہ رہی۔ میں خود ہی اپنی شیخہ ہوں اور خود ہی اپنی مولوی۔ بلکہ مجھے اب اس بات کے اظہار میں بھی کوئی تامل نہیں کہ جب میں نے مزید غور کیا تو میرا حنفی ہونا ایک غیر ضروری حوالہ معلوم ہوا، مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بت ہو جس کی بے سوچے سمجھے پرستش میں بہت سے نادانوں کی طرح میں بھی مبتلا ہوں۔ میں اکثر سوچتی خدا نے مجھے قرآن کا علم دیا، اعلیٰ تعلیم کی توفیق دی پھر مجھے یہ کب زیب دیتا ہے کہ قرآن کی موجودگی میں ہدایت کے لیے اپنے ہی جیسے کسی انسان کی طرف دیکھوں۔ میں نے نہاں خانۂ دل میں فرقہ پرستی کے اس بت کو توڑ ڈالا۔

میں ایک سنی گھرانے میں پیدا ہوئی لیکن جب یہ پتہ چلا کہ رسول اللہ کی ذات شیعہ سنّی حوالے سے ماوراء تھی، آپؑ نہ شیعہ تھے نہ سنّی، یہ جھگڑے بعد کی پیداوار ہیں تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ باہمی نزاع کے جس عہد میں موجود ہی نہ تھی اور جس جھگڑے سے خدا نے مجھے بچائے رکھا اس میں اپنے آپ کو شامل کرنا یا کسی ایک فریق سے اپنی وابستگی بتانا کچھ مفید عمل نہیں ہو سکتا۔ جب خدا کو ہمارا شیعہ یا سنّی ہونا مطلوب نہیں بلکہ وہ ہمیں ربّانی بنانا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم صبغۃ اللہ میں رنگ جائیں، ہماری شناخت صرف اور صرف مسلمان کی ہو (ھو سماکم المسلمین) تو میں نے اپنی سنیت کو بھی خیر باد کہہ ڈالا۔ گو کہ یہ علمی اور فکری سفر میرے لیے کچھ آسان نہ تھا لیکن آج میں یہ سمجھتی ہوں کہ اس سفر کے بغیر ہم نہ ہی بنیان مرصوص میں تبدیل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی وحی کی لازوال تجلی ہماری مشایعت کر سکتی ہے۔ خدا ہمارے مہمان پر اپنی رحمتیں دراز کرے کہ انہوں نے ہم جیسے بہت سے لوگوں کے اندر طالب علمانہ اعتماد کی آبیاری کی ہے جس کا ایک نقصان یہ تو ہے کہ آدمی کبھی علامہ یا شیخ نہیں بنتا ہمیشہ طالب علم بنا رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ طلبِ علم کی لذت سے آشنا ہیں وہ یقیناً شیخ الاسلام بننے کے بجائے طالب علم بنے رہنے کو ترجیح دیں گے۔ آج کی مجلس گو کہ اختتام کو آ پہنچی ہے لیکن سوالات کے سلسلے کو جاری رہنا چاہئے۔

۹

قاتل نغمے

پروگرام کے اختتام پر گرم جوش مصافحوں اور جزاک اللہ، ماشاءاللہ کی صداؤں میں پھر ملنے کے وعدہ وعید کا سلسلہ ذرا کم ہوا تو میں نے بسمہ، نحلہ اور ان کی سہیلیوں کا شکریہ ادا کیا۔ باہر نکلے تو دیکھا کہ مصطفیٰ اوغلو اپنی گاڑی نکال لائے ہیں جہاں پہلے سے ہی پچھلی نشست پر دو صاحبان براجمان ہیں۔ پتہ چلا کہ ان میں ایک کا نام شیخ محمد کامل ہے جو منہج سلف سے وابستہ بوسنیا کی ایک مسجد میں امامت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یہاں تبلیغ وسیاحت کی خاطر کویت کے ایک مذہبی گروہ کے ساتھ آئے تھے اور آج شب واپسی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دوسرے صاحب گل محمد جرمنی کے شہر میونخ میں قالین کا کاروبار کرتے ہیں۔

مرکز مطالعۂ تاریخ کے مرغزاروں سے نکل کر اب ہم لوگ دوبارہ سلطان فاتح پل کی طرف چلے۔ یہیں بائیں جانب ذرا دور استنبول کے اناطولیائی حصّہ میں حیدر پاشا ریلوے اسٹیشن واقع ہے۔ مصطفیٰ اوغلو نے پل کی بلندی سے ایشیائی ساحل کی طرف اشارہ کیا۔ یہی وہ ریلوے اسٹیشن ہے جہاں سے ترک خلافت کے زمانے میں لوگ حجاز اور دمشق جایا کرتے تھے۔ سنا ہے کہ اب دوبارہ سعودی عرب میں مونوریل چلانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔

جی ہاں جن لوگوں نے حجاز ریلوے کی پٹریاں اکھاڑیں، انہیں بارودی دھماکوں سے تباہ کیا، انہیں شاید اس بات کا احساس ہو چلا ہے کہ آمد و رفت کی ان سہولتوں نے عالم اسلام کے ایک خطّے کو اور ایک مسلمان کو

دوسرے مسلمان سے کس طرح جوڑ رکھا تھا۔ گل محمد نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

ٹرین کے سفر کی بات ہی اور ہے۔ ٹرین میں صرف آپ سفر نہیں کرتے بلکہ آپ کے ساتھ ایک تہذیب سفر کرتی ہے، آگے بڑھتی ہے، بات سے بات نکلتی ہے، تبادلۂ خیال، بحث ومباحثہ رقابتیں اور محبتیں...

عشوہ وادا، غمزہ ورومانس سب کچھ بیک وقت متحرک ہوتا ہے۔ گل محمد نے شیخ کی بات کو درمیان سے ہی لپکتے ہوئے لقمہ دیا۔ اس کے برعکس پرائیوٹ کاروں میں سفر بے مزہ اور بے کیف سا لگتا ہے۔ بس ایک ہی فکر سوار کہ جلد سے جلد منزل پہ جا پہنچیں۔ جبکہ ٹرین کے اجتماعی سفر میں سفر خود منزل کا لطف دیتا ہے بلکہ بعض مراحل تو ایسے بھی آتے ہیں جب جی چاہتا ہے کہ بس یہی آخری منزل ہو اور تاریخ اسی لمحہ ٹھہر جائے۔ گل محمد نے اپنی شاعرانہ گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

پتہ چلا کہ وہ پیشے سے تو قالینوں کے تاجر ہیں لیکن ساتھ ہی شعروادب کا اعلیٰ ذوق بھی رکھتے ہیں اور اپنی غزلوں میں محبوب کے لیے دیدہ ودل کے قالین بچھائے رکھنے میں انہیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ شیخ محمد کامل پہلے تو کچھ لیے دیے رہے لیکن جلد ہی گل محمد کی گل افشانیوں کا شکار ہوکر ہٹو بچو کے تکلف سے نکل آئے۔ طربوش کو دونوں ہاتھوں سے حرکت دی اور پھر اسے سر سے اتار کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اب جو طربوش ہٹا تو اس کے اندر سے عام گوشت پوست کا انسان برآمد ہوا۔ گویا بے تکلفی کا رہا سہا حجاب بھی جاتا رہا۔

شیخ سے ملئے، شیخ کامل بڑے روشن خیال عالم ہیں۔ پہلے نقشبندی تھے پھر قادری ہوئے ادھر چند سالوں سے منہج سلف کے داعی بن گئے ہیں۔ مصطفیٰ اوغلو نے مجھ سے شیخ کا مزید تعارف کراتے ہوئے کہا۔

شیخ کامل؟ دنیا کو آج ایک شیخ کامل کی تلاش ہے میں نے شیخ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

جی ہاں یہ بھی شیخ کامل ہیں۔ پانی پر چلنے والے شیخ لیکن جب سے انہیں وہابیوں کی صحبت ملی ہے شاید اب صرف باتھ روم میں ہی پانی پر چلا کرتے ہیں۔ شیخ کامل نے ان ظریفانہ جملوں کے جواب میں مسکراہٹیں بکھیر دیں۔ کہنے لگے میں ایک صوفی خانوادے میں پیدا ہوا لیکن دل میں ایک چبھن سی تھی جو کسی مراقبۂ نیم شبی اور اوراد ووظائف سے جاتی نہ تھی سو سلوک کے مختلف سلسلوں اور طریقوں پر گامزن رہا یہاں تک کہ اللہ نے منہج سلف صالح تک میری رہنمائی کی۔ میں آپ کے جلسے میں درمیان میں آیا تھا مجھے وہاں بیٹھنا بہت اچھا لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ نوجوان ذہنوں میں متضاد روایتوں اور طرح طرح کی بے اصل باتوں نے بڑا کنفیوژن پیدا کر رکھا ہے۔ اب اسی مہدی کے قضیہ کو لیجئے ہم اہل سنت کوئی واضح بات کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ہم نہ تو اس کا

انکار کرتے ہیں اور نہ ہی دل وجان سے مہدی کی آمد کے منتظر ہیں۔ شیعہ اگر اس عقیدے کو مانتے ہیں تو وہ شب وروز اسی احساس میں جیتے ہیں کہ نہ جانے کب کس لمحہ مہدی کا ظہور ہو جائے۔ ظہورِ مہدی کی دعائیں ان کے شب وروز کا حصّہ ہیں۔

لیکن اہل سنت اب بچے ہی کہاں۔ مصطفیٰ اوغلو نے مداخلت کی۔ امویوں کے خاتمے کے بعد عباسی اور فاطمی جو دوخلافتیں قائم ہوئیں وہ دونوں قرابت رسولؐ کے حوالے سے برسر اقتدار آنے والی شیعہ تحریکیں تھیں۔ عباسیوں نے جمہور مسلمانوں کو اپنے ساتھ لینے کے لیے سبیل المومنین کا سا انداز تو ضرور اختیار کیا لیکن اہل بیت کے حوالے کے بغیر ان کا کام بھی نہ نکلتا تھا۔ مہدی کا اسطورہ ہو یا اہل بیت کے تفوق کی باتیں یا سادات کے خصوصی عزوشرف کا معاملہ، یہ سب دعوت عباسی، دعوت فاطمی اور اسمٰعیلی واثنا عشری شیعوں کے سیاسی پروپگینڈے کی نظری اساس تھی۔ اس غبارے میں سبھی برسر اقتدار گروہ حسب توفیق وضرورت ہوا بھرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل تشیع کی سیاسی فکر نے ہمیشہ ہمیش کے لیے جمہور مسلمانوں میں اپنی جگہ بنالی۔ اب سنی مسلمانوں کے لیے مصیبت یہ ہے کہ عملاً تو وہ اہل تشیع کی راہ پر گامزن ہیں البتہ انہیں زعم اہل سنت والجماعت ہونے کا ہے۔ اس صورت حال نے انہیں مخمصے میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ تفضیلِ علیؓ کے انکاری بھی نہیں اور معاویہ کو امیر کہتے ہوئے بھی ان کی زبانیں نہیں تھکتیں۔ وہ شیعوں سے مہدی کا عقیدہ شیئر کرتے ہیں لیکن قدرے بے دلی کے ساتھ۔

میں نے سوچا شیخ کامل طرح طرح کے روحانی تجربوں سے گزرے ہیں سلوک کی مختلف منزلیں سر کی ہیں کیوں نہ ان سے پچھلے تجربوں کی بابت پوچھا جائے۔

سلفی فکر سے وابستگی کے بعد اب ان مراقبوں اوراذکار وسماع کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟ میں نے ان سے جاننا چاہا۔

گمرہی ہے گمرہی، سراب ہے سراب جس کے پیچھے یہ بے وقوف بھاگتے ہیں۔ اہل صفا کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ان کے لہجہ کا تشدد کسی قدر نمایاں ہو گیا۔

میں نے پوچھا: آپ تو ان مراحل سے بنفسِ نفیس گزرے ہوں گے، ذکر کی مجلسوں میں حق وہو کی آواز نکالی ہوگی۔ کیا اس تجربے میں سالک کو واقعی یہ لگتا ہے کہ وہ کسی روحانی تجربے سے گزر رہا ہے؟

جی ہاں! میں نے کہانا! وہ ایک سراب ہے جس پر حقیقت کا گماں ہوتا ہے۔ آواز میں بڑی قوت ہے اور

خاموشی اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ جو لوگ آواز کی دھار سے زخمی نہیں ہوتے وہ خاموشی کے آگے سپر ڈال دیتے ہیں۔ ایسا اس لیے کہ بہت سے لوگ خاموشی کی بے پناہ قوت سے واقف ہی نہیں ہوتے۔ انہیں اس کا تجربہ نہیں ہوتا۔ مراقبے میں اچانک انہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ جس مصنوعی شور وغل کے سہارے اب تک جیا کرتے تھے اس نے اچانک ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ ایک ہلا مارنے والی تنہائی میں انہیں ایسا لگتا ہے جیسے ان کا وجود تحلیل ہوتا جا رہا ہو اور وہ وجود کے نقطۂ صفر کی طرف سفر کر رہے ہوں۔ بعض لوگ اس قسم کے تجربے سے مشاہدۂ حق کی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

میں جن دنوں نائجیریا میں تھا اہل حق کی ایک مجلس میں ذکر کے لیے جایا کرتا تھا۔ واللہ کیا بتاؤں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر جھٹکے سے ہُو ہُو کی مسلسل آواز نکالتے رہنے سے دل و دماغ معمولاتِ شور وشغب سے دور جا پڑتے تھے۔ یہ بیک وقت ایک جسمانی ورزش بھی تھی جس میں ہُو کی آواز کے ساتھ بہت سی ہوا مسلسل پھیپھڑے سے نکلنے کے سبب دماغ پر ایک خواب آسا کیفیت طاری ہوتی۔ ہم لوگ سمجھتے شاید مشاہدۂ حق کی کیفیت کا ابتدائی ظہور ہو۔

تو کیا کبھی آپ کو دوضربی اور سہ ضربی نفی اثبات کے ذکر کا بھی موقع ملا؟

جی ہاں نقشبندیوں کے بعض گروہ میں یہ ذکر خاصا مقبول ہے۔ یہ بھی دراصل ایک جسمانی ورزش ہے۔ نفی اور اثبات کے ذکر میں بھی پھیپھڑے کو ہوا سے خالی کرنے اور پھر اس کو مکمل سانس سے بھرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ شیخ نے اپنا بیان جاری رکھا۔

مجھے یاد آیا کہ مشاہدۂ حق کی ان ہی کیفیات کا ذکر ایک بار ایک روسی ڈپلومیٹ نکولائی نے بھی مجھ سے کیا تھا۔ نکولائی نے سوویت یونین کی پالیسیوں سے دل برداشتہ ہو کر استعفیٰ دے دیا تھا جب میری اس سے ملاقات ہوئی اس وقت وہ ہالینڈ میں قیام امن کی ایک تنظیم کا روح رواں تھا۔ کہنے لگا کہ جن دنوں میں نیویارک میں اپنی ملازمت پر متعین تھا، روز علی الصباح سولہ کلومیٹر جاگنگ کے لیے جایا کرتا تھا۔ بارہ کلومیٹر دوڑنے کے بعد میرا وجود اس قدر چارج ہو جاتا کہ میں خود کو کائنات کے ذرے ذرے سے connected محسوس کرتا، ایسا لگتا جیسے مجھ پر وحی آنے والی ہو۔ بعد میں پتہ لگا کہ یہ سب کچھ دراصل مسلسل دوڑتے رہنے سے آکسیجن کی کمی کے سبب ہے۔ اب شیخ نے اپنے ذاتی تجربے سے اس خیال کی مزید توثیق کر دی۔

پچھلے دنوں نیوروسائنس میں جو تحقیقات ہوئی ہیں اس نے بھی تصوف کے غبارے سے ہوا نکال دی

ہے۔ اب ملائے اعلیٰ کی سیر کے لئے نفی و اثبات کے ورزش کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی رگِ کپاس پکڑ کر مرغ کی طرح اللہ ہُو کے بانگ دینے کی ضرورت ہے، بس ہیروئن کا ایک انجکشن لیجئے اور چشمِ باطن سے ارض وسماوات کی سیر کر آئیے۔ دماغ میں سیروٹونین کی سطح اگر بلند رہے تو سرشاریٔ اعتماد کی اس کیفیت میں سلطاني ماأعظم شأ ني يامافی جبتي إلا الله یا براہِ راست انا الحق کا نعرہ بلند کیجئے اور اگر سطح نیچے چلی گئی ہو تو خود کو حقیر فقیر سراپا تقصیر ملامتی فرقہ کا ایک رکن جانیئے۔ مسکن ادویات نے ان مشکل روحانی تجربات کو، جن میں سالک کو ایک عمر گزارنی پڑتی تھی، اب آپ کی دہلیز پر لاکر رکھ دیا ہے۔ میں ابھی ان ہی خیالات میں گم تھا کہ مصطفیٰ اوغلو کی کار میں نغمے کی سحر انگیز لے کچھ اس طرح بلند ہوئی:

يامن يراني في علاه و لاأراه　　يامن يجير المستجيرإذا دعاه

حمزہ شکور......ارے یہ تو حمزہ شکور کی آواز ہے۔ ایسا لگا جیسے شیخ کامل کو اپنے پرانے دن یاد آگئے ہوں۔
جی ہاں! حمزہ شکور کو سنیئے اور سر دھنیے۔ واللہ حمزہ شکور کا جواب نہیں مصطفیٰ اوغلو نے تحسیناً کہا۔

يامن يجود علي العباد بفضله　　جل القدير و جل ماصنعت يداه

يا من له الأ لاء فی أكوانه　　و إذا سألنا العفو لم نسأل سواه

هبني رضاك فأنت أكرم واهب　　واغفرلعبدك ياعظيما فی علاه

میں نے پہلی بار حمزہ شکور کو فض (مراقش) کے ایک بڑے مجمعے میں سنا تھا۔ شیخ مغنّیوں کا پورا طائفہ لے کر آئے تھے۔ گلوکاروں کے مخصوص مشرقی لباس میں ایسا لگتا تھا کہ خوش شکل نوجوان لڑکے لڑکیوں کا طائفہ تمجید و تحمید کے لیے آسمانوں سے اتر آیا ہو۔ یہاں تک تو ٹھیک لیکن جب طبلے کی تھاپ پر یارسول اللہ مدد کی صدا بلند ہوتی یا، شیئاً للہ یارسول اللہ کا نعرہ لگتا تو میں بار بار سوچتا کہ موسیقی کے سحر میں ہم راسخ العقیدگی کو کتنی آسانی سے خیر باد کہہ رہے ہیں۔

شیخ نے اپنے پرانے ایام کی یاد تازہ کرتے ہوئے کہا: نغمے کی زبان بڑی باجبروت ہوتی ہے، بسا اوقات یہ عقل وخرد کو بہالے جاتی ہے۔ آج بھی جب یہ نغمے میرے کانوں سے ٹکراتے ہیں تو پرمسرت لمحات کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ کیف وجذب میں ڈوبے ہوئے لمحات۔

بات یہ ہے کہ جب مشرق کا مغنی اپنی غلوئے فکری میں مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے تو یہ سب کچھ ایک پیچیدہ داخلی عمل کا حصہّ ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے نغمے کی زبان انسان کے وجود میں سرایت کر گئی ہو۔ اس

کا رُواں رُواں موسیقی کی لَے پر بربط بن گیا ہو۔ مذہبی موسیقی کا یہ داخلی تجربہ جب کبھی اہلِ مغرب کے مشاہدے میں آتا ہے تو وہ چیخ پڑتے ہیں۔ واللہ یہ ہوئی بات۔ ان میں سے بعضے ایمان بھی لے آتے ہیں گو کہ ان کا یہ ایمان اسلام پر کم اور مشرق کی مسلم ثقافت پر زیادہ ہوتا ہے۔

بھئی آواز میں بڑا دَم ہے یہ چاہے تو صاعقہ بن جائے اور چاہے تو مضراب داؤد پر مسرت وسکینت کی لَے بن کر چھا جائے۔ شیخ نے مزید وضاحت کی۔

اور کُن بھی تو ایک آواز ہی تھی جس کے بارے میں صوفیاء کہتے ہیں کہ اگر آج بھی کلمۂ کُن کو اپنی تمام ابعاد کے ساتھ برتا جا سکے تو ہر لمحہ ایک نئی کائنات وجود میں آسکتی ہے۔ میں نے شیخ کی رائے جاننا چاہی۔

میں نہیں سمجھتا کہ واقعی ایسا ہے، میرے خیال میں صوفیاء سخت مغالطے کا شکار ہیں۔ وہ اپنے ہنگامۂ ہاؤ ہو کی آواز سے متاثر ہو کر بلکہ اس کے سحر میں خود ہی مبتلا ہو جانے کے سبب یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ کُن بھی کوئی دو ضربی، سہ ضربی ذکر ہو جو سامع پر ایک کیفیت مرتب کرتا ہو یا اس کی دماغی رَو کو مسحور یا کنٹرول کرنے پر قادر ہو۔ حالانکہ دونوں میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ کُن حقیقی تخلیق کا استعارہ ہے جبکہ ہمارے نطق کی آوازیں ایک مصنوعی حقیقت تخلیق کرتی ہیں۔ وہ ہمیں ایک ایسی خواب آسا دنیا میں لے جاتی ہیں جس پر ہمیں چند لمحے کے لیے حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ شیخ نے اس نکتہ کی مزید وضاحت کی۔

تو کیا جو لوگ نغموں سے شغل رکھتے ہیں یا مضراب و بربط کے شائق ہیں یا اعلیٰ شاعری کو پسند کرتے ہیں، وہ سب کے سب الفاظ کے سحر میں گرفتار ہیں؟

جی ہاں بڑی حد تک ایسا ہی ہے۔

میرا بھی یہی خیال ہے۔ مصطفیٰ اوغلو نے گاڑی چلاتے ہوئے کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اب مجھ ہی کو لیجئے میں اہلِ تصوف کے فکری سراب سے خوب واقف ہوں لیکن میرے پاس مختلف صوفی نغموں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ عربی زبان گو کہ مجھے کم آتی ہے لیکن جب میں حمزہ شکور اور شیخ حبّوش جیسے لوگوں کو سنتا ہوں تو دل کے مضراب بج اٹھتے ہیں۔ یہ الفاظ بڑے قاتل ہوتے ہیں آوازوں کے سحر اور اس کے جال میں اگر کوئی ایک بار پھنس جائے تو اس سے رہائی کچھ آسان نہیں ہوتی۔

شیخ کامل تو مدتوں آوازوں کے سحر گزیدہ رہے ہیں۔ مصطفیٰ اوغلو اپنے تمام دانشورانہ تحلیل و تجزیے کے باوجود آج بھی صدا گزیدہ ہیں۔ انہوں نے نغمے کی زبان سے ہیروئن کا انجکشن لیا اور تائب بھی ہوئے تو اس طرح کہ

پرانی لذتوں کے ذکر سے اب بھی مشام جاں معطر ہو جاتے ہیں، روح میں بالیدگی آجاتی ہے۔ بقول غالب:

پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

بلکہ اگر بنظر غائر دیکھیں تو آوازوں کے سحر کا یہ سلسلہ پوری امت پر محیط ہے۔ اگر صوفیاء کی محفلوں کی رونق ہاؤ ہُو کی طربناک آوازوں کے سہارے قائم ہے تو اہلِ تشیع کے ہاں جذبات کی گرم بازاری کا سارا کاروبار دراصل منقبتِ حسینؓ، نوحوں اور مرثیوں کے دم سے چل رہا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اگر مذہبی شاعری اور مختلف قسم کی devotional music نہ ہو تو مختلف فرقوں کا روحانی کاروبار اچانک ٹھپ پڑ جائے۔ ذرا غور کیجئے! عرس کے موقع پر اگر قوالی کا اہتمام نہ ہو، وجد و حال کے ماحول میں دھمال ڈالنے کا سلسلہ بند ہو جائے یا عاشورہ اور چہلم کے موقع پر نوحہ و منقبت اور ذکر کی مجلسوں میں مقرر اور شاعر الفاظ کے جادو نہ جگائیں تو فکری التباسات کے یہ مختلف خیمے جو شعر و نغمہ کی بدولت قائم ہیں اپنی جاذبیت کھو دیں۔

الفاظ میں بڑی قوت ہے حتیٰ کہ بے معنی الفاظ بھی کم قتیل نہیں ہوتے۔ صائقہ ہے صائقہ، شیخ نے اپنی متفکرانہ خاموشی توڑی۔ مشرق کی منقبت اور قوالی ہو یا مغرب میں روشنی کے اسٹیج پر وحشیانہ اور دلخراش ہنگامۂ ہاؤ ہُو، یہ سب آوازوں کا طلسم ہی تو ہے جس نے انسانوں کو گرفتار رکھا ہے۔ کہیں یہ سب کچھ محض entertainment کے نام پر ہے اور کہیں مذہب کے حوالے سے اسے داخلی کیفیت کا حصہّ بنا دیا گیا ہے۔

گل محمد جواب تک کبھی بے اعتنائی اور کبھی شوق و تجسس کے ساتھ ہماری گفتگو سنتے اور کبھی نیم بند آنکھوں سے، ایسا لگتا جیسے چشم تصور میں ریل کے کسی رومانوی سفر پر روانہ ہو جاتے ہوں، اب انہوں مداخلت کے انداز میں پہلو بدلا۔ کہنے لگے صوت و ساز کے علاوہ ایک اور چیز ہے جو صوفی مجلسوں، سماع کی محفلوں اور نوحہ و عزا کے جلسوں میں ہمارے حواس معطل کیے دیتی ہے اور وہ ہے رنگ و آہنگ کے امتزاج سے ایک خواب آسا یا نیم کرشماتی ماحول۔ جرمنی میں اکثر مولوی فرقے کے صوفیاء اور مغنیوں کا گروہ آتا رہتا ہے۔ بلکہ اب تو یہ لوگ پیرس، لندن بلکہ امریکہ تک جاتے ہیں جہاں ان کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ رومی کی شاعری پر یوروپ اور امریکہ میں مسلسل کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ مجھے میونخ کے ایک ناشر نے بتایا کہ یہ کتابیں ہزار، دس ہزار نہیں چھپتیں بلکہ امریکہ میں شائع ہونے والی بعض مقبول عام کتابوں کی تعداد تو ڈھائی لاکھ تک جا پہنچی ہے۔ رومی کی اس مقبولیت کا ایک سبب شاید یہ ہے کہ جب رنگ و نور کے ہالے میں سماع زن اپنا نغمہ بکھیرتا ہے اسی اثناء نیم تاریک گوشوں سے محفل پر سحاب کی بارش ہوتی ہے اور پھر رقاص کے چھتری نما اسکرٹ محفل پر ایک

وجد کی سی کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ جو لوگ شعر و نغمے کی زبان سے واقف نہیں ہوتے ان کے لیے بھی یہ طلسماتی منظر کچھ کم قتیل نہیں ہوتا۔

تو کیا یہ سب کچھ جسے ہم مذہبی میوزک یا رقص وسماع سمجھے بیٹھے ہیں ان کی حیثیت ایک طرح کے فنونِ لطیفہ کی ہے۔ میں نے گل محمد سے وضاحت چاہی۔

جی ہاں بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ ہم مذہب کے نام پر دراصل ایک طرح کے فنونِ لطیفہ کے سحر میں گرفتار ہیں۔

گفتگو کا سلسلہ شاید ابھی کچھ اور دیر تک جاری رہتا لیکن آگے راستہ مسدود تھا۔ ہماری کار رینگتے رینگتے اب تقریباً حالتِ سکون میں آ گئی تھی۔ ہمارے بائیں طرف آبنائے باسفورس کی لہروں کے مچلنے اور بل کھانے کا منظر تھا اور دوسری جانب ہوٹل کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ خیال آیا کہ اس ٹریفک جام میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کیوں نہ پیدل سڑک عبور کرلوں۔ بالائی سڑک سے ہوٹل کا راستہ چند ثانیے کا ہے۔ سو میں نے مہمانوں کو یہیں الوداع کہا اور اپنے میزبان مصطفیٰ اوغلو سے اجازت چاہی۔

استنبول میں کسی جام میں پھنسنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا لیکن مجھے اس بات پر قطعی حیرانی نہ ہوئی کہ دوڑتے بھاگتے شہروں میں جہاں زندگی بظاہر برق رفتاری سے دوڑتی ہے، ٹریفک جام میں وقت کا زیاں ایک عام سی بات ہے۔ ہاں جن شہروں میں زندگی کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ نئے متبادل راستے بنتے رہے ہیں یا فلائی اوور کی تعمیر ہوتی رہی ہے وہاں اژدہام کی یہ شدت یا زندگی کے جام کا احساس کچھ کم کم ہوتا ہے۔ عام شاہراہوں کی طرح تہذیب کی شاہراہ پر بھی اگر نئے راستے تعمیر نہ ہوں تو انسانی زندگی ایک طرح کے انجماد کا شکار ہو جاتی ہے اور کچھ یہی حال فکر ونظر کی دنیا کا ہے جہاں مسلسل نئی شاہراہوں اور نئے فلائی اوور کی تعمیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ترکوں کی پانچ سو سالہ قیادت میں، اگر دانشورانہ تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے، تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ نئے فکری راستوں یا متبادل شاہراہوں کی تعمیر کا کام بہت کم ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ہماری فکری شاہراہیں نت نئے امکانات کے بجائے ہلا مارنے والے انجماد کا منظر پیش کرنے لگیں۔ جب انسانی معاشرہ ایسی صورت حال سے دوچار ہو جائے تو اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی زندگی کی بنیادیں ہلنے لگتی ہیں۔ پھر ان ہی راستوں پر چلتے رہنے پر مزید اصرار ہمیں اس التباس فکری میں تو ضرور مبتلا کرتا ہے کہ ہم مائل بہ منزل ہیں، ہماری گاڑی کا قبلہ بھی درست ہے لیکن ہم جام میں پھنسے کہیں پہنچتے نہیں۔

۱۰

یارب الہا

صبح غیر معمولی طور پر آنکھ کچھ پہلے ہی کھل گئی۔ خیال تھا کہ فجر کی نماز جامع سلطان احمد میں پڑھوں گا لیکن ابھی تو صبح کے دو ہی بجے تھے۔ کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھا۔ سمندر کے کنارے روشنیوں کی قطاریں کچھ مدھم پڑتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ صبح ہونے میں گوکہ خاصا وقت تھا لیکن کچھ تو مصنوعی روشنی کے اثرات اور کچھ ساحل سمندر ہونے کے سبب جھٹپٹے کا احساس ہوتا تھا۔ ماحول پر ایک طرح کی پراسراریت چھائی تھی۔ فطرت اپنی تمام سرّیت کے ساتھ

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

کے سے عشوہ وادا کا اظہار کر رہی تھی۔ خیال ہوا کیوں نہ اس دلفریب منظر سے بھی لطف اندوز ہوا جائے۔ جیسے تیسے چائے کی پیالی ختم کی، وہیں فرش پر دو رکعت نماز داغی کہ سن رکھا تھا:

بٹتی ہے رات ہی کو خواجہ تری گلی میں

اور ساحل سمندر کی سیر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ استنبول بڑا شہر ہے۔ خیال تھا کہ لیل ونہار کی گردش اس کی سرگرمیوں پر کم ہی اثر انداز ہوتی ہوگی کہ مغرب کے بعض بڑے شہر اس بات کے اعلان میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ the city never sleeps لیکن یہاں استنبول کے اس حصے میں ٹریفک نام کو نہ تھی۔ ہاں سمندر کے کنارے واک ویز پر گاہے بگاہے کوئی شب گزیدہ اور کوئی سحر خیز نظر آ جاتا تھا۔ پتہ نہیں یہ لوگ کسی سبز پرندے کی تلاش

میں آئے تھے یا سمندر کی مہیب پراسراریت انہیں یہاں کھینچ لائی تھی یا ان گہری باتوں سے ماوراء یہ صرف صبح کی چہل قدمی کے لیے آنے والے لوگ تھے۔ واقعہ کچھ بھی ہوا ایک بات کا شدت سے احساس ہوتا تھا کہ سبز پرندے کی بشارت کا سب سے مناسب وقت یہی ہے کہ اس جھٹپٹے میں سالک کو مختلف رنگوں پر سبز رنگ کا گمان ہوسکتا تھا۔

اورہان پاموک نے لکھا ہے کہ استنبول کے در و دیوار اور اس کے ماحول پر ایک طرح کا حزن سایہ کیے ہوئے ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سب کچھ محزون ہو۔ صبح کے اس جھٹپٹے میں جہاں ایک طرف آبنائے باسفورس کے اس پار براعظم ایشیا اپنی تمام تر تاریخی عظمت بلکہ خبطِ عظمت کے ساتھ اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے تو دوسری طرف قصر خلافت سے ملحقہ بازنطین کا تاریخی چرچ اور وہیں اس کے مدمقابل جامع سلطان احمد ہمیں تاریخ کے مختلف ادوار اور اس کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتا ہے اور اس پورے منظر نامے میں جہاں تاریخ کچھ خوابیدہ سی لگتی ہے اور جسے دانستاً پچھلی پون صدی سے تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کی گئی ہے ہر لمحہ اس بات کا کھٹکا لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کب کس موڑ پر اس خوابیدہ شہر کو جگانے کے لیے کوئی اذان دے ڈالے۔

تو کیا وہ آنے والے ہیں؟

کم از کم جھٹپٹے کے اس پراسرار ماحول میں، جہاں چند ایک افراد کے علاوہ پورا شہر خاموشی کی چادر تانے سوتا ہے، اگر اپنی ہئیت کذائی اور نامناسب وقت کے سبب ان اکا دکا افراد پر رجال الغیب کا گمان ہو اور یہ دھڑکا لگا رہے کہ نہ جانے کب کس لمحہ آنے والا آجائے تو یہ کچھ عجب نہیں۔ یہ تو نیچے سطح سمندر سے قصر خلافت کا ایک تناظر تھا۔ میں نے جب بھی قصر خلافت کی بلندی سے آبنائے باسفورس کی نیلگوں لہروں اور اس سے پرے ایشیائی حصے کو دیکھا ہے، ہر دفعہ مجھے پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ یہ بات محسوس ہوئی کہ استنبول پر حزن کا نہیں، بلکہ ان پیروں اور فقیروں کا سایہ ہے جن کے آثار مساجد سے لے کر پارکوں، سیر گاہوں، بازاروں اور سیاحت گاہوں تک پھیلے ہوئے ہیں ہے۔ قبروں کی تزئین و آرائش، اس کے تحفظ، مقبروں کی آراستگی اور ان کا انتظام و انصرام جس بڑے پیمانے پر اس شہر میں نظر آتا ہے اور بعد از مرگ بھی جس طرح سلاطین سے لے کر اولیاء تک اپنی اپنی کلاہوں، مراتب کی درجہ بندیوں کے ساتھ زائرین کے استقبال کے لیے اپنی باہیں وا کیے ہوئے ہیں اس نے شہر اور اس کے اہالیان کا ذہنی رشتہ زندگی کے بجائے ویران قبروں اور بے کیف خرابوں سے منسلک کر رکھا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مومن کے لیے موت سے غفلت سم قاتل ہے لیکن

موت کی یاد ایک چیز ہے اور اس کا جشن منانا بالکل ہی دوسری چیز۔ اور یہ جشن جب جشن شادی کا رخ اختیار کر لے اور اسے عرس کہا جانے لگے تو افشائے حقیقت کے لیے صرف ان اصطلاحوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا ان کی وجہ تسمیہ معلوم کرنا ہی اپنے اندر عبرت کا بڑا سامان رکھتا ہے۔

جوں جوں صبح قریب آتی جاتی تھی، فطرت کے حسن بلکہ یہ کہہ لیجئے کہ اس کی سحر انگیزی میں غیر معمولی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ واک وے (walk-way) کی بنچ پر بیٹھ کر دور افق کو دیکھئے تو ایسا لگتا ہے کہ ہر لمحہ سریت کا ایک ورق الٹتا ہو اور حیرت کی ایک نئی دنیا ہویدا ہو جاتی ہو۔ اب بیٹھنے کی تاب نہ تھی، ہر لمحہ ایک نئی تجلی کا سماں تھا۔ ایسا لگتا تھا میرے وجود کا رُواں رُواں اس تجلی کی زد پر ہو، اس کے سہارنے کی تاب بھی نہ ہو اور اس سے یک گونہ دامن چھڑانا بھی ممکن نہ ہو۔

سمندر سے میرا پرانا یارانہ ہے۔ کبھی بحر ہند کے ساحلوں پر، کبھی بحر احمر کی گزرگاہوں پر، کبھی یوروپ امریکہ اور جاوا سماترا کے ساحلی شہروں میں سمندر کی مہیب، پر اسرار وسعت کو دیکھتے جانا میرا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ بازاروں میں بکنے والا وہ پوسٹر جس پر لکھا ہوتا ہے اے خدا! تیرا سمندر اتنا بڑا اور میری کشتی اتنی چھوٹی، میرے ذہن پر بچپن سے کچھ ایسا چپکا کہ آج تک اتر نہ سکا۔ البتہ فطرت کو دیکھ کر خدا کو بے ساختہ پکار اٹھنے کا جو تجربہ مجھے فن لینڈ کے ایک جزیرے ماری ہام میں ہوا وہ اس سے پہلے بلکہ اس کے بعد بھی کبھی نہ ہوا۔ یہی کوئی گیارہ بارہ بجے کا عمل ہوگا۔ اولانڈ آئرلینڈ کی پارلیامنٹ سے ہماری قیام گاہ کی دوری ڈھائی تین کلومیٹر سے زیادہ نہ رہی ہوگی۔ سوچا موسم اچھا ہے، طبیعت ہشاش بشاش بھی ہے کیوں نہ پیدل ہی قیام گاہ کو چلا جائے۔ اس ارادے سے میں نے ساحل کے کنارے واک وے کا رخ کیا۔ اب جو علمی اور دانشورانہ مباحث سے دور عالم تنہائی میں فطرت پر نظر پڑی تو آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ خدا نے ہمارے لیے دنیا اس قدر خوبصورت اور سحر انگیز بنائی ہے۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی شعائیں پھینک رہا تھا جس نے درختوں، سبزہ زاروں اور نیلگوں سطح آب پر، بقول شاعر، سنہری قبا لپٹنے کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ دور بہت دور تک آرکی پلیگو کا سلسلہ آب رواں کے دوسری جانب مسرت بھری زندگی کے مزید امکانات کی نشاندہی کر رہا تھا۔ میں کچھ بے خود سا ہو گیا۔ کبھی خدا کی حمد و تسبیح کرتا، کبھی عالم بے خودی میں دو دو فٹ اچھلتا اور کبھی شدت حظ کے مارے رو پڑتا۔ ڈھائی تین کلومیٹر کا یہ سفر خدا، بندے اور کائنات کے اس نامحسوس رشتے کی دریافت کا عمل بن گیا۔

شاید عالم بے خودی کا کچھ ایسا ہی تجربہ رومی کو اس زردوز کی دھمک سن کر ہوا تھا جو ہتھوڑے کی ہر ضرب

کے ساتھ اِلّا اللہ، الّا اللہ کہتا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ رومی اس دھمک کوسن بے قابو ہوگئے۔ ہتھوڑے کی ہر ضرب انہیں ایک نئی وجد آفریں کیفیت سے دوچار کرتی رہی، ان پر پہلی بار لا الہ الا اللہ کا مفہوم واضح ہوا، وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ اس تجربہ نے آنے والے دنوں میں ان کے مریدین کے لیے سماع کا ایک مستقل ادارہ قائم کردیا۔ اگر رومی ہتھوڑے کی دھمک سے بے قابو نہ ہوئے ہوتے تو سماع کی یہ محفلیں جس نے مذہبی شاعری، صوفیانہ رقص، مناجاتی دعاؤں اور قوالی ودھمال کی مختلف شکلوں کو جنم دیا ہے، شاید اس آب وتاب اور استناد کے ساتھ مسلمانوں میں مقبول نہ ہوتیں۔ میری بے خودی کی طرح رومی کا رقصِ بسمل بھی خالصتاً ایک شخصی تجربہ تھا۔ اب جو لوگ اس عمل کو دہرانے کی کوشش کرتے ہیں یا جو رقص وسماع کے اس شخصی تجربے کی نقل کرتے یا اسے انسٹی ٹیوشنلائز کرتے ہیں انہیں حظ وسرور کی وہ کیفیت تو حاصل نہیں ہوسکتی۔

ماری ہام میں جب تک میرا قیام رہا عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتا رہا۔ نہ جانے یہ کسی اہل دل کی توجہ کا اثر تھا یا جغرافیہ کا قصور۔ پہلے دن تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ آدھی رات کا عمل ہوگا۔ ابھی ابھی جھٹپٹے کے غیاب اور شب تاریک کے قیام کا احساس ہوا تھا۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔ ملفوظات اور حکایتوں کی کتابوں میں مختلف بزرگوں کی بابت یہ پڑھ رکھا تھا کہ ان حضرات نے مسلسل چالیس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی لیکن ابھی چالیس سال کی تکمیل پر ایک دن باقی ہی تھا کہ ان کا وضو جاتا رہا۔ چالیس سال کی ریاضت اکارت گئی۔ اب جو ماری ہام کے جزیرے پر اس فقیر نے اتنی آسانی کے ساتھ، بلکہ کہہ لیجئے کہ تن آسانی کے ساتھ، عشاء کے وضو سے فجر کی نماز کا تجربہ کیا تو خیال آیا کہ اے کاش ہمارے ان بزرگوں کا جو چالیس سال کا ریکارڈ بنانے میں ناکام رہے اس جزیرے میں قیام ہوا ہوتا تو انہیں بزرگی کے اس درجہ پر فائز ہونے میں اتنی زحمتوں کا سامنا نہ ہوتا۔

ایک دن جمعہ کی نماز کی اُدھیڑ بُن میں بیٹھا تھا۔ منتظمین نے امید دلا رکھی تھی کہ اس جزیرے پر کچھ مسلمان بھی آباد ہیں جو آپ سے ملنے آئیں گے۔ ایک پاکستانی لڑکی رابعہ تو سہ پہر کو آئی اور وہ بھی یہ کہنے کہ اس کے ہاں آج میرے عشائیے پر مقامی معززین اور خاص طور پر مختلف مذہبی عمائدین کو مدعو کیا گیا ہے۔ البتہ دوپہر میں ایران نژاد بہائیوں کا ایک گروہ آیا جس نے یہ خبر دی کہ جزیرے پر صرف ایک پاکستانی نژاد مسلم فیملی آباد ہے البتہ ایک چھوٹا سا گروہ ہم بہائیوں کا ہے جن کے لیے کتب علیکم الصلوٰۃ فرادا کا حکم موجود ہے، سو کسی جمعہ کے قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بہائی جو یہودی اور عیسائی بائبل کے علاوہ قرآن مجید پر بھی ایمان رکھتے ہیں گو کہ اب اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہتے، اس بات سے ناآگاہ نہیں کہ ماضی میں ان کا تعلق متبعینِ محمدؐ کے قافلے سے رہا ہے۔ کچھ نظری التباس کے سبب اور کچھ سیاسی جبر نے انہیں اولاً مسلم شناخت کو خیر باد کہنے اور ان میں سے بہتوں کو جلاوطنی پر مجبور کیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں سید مرزا علی محمد نے باب ہونے کا اعلان کیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ایک ایسے مسیحا یا مہدی ہیں جو ان مشکل حالات میں امت کی ڈوبتی کشتی کو کنارے لگا سکتے ہیں۔ حزن واضطراب کے اس ماحول میں ان کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کی تعداد مسلسل بڑھتی گئی۔ اس پر مستزاد یہ کہ قرۃ العین جیسی خوبصورت اور شعلہ بار مقررہ اس تحریک کو مل گئی جس نے اپنی خطابت کے جادو سے ایک ولولہ انگیز کیفیت پیدا کر دی۔ علی شیرازی کی بغاوت تو بندوق کے زور پر دبادی گئی۔ وہ قتل کر دیے گئے۔ لیکن امت کے حالات ابھی بدلے نہ تھے سو مہدی کی ضرورت باقی رہی۔ بہاء اللہ نے اپنے آپ کو باب کی پیش گوئیوں کے ماحصل کے طور پر پیش کیا۔ قیدِ تنہائی میں ان پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ صرف مہدی ہی نہیں بلکہ ایک مکمل پیغمبر ہیں جن سے خدا کلام کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے الہامات کے مجموعے کا نام کتابِ اقدس رکھا جو ۱۸۹۰ء میں پہلی بار بمبئی کے ایک مطبع سے شائع ہوا۔

اس کا نام طاہرہ تھا۔ وہ اس طائفہ کی سربراہ تھی جو چھ سات بہائی خواتین پر مشتمل تھا۔ ایک طاہرہ وہ تھی جو قرۃ العین کی حیثیت سے مشہور ہوئی جو اپنے غیر معمولی حسن، شعلہ بیانی اور قائدانہ صلاحیتوں کے سبب اربابِ اقتدار کے لیے مسلسل دردِ سر بنی رہی۔ اور ایک یہ تھی جس نے جزیرہ ماری ہام پر طاہرہ کی معنوی بیٹیوں کی فکری قیادت سنبھال رکھی تھی۔ کہنے لگی ہم اس جزیرے پر وطن سے دور مہاجرینِ حبشہ کی طرح جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ایران میں ہم پر عرصۂ حیات تنگ ہے۔ یہاں تبلیغ و تعلّم کی آزادی تو ہے لیکن اس پیغام کے شایانِ شان کان نہیں ملتے۔

تو کیا تم واقعی یہ سمجھتی ہو کہ سیاہ چال میں قیدِ تنہائی کے دوران بہاء اللہ پر وحی آتی تھی؟ میں نے اسے زچ کرنے کی کوشش کی۔

بولی: اس میں آخر شبہ کی کیا بات ہے۔ باب نے اس کی آمد کی پیش گوئی کر رکھی تھی۔ باب کو یہ پتا تھا کہ وہ صرف اس کی بشارت دینے اور اس کی آمد کے لیے ماحول تیار کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ باب کی آمد کی بشارت حدیثوں میں موجود ہے۔ وہی حدیثیں جن پر تم تمام سنّی شیعہ مسلمان مہدی کی حدیثوں کی حیثیت سے

ایمان لاتے ہو۔ سید علی شیرازی سادات کے خانوادے سے تھا جس کی بشارت پر تمہاری مذہبی کتابیں گواہی دیتی ہیں۔

مہدی کے دعوے تو پہلے بھی لوگ کرتے رہے ہیں اور جب تک ان بے اصل روایتوں کو مذہبی حیثیت حاصل رہے گی، شاید آئندہ بھی کرتے رہیں۔ لیکن کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ بہاء اللہ کے ظہور کے بعد بھی دنیا ویسی کی ویسی ہی رہی۔ آج بھی بہت سے لوگ ایک نئے مہدی کی راہ تک رہے ہیں۔ مہدیت کے اس دعویٰ پر تاریخ کا فیصلہ تو ان کے حق میں نہیں جاتا۔

میرے اس اعتراض پر طاہرہ نے پہلو بدلا مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ لیکن ہم انہیں صرف مہدی مانتے ہی کب ہیں۔ ہم تو انہیں صاحبِ الہام کہتے ہیں جنہیں خدا نے ایک عالمگیر معاشرے کے قیام کے لیے بھیجا تھا اور جن کی کتاب اقدس قرآن مجید کا تسلسل بلکہ کہہ لیجیے کہ نئے زمانے کا نیا ایڈیشن ہے۔

مگر ہم مسلمان تو یہ سمجھتے ہیں کہ نزولِ قرآن کے بعد اب آسمانی وحی کا سلسلہ اپنے اتمام کو پہنچا۔ حتیٰ کہ امت میں جن لوگوں نے مہدیت کے دعوے کیے وہ بھی اپنے ساتھ کتاب اقدس لانے کی جرأت نہ کر سکے، میں نے اپنے موقف کی وضاحت کی۔

نہیں، میں یہ سمجھتی ہوں کہ اس بارے میں ہمارے ساتھ سخت ناانصافی ہوئی ہے۔ طاہرہ کی آواز اب قدرے تیز ہوتی جارہی تھی۔ کہنے لگی: محدّث اور ملہم کے دعویداروں سے تو آپ مسلمانوں کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ علی شیرازی اور بہاء اللہ اگر اپنے الہام کا تذکرہ کریں اور اسے چھاپ دیں تو قابل گردن زدنی قرار پائیں، انہیں ملک اور دین ترک کرنے پر مجبور کیا جائے اور ابن عربی، عبدالقادر جیلانی، شاہ ولی اللہ دہلوی اپنے الہام سے سند لائیں یا بات بات میں الہمنی ربّی کی رٹ لگائیں تو انہیں صاحب کشف قرار دیا جائے حتیٰ کہ ان کے مخالفین بھی ان باتوں کو تفردات کہہ کر آگے بڑھ جائیں۔ بہاء اللہ کی کتاب اقدس پر تو آپ کو اس قدر اعتراض ہے لیکن آپ ان ۶۴ آیاتِ شریفہ کا تذکرہ کیوں نہیں کرتے جن میں خدا خود عبدالقادر جیلانی کو یا غوث الاعظم کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ عبدالقادر پر نازل ہونے والی یہ آیتیں جو قال اللہ تعالیٰ یا غوث الاعظم سے شروع ہوتی ہیں، آپ لوگوں کو ختم نبوت کے خلاف معلوم نہیں ہوتیں؟ خدا خود کسی کو یا غوث کہے تو اس کے بعد آخر رہ ہی کیا جاتا ہے؟ لیکن آپ کے ثقہ علماء اس قسم کے ہفوات کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ خدا خود کو غوث اعظم کی ذات میں دیکھتا ہے، وہ غوث کے آئینے میں اپنی عین کو

دیکھ رہا ہوتا ہے تو اس طرح وہ خود اپنی ہی تعظیم کرتا ہے۔ حیرت ہے کہ اس طرح کی باتوں سے آپ لوگوں کی توحید پر حرف نہیں آتا۔ جمہور علمائے اسلام انہیں غوث ربانی، قطبِ صمدانی، محبوبِ رحمانی موصوف بصفاتِ سبحانی، مظہر ذاتِ سلطانی، قطب الاقطاب، غوث الاعظم، محی الملت والدین جیسے القاب سے نوازتے ہیں۔ یہی جرم اگر بہاء اللہ سے سرزد ہو جائے تو ان پر زندگی تنگ کر دی جاتی ہے حتی کہ ان سے ان کا وطن اور دینی شناخت بھی چھین لی جاتی ہے۔

طاہرہ کے لہجے میں اب کسی قدر تلخی آ چکی تھی۔ اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں، اس نے ایک سرد آہ بھری۔ بولی: یا باب! یا بہاء اللہ! یا رب البہا! تو گواہ رہنا۔ تیری محبت اور تیری طلب میں یہ ناتواں بندی ترکِ وطن پر مجبور ہوئی، گھر بار چھوٹا، خاندان تتر بتر ہو گیا۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور پھر دفعتاً اس کے احتجاج پر غیظ و غضب کا لہجہ غالب آ گیا۔

کتنے بے ایمان ہیں آپ لوگ! آخر باب اور بہاء اللہ نے کون سی ایسی بات کہہ دی جو پچھلوں نے نہ کہی تھی۔ نہ مہدی کے دعویٰ میں باب پہلا آدمی تھا اور نہ ہی الہام کا دعوی بہاء اللہ نے مسلم تاریخ میں پہلی بار کیا تھا۔ ابنِ عربی سے لے کر مولانا روم اور عبدالقادر جیلانی سے لے کر احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ دہلوی تک ثقہ علماء کی ایک بڑی تعداد مشاہدۂ حق اور کشف والہام کا دعوی کرتی رہی ہے۔ پھر مجھے بتائیے کہ یہ انصاف کا کون سا پیمانہ ہے کہ ابنِ عربی تو شیخ الاکبر قرار دیئے جائیں، عبدالقادر جیلانی کو غوثِ اعظم کا خطاب ملے، شاہ ولی اللہ راسخ العقیدگی کی سند سمجھے جائیں اور بہاء اللہ کے ماننے والوں پر دنیا تنگ کر دی جائے۔ آپ کو کیا پتہ غریب الوطنی کیا چیز ہوتی ہے۔

یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر طاہرہ کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اس نے ایک بار پھر اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ شاید اسے یہ احساس ہو چلا تھا کہ وہ شدتِ جذبات میں ایک نووارد مہمان سے کچھ زیادہ ہی کہہ بیٹھی ہے۔ اس صاف گوئی کے لیے اس نے معذرت کا اظہار کیا۔ کہنے لگی شاید یہ سب کچھ مجھے اس طرح نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ معاف کیجئیے گا ایک صاحبِ علم کے سامنے اظہارِ حقیقت سے خود کو نہ روک سکی۔ دل کا درد تھا جو بے ساختہ باہر آ گیا۔

طاہرہ اپنا دردِ دل انڈیل کر چل دی اور میں سوچتا رہا کہ اسطورہ میں کتنی قوت ہوتی ہے، طاہرہ کی طرح نہ جانے کتنے لوگ اساطیری طرزِ فکر کے شکار، ہجرت حبشہ کا خیال لیے، دنیا کے مختلف علاقوں میں تبدیلیٔ حالات

کے منتظر ہیں۔ کیسانیہ تحریک سے لے کر آج تک، اسلامی تاریخ کے مختلف موڑ پر، نہ جانے کتنے مہدی حالات کی درستگی کے لیے سامنے آئے۔ ہر مہدی نے اپنے ماننے والوں کو نہ صرف یہ کہ ایک نئی آزمائش سے دوچار کیا بلکہ ہمیشہ ہمیش کے لیے اپنی اصل سے لڑنے کے لیے ایک نئے فرقہ کی بنا ڈال دی۔ ذرا وسیع تناظر میں دیکھیے تو صاف لگتا ہے کہ عباسی اور فاطمی خلافت کا قیام فضائل ومناقب کی جن روایتوں کے سہارے ممکن ہو سکا ان کی حقیقت بنیادی طور پر اسطورہ سے زیادہ نہ تھی۔ آگے چل کر مسلمانوں کے مختلف فرقے، خواہ وہ دروزی ہوں یا علوی، نصیری ہوں یا بہائی اور قادیانی، وہ جنہیں ہم اہلِ قبلہ میں شمار کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں، واقعہ یہ ہے کہ ان کی حیثیت ان ہی اساطیر کے تلچھٹ کی ہے۔ بعضے کہتے ہیں کہ اسطورے کا مؤثر استعمال ہمیں چشم زدن میں بامراد کر سکتا ہے جیسا کہ مہدی سوڈانی کے ہاتھوں انگریز گورنر جنرل گورڈن کی راست شکست کی صورت میں سامنے آیا۔ لیکن ایسا سمجھنا محض ایک جزوی صداقت ہے۔ زبردست عوامی مقبولیت اور عسکری فتوحات کے باوجود مہدی سوڈانی کی قائم کردہ حکومت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ اسطورہ دراصل اپنی اصل میں ایک طرح کی فوق البشریت کا طالب ہوتا ہے۔ جب گوشت پوست کے عام انسانوں سے متوقع کرشمات ظاہر نہیں ہوتے تو بہت جلد مایوسی کی دھند چھانے لگتی ہے۔ عوام کے ذہنوں میں کرشمات کی بھوک مسلسل بڑھتی جاتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ بوتل کا جن جب ایک بار باہر آجائے تو اسے قابو میں رکھنا یا کام سے لگائے رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

۱۱

سفینۂ نجات

استنبول میں سلطان محمد فاتح کا علاقہ اپنے اسرار و رموز سے جلد پردہ نہیں اٹھاتا۔ یہاں زیادہ تر وہ لوگ آتے ہیں جو سِرّ الاسرار کی تلاش میں کسی زندہ با کرامت شیخ کے متلاشی ہوتے ہیں اور جنہیں رقص و سماع کی محفلیں کچھ زیادہ متاثر نہیں کرتیں۔ شمالی دروازے سے چارشنبہ بازار کی طرف آیئے اور اسمٰعیل آغا مسجد کی سمت چل پڑیئے۔ دفعتاً آپ کو محسوس ہوگا کہ لوگوں کے چہرے بشرے اور ان کے لباس و آہنگ تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ گول پگڑی نما ٹوپیاں، چہرے پر داڑھیوں کی بہار، لمبے مشرقی لباس، ہاتھوں میں تسبیحیں، جو بسا اوقات میں سڑک چلتے بھی گردش میں رہتی ہیں۔ یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ یہیں کہیں قریب میں دعوت و تبلیغ یا درس و ارشاد کا کوئی مرکز پایا جاتا ہے۔ نقشبندی صوفیوں کے مرکز کی حیثیت سے اسمٰعیل آغا مسجد کو وہی حیثیت حاصل ہے جو نظام الدین (دہلی) میں مولانا الیاس کی صوفی تحریکِ ایمان کے مرکز کی حیثیت سے بنگلے والی مسجد کو حاصل ہے۔ زائرین کی ویسی ہی بھیڑ۔ جتنے لوگ آرہے ہیں اس سے کہیں زیادہ مسلسل باہر جا رہے ہیں لیکن مسجد میں زائرین کی چہل پہل کم نہیں ہوتی۔ استنبول کی دوسری مشہور مسجدوں کے مقابلے میں یہاں کا ماحول بالکل مختلف ہے۔ کوئی خاموش ذکر میں مشغول ہے تو کوئی کسی کو مراقبہ اور مجاہدہ کی اہمیت سمجھا رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں لوگ ایک دوسرے سے بلا تکلف باتیں کر رہے ہیں۔ ایک طرح کی commune feeling نے، ایسا لگتا ہے مسجد پر سایا کر رکھا ہو۔ کچھ لوگ خدمہ کے لیے مستعد ہیں جو دور دراز سے آنے

والوں کو ضروری معلومات اور دورانِ قیام ان کی سہولتوں کے لیے ہدایات دے رہے ہیں۔

عصر کی نماز میں ابھی کچھ وقت باقی تھا، سوچا کیوں نہ شیخ محمود کے بارے میں پتا کیا جائے۔ میں نے ایک پگڑی زدہ نوجوان سے پوچھا کیا وہ شیخ محمود آفندی سے واقف ہے۔ شیخ کا نام سن کر اس کا چہرہ بشاشت سے کھل اٹھا۔ اچھا تو آپ شیخ محمود سے ملنا چاہتے ہیں، کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

ہندوستان سے۔

ہند..و..و..وستان! اس نے ہندوستان کے واؤ کو کچھ دیر تک کھینچتے ہوئے استفہامیہ انداز سے، میری طرف دیکھا۔ پھر بتایا کہ شیخ ان دنوں خرابیٔ صحت کے باعث ادھر کم ہی آتے ہیں۔ وہ آج کل استنبول کے ایشیائی حصہ میں اپنی رہائش گاہ میں زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ ہاں اگر ہفتہ دس دن آپ کا استنبول میں قیام کا ارادہ ہو تو اس بات کا امکان ہے کہ آپ کو حصولِ برکت کا کوئی موقع ہاتھ آجائے۔ آج کل بہت سے لوگوں کو شیخ سے مصافحہ کے بغیر ہی واپس جانا پڑتا ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔ میں شیخ کا ایک ادنیٰ مرید ہوں۔ ویسے معاف کیجئے گا اگر آپ برا نہ مانیں تو یہ بتاتے چلیں کہ کیا آپ بھی نقشبندی ہیں، شیخ محمود سے پہلے بھی ملے ہیں یا استنبول کا آپ کا یہ پہلا سفر ہے۔

میں نے اس سوال کو ٹالنے کی کوشش کی۔ پوچھا شیخ سے حصولِ برکت کا آسان طریقہ کیا ہے؟

کہنے لگا عمومی مجلسوں میں صحبت کا حصول کچھ مشکل نہیں لیکن جب تک قلب و نظر کی پوری آمادگی نہ ہو دو چار مجلسوں میں شرکت سے بات نہیں بنتی۔ ہمارے دلوں پر مادیت کا زنگ لگ چکا ہے جب تک اسے رگڑ رگڑ کے پوری طرح صاف نہ کیا جائے، روحانیت کا پینٹ پائدار نہیں ہوسکتا۔ بہت سے لوگ صرف آتے اور جاتے ہیں۔ اصل فائدہ تو انہیں ہوتا ہے جو اس راہ میں مدتوں لگاتے ہیں۔ شیخ کا کام ہمارے دلوں کے زنگ کو دھونا اور اس پر روحانیت کی قلعی چڑھانا ہے۔ جب تک کہ ہم اپنے اندرون میں اس تبدیلی کے لیے آمادہ نہیں ہوتے اور اپنے دل و دماغ کو شیخ کے ہاتھوں میں نہیں دیتے ہم روحانی ارتقاء کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ شیخ کے ہاتھوں پر بیعت کرنا گویا انہیں اس بات کا اختیار دینا ہے کہ وہ آپ کی آخرت کے ضامن بن جائیں۔

آخرت کے ضامن؟ میں سمجھا نہیں۔ میں نے نوجوان کو ٹٹولنے کی کوشش کی جو بڑی مستعدی کے ساتھ مجھے ایک روحانی گاہک سمجھ کر اپنے شیخ کی بیعت کے لیے قائل کر رہا تھا۔

میرے معترضانہ لہجہ سے وہ کچھ چونکا۔ کہنے لگا معاف کیجئے گا! آخرت کے ضامن سے میری مراد یہ ہے

کہ شیخ کی حیثیت ایک کشتی کے مانند ہے۔ روحانیت کے متلاشی تو مختلف راستوں اور طریقوں سے سفر کرتے ہیں لیکن اگر آپ نے شیخ کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دے دیا تو یہ سمجھئے کہ آپ شیخ کی کشتی پر سوار ہو گئے۔ اب اگر آپ کشتی پر سوتے بھی رہے تو آپ کا سفر جاری رہے گا۔ بیعت میں یہی فائدہ ہے۔

اور ان کا کیا بنے گا جن کے ہاتھ شیخ کی بیعت سے خالی رہ گئے؟ میں نے قدرے معصومیت سے پوچھا۔

شاید وہ اس سوال کے لیے تیار نہ تھا، کہنے لگا: اسے نہ تو آخرت میں شیخ کی معیت حاصل ہوگی نہ ہی سلسلۂ ذہب کے شیوخ سے اسے کوئی مدد مل سکے گی۔ یوں سمجھئے کہ وہ سفینۂ نجات پر سوار ہونے سے رہ گیا۔

تو کیا آپ کی نظر میں وہ تمام لوگ جو شیخ محمود کے نقشبندی سلسلہ سے وابستہ نہیں وہ روزِ آخرت رحمت الٰہی سے محروم رہیں گے؟ میں نے اسے مزید کریدنے کی کوشش کی۔

جی میں یہ تو نہیں کہتا، اس بارے میں آپ ہمارے اکابرین سے بات کر سکتے ہیں البتہ مجھے اتنا ضرور یقین ہے کہ مسلمانوں کے بہتّر فرقوں میں نقشبندیہ ہی فرقہ ناجیہ ہے۔ اگر آپ نقشبندی سلسلے کے شیوخ کی سنہری کڑی پر غور کریں تو آپ کے لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا آسان ہو جائے گا۔ بہت سے اصحاب کشف بزرگوں نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ رسول اللہ نے خود انہیں نقشبندی سلسلے کی حقانیت پر مطلع فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے حق کا اس بات پر اجماع ہے کہ مہدی علیہ السلام کا ظہور سلسلۂ نقشبندیہ سے ہوگا۔ وہ لوگوں کو نقشبندی طریقہ پر مجتمع کریں گے۔ بالآخر حق کو فتح حاصل ہوگی اور نقشبندی مسلمانوں کا ہر طرف بول بالا ہو جائے گا۔ نوجوان نے وضاحت کی۔

اور مسیح موعود کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا وہ بھی نقشبندی شیخ کی امامت میں اپنے فرائض انجام دیں گے۔ اس سے پہلے کہ ہماری گفتگو کسی واقعی مناقشے کا رنگ اختیار کرتی مسجد میں اقامت صلوٰۃ کی آواز سے یہ سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔

نماز کے بعد وہی نوجوان ایک ادھیڑ عمر شخص کو ساتھ لیے میرے پاس آیا۔ ان سے ملیے یہ ہیں شیخ حمود، آپ ان سے شیخ محمود آفندی اور ان کے سلسلۂ ذہب کے بارے میں جو کچھ پوچھنا چاہیں پوچھ سکتے ہیں۔ اور اگر کوئی ذاتی الجھن آپ کو درپیش ہو یا اپنے روحانی سفر میں کوئی دشواری محسوس کرتے ہیں تو اس بارے میں بھی ان سے بلا تکلف بات کر سکتے ہیں۔ جب تک میں آپ کے لیے قہوہ کا انتظام کرتا ہوں۔

شیخ حمود کی پگڑی نما ٹوپی عام مریدوں سے قدرے مختلف تھی۔ ترکی انداز کی شلوار اور قمیص کے اوپر انہوں نے آسمانی رنگ کا ایک لمبا چغہ بھی پہن رکھا تھا، چہرہ داڑھیوں سے بھرا ہوا محدب چشمہ کے ساتھ ان کی سنجیدگی اور منزل سلوک میں ان کی اعلیٰ پوزیشن کا پتہ دیتا تھا۔ گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ دبایا اور چند ثانیے ہاتھوں میں ہاتھ لیے بیٹھے رہے۔ ہندوستان سے میری آمد پر مسرت کا اظہار کرتے رہے اور اپنے خاص ترکی لہجہ میں لفظ ہندووستان کو کچھ اس طرح ادا کیا جیسے انہیں اس نام سے ایک خاص تعلق خاطر ہو۔ فرمایا: ہندووستان مجدد الف ثانی کی سرزمین ہے۔ اللہ کے ہاں ان کا بڑا رتبہ ہے۔ انہیں دوسرے الفیہ کا مجدد بنا کر بھیجا گیا۔ نقشبندی سلسلۂ ذہب میں ان کا بڑا مقام ہے۔

لیکن شیخ احمد سرہندی کی اس تاریخی دینی حیثیت پر کم ہی لوگوں کا اتفاق ہے۔ کیا غیر نقشبندی مسلمان بھی انہیں اسی احترام کا حقدار سمجھتے ہیں؟ میں نے طالب علمانہ معصومیت کے ساتھ سوال کیا۔

جی ہاں! کیوں نہیں! ساری دنیا انہیں مجدد الف ثانی کہتی ہے۔ قرآن وحدیث میں ان کی آمد کی پیش گوئی موجود ہے، ان کے مجدد برحق ہونے کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔

جی کیا فرمایا! قرآن وحدیث میں؟ تو کیا قرآن کی کوئی آیت مبارکہ مجدد صاحب کی شان میں بھی نازل ہوئی ہے؟

میری حیرت کو دوآتشہ کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: ایک دو نہیں دسیوں اور حدیثیں تو بے شمار ہیں۔

ان کے اس جواب پر میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اپنی بے توفیقی اور کم فہمی پر جھنجھلاہٹ بھی ہوئی کہ آخر قرآن مجید کی یہ آیات میری نگاہوں سے کیسے اوجھل رہ گئیں۔ انہوں نے اپنا لہجہ اور آہنگ بدلا، گردن کو ہلکی سی جنبش دی اور پھر اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے بعد عجمی قاریوں کے سے انداز میں قرآن کی اس آیت و لا رطب و لا یابس إلاّ فِی کتاب مبین سے اپنے دعوے کو مضبوط کیا۔ پھر سورہ واقعہ سے ثلة من الأولین وقلیل من الآخرین والی آیت پڑھی۔ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ فرمایا: آپ تو عربی زبان سے واقف ہوں گے۔ ہندوستانی علماء ویسے بھی ذہین ہوتے ہیں، بات کو جلد پا جاتے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے قلیل من الآخرین سے آپ کی ذات اور آپ کے خلفاء مراد لیے ہیں۔ رسول اللہ کی مشہور حدیث إنّ اللہ یبعث فی ھذہِ الأمة علی رأس کل مأةِ سنة من یجددلھا أمر دینھا۔ بھی آپ کی آمد پر مطلع کرتی ہے۔ اور روضۂ قیومہ میں خاص ایک حدیث آپ کے لیے ہی وارد ہوئی

ہے۔فرمایا:

يبعث رجل علي أحد عشر مائته سنة، هو نور عظيم، اسمه علي اسمي، بين السلطانين، و يدخل الجنة ألوفا ۔یعنی گیارہویں صدی کی ابتداء میں دو جابر بادشاہوں کے درمیان ایک شخص بھیجا جائے گا وہ میرا اہم نام اور نور عظیم ہوگا اور ہزاروں آدمیوں کو اپنے ساتھ جنت میں لے جائے گا۔

شیخ حمود مسلسل نص پر نص پیش کیے جا رہے تھے اور میری بے چینی میں مسلسل اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ میں نے سوچا تعبیر وتشریح کے اختلافی دنگل میں یقیناً انہیں ید طولیٰ حاصل ہوگا سو کیوں نہ ان سے کچھ مبتدیانہ قسم کے اصولی سوال کیے جائیں۔

میں نے پوچھا کیا قرآن مجید کے وہ شارحین جنہوں نے قليل من الآخرين سے احمد سرہندی اور ان کا طائفہ مراد لیا ہے کہیں خود بھی تو نقشبندی نہیں تھے؟

میرے اس سوال پر وہ کچھ جزبز ہوئے۔ بولے: اس سے کیا ہوتا ہے وہ بڑے پایے کے لوگ تھے، ان کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا انداز اب مدافعانہ ہوگیا۔

میں کسی کو چیلنج نہیں کر رہا ہوں بلکہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ایک نقشبندی مفسر قرآن میں ایک نقشبندی شیخ کا بیان پڑھے تو یہ دراصل اس کے ذاتی رجحانات اور تعصّبات کا آئینہ دار ہے۔ کسی فریق کی گواہی خود اس کے اپنے حق میں حجت نہیں ہو سکتی۔

میری یہ بات شیخ حمود کے طبع نازک پر شاید گراں گزری۔ انہوں نے خوش خلقی کا دامن تو ہاتھ سے نہ چھوڑا کہ مسکراہٹ اب بھی ان کے لبوں پر ہویدا تھی، البتہ ان کی گفتگو کا انداز اب دلائل کے بجائے ترغیب وترہیب اور نصح وخیر خواہی کا ہوگیا۔ فرمایا: یہ فیضانِ نظر کی باتیں ہیں، یہاں دلوں کی دنیا بدلی جاتی ہے، علمی دلائل سے تو خدا کا وجود بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح خدا انسان کا ایک ذاتی تجربہ ہے اسی طرح خدا سے رابطہ بھی دل والوں کی باتیں ہیں۔ انہیں برتے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ سمجھ کے کرنے کا کام نہیں بلکہ کر کے سمجھنے کی باتیں ہیں۔

شیخ حمود نے اپنے ترکش سے وہ آخری تیر بھی داغ ہی دیا جو عقلی اور علمی دلائل سے بچنے کے لیے بزرگانِ کشف اور ان کے تلامذہ ایک عرصہ سے بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کرتے آئے ہیں۔

پھر فرمایا: خدا سے انسان کا رابطہ جس قدر مضبوط ہوگا اس کی روحانی زندگی اسی قدر ابدی مسرتوں کی

آماجگاہ بنتی جائے گی۔ ہم کچھ اور نہیں کرتے ہم تو صرف لوگوں کو راستہ پر لگا دیتے ہیں۔ اب یہ سب کچھ ان کے مجاہدے پر منحصر ہے کہ وہ اس راستے میں کتنی تیزی کے ساتھ منزلیں طے کرتے ہیں۔ ہمارے شیخ محمود آفندی اور ان کے شیخ، جن کا سلسلہ ابوبکرؓ صدیق تک جا پہنچتا ہے، نے خود بڑی بڑی مشقتیں اٹھائیں تب کہیں جا کر انہیں خدا کے ہاں یہ رتبۂ عظیم ملا۔ یہ کہتے ہوئے اچانک ان کا لہجہ تبدیل ہوا۔ کچھ دھونسیانے کے انداز میں فرمایا: آپ جانتے ہیں شیخ محمود آفندی کون ہیں؟ ان کی عظمت سے شاید آپ واقف نہیں۔ ہر سال لاکھوں لوگ صرف شیخ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے استنبول کا سفر کرتے ہیں۔ ہمارے شیخ کی نسلیں اسلام کی خدمت میں لگی رہیں۔ ان کے دادا اسمٰعیل آغا جن کے نام سے یہ مسجد موسوم ہے عثمانی خلافت میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز تھے۔ علامہ زاہدالکوثری کا نام تو آپ نے سنا ہوگا! جی ہاں وہی علامہ کوثری جنہیں غوث ثانی بھی کہتے ہیں۔ آپ اس سرزمین پر ان کے آخری شاگرد ہیں۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمیں شیخ محمود سے فیض حاصل ہے۔

شیخ حمود کا یہ مونو لاگ جاری ہی تھا کہ میں نے قطع کلامی کے لیے معذرت چاہی۔ سوچا اس سے پہلے کہ شیخ میری طرف سے بالکل ہی ناامید ہو جائیں کیوں نہ دنیائے تصوف کے بعض اسرار و رموز خود ان کی زبان سے سنے جائیں۔

یہ تو بتایئے اگر کوئی نووارد اس سلسلۂ ذہب سے فیض کشید کرنا چاہے تو اسے سب سے پہلے کیا کرنا ہوگا؟

ویری سمپل! جس طرح کوئی شخص کلمہ پڑھ کر فی الفور مسلمان ہو جاتا ہے اسی طرح بیعتِ شیخ کے ذریعہ آپ فی الفور اس سلسلۂ ذہب کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد مرید کا کام ختم اور شیخ کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ شیخ اس کے قلب کو مجلّٰی اور مصفّٰی کرتا اور اسے اس کی استطاعت کے مطابق اوراد تفویض کرتا ہے۔ دیکھئے اصل ہدف تو خدا کے ساتھ رابطہ ہے لیکن یہ چیز رسولؐ سے رابطہ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی اور پھر رسولؐ سے رابطہ کے لیے ضروری ہے کہ اس کے متعین کردہ روحانی خلفاء سے آپ کا گہرا ربط ہو۔ گویا شیخ کی محبت خدا کی محبت اور اس کی اتباع ہے۔ ایک بار آپ اس رابطہ میں جڑ گئے تو یہ بھی ممکن ہے کہ آپ سے لوگوں کے جوڑنے کا کام لیا جائے۔ میں پچھلے پچیس برسوں سے شیخ کے رابطے میں ہوں۔ مختلف جگہوں پر ان کی نیابت کا فریضہ بھی انجام دے چکا ہوں۔ شیخ مجھ سے خاص التفات برتتے ہیں۔ جب میں پچھلی زندگی کا جائزہ لیتا ہوں تو میری زبان سے کلمۂ شکر جاری ہو جاتا ہے کہ خدا نے مجھے سنت پر چلنے کی توفیق دی، میں نے پندرہ سال سے

بغیر وضو کے قدم باہر نہیں نکالا، پچیس سال پہلے جب اس سلسلے میں داخل ہوا تھا تب سے مغربی لباس کو جسم سے نہیں لگایا، پاجامے کبھی ٹخنے سے نیچے نہیں ہوئے، آپ ہماری جیب میں مسواک بھی دیکھ رہے ہیں۔ پابندئ سنت کی یہ سب توفیق بس یہ سمجھئے کہ بیعتِ شیخ کا کرشمہ ہے۔ انہوں نے میرے دل کی دنیا بدل ڈالی۔

شیخ حمود اپنی ذاتی زندگی کی یہ تفصیلات بتاتے ہوئے کچھ جذباتی سے ہو گئے۔ ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا: رحمتیں نازل کر یا اللہ خواجگانِ نقشبند پر اور ہمیں شیخ محمود آفندی کی والہانہ اتباع کی توفیق دے۔

میں نے شیخ حمود کا شکریہ ادا کیا۔ رخصت کی اجازت چاہی۔ مگر وہ اتنی آسانی سے کب ماننے والے تھے۔ ہندوستان سے کوئی مسلمان اسماعیل آغا تک پہنچ کر بھی نقشبندی سلسلہ میں داخل ہونے سے رہ جائے، یہ انہیں گوارا نہ تھا۔ کہنے لگے: قدرت ایک خاص اسکیم کے تحت آپ کو یہاں لائی ہے۔ کیا پتہ اسے آپ سے کوئی بڑا کام لینا مقصود ہو۔ پرسوں شبِ جمعہ ہے۔ ویسے تو شیخ محمود ان دنوں اپنی علالت کے سبب مہمانوں کو بھی باریاب نہیں کرتے، لیکن پاکستان سے دعوتِ اسلامی کا ایک وفد اِن دنوں استنبول میں ہے اور امکان ہے کہ کل شیخ محمود اسے چند لمحوں کے لئے باریابی کی اجازت دیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو بھی ساتھ لئے چلوں۔ یہ ایک نادر موقع ہے اور شیخ چراغِ سحر ہیں۔

میں نے کہا اگر گفتگو کا موقع نہیں اور بات صرف دست بوسی کی ہے تو یہ سعادت تو مجھے آپ جیسے مستند خلیفہ کے توسط سے حاصل ہو ہی گئی۔ ہاں البتہ اس ہفتہ کسی صحبت میں شرکت ضرور کروں گا کیا پتہ دل کی کوئی گرہ کھل ہی جائے۔

۱۲

رسول اللہ سے فون پر گفتگو

جامع اسماعیل آغا سے ساحلِ سمندر کی طرف جسے سیاحوں کی زبان میں گولڈن ہارن اور مقامی زبان میں خلیج کہا جاتا ہے، میرے لئے ایک مانوس علاقہ ہے۔ شاید اس کا ایک سبب یہ ہو کہ ایامِ طالبِ علمی میں جب مشاہدے کی حس کہیں تیز ہوتی ہے، استنبول کے اس حصے پر مجھے تاریخ کی خوابیدگی کا احساس کچھ زیادہ شدت سے محسوس ہوا۔ مسجد محمد فاتح سے نکل کر اس کے عقب میں روایتی انداز کے بازار اور ایسے قہوہ خانے جن پر کارواں سرائے کا گمان ہوتا ہے اور جہاں بیٹھ کر گا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی یہاں سے کوئی کارواں گزرا ہو۔ یہاں روایتی مشرقی پیالوں میں شوربے کے ذائقے پر بھی سولھویں صدی کا گمان ہوتا ہے اور ان دنوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جب غذا کا تعلق ذائقۂ کام و دہن سے گہرا تھا اور جب کھانا کھانے کا عمل ایک انبساط انگیز تجربہ ہوا کرتا تھا اور جس کے نتیجے میں زبانِ حال و قال سے بے ساختہ صبر و شکر کے کلمات نکل پڑتے تھے۔ خلیج کے ساحلوں پر چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں تازہ مچھلیوں کے سینڈ وچ نوش فرمایئے۔ گلاس دو گلاس سنترے کے خالص جوس کا لطف لیجئے اور تازہ دم ہو کر مشاہدۂ کائنات میں لگ جایئے۔ مشرق اور خاص طور پر عالمِ اسلام میں جہاں بھی جایئے آج بھی اکل و شرب پر ایک انبساط انگیز تجربے کا گمان ہوتا ہے۔ ٹکنالوجی کی آمیزش جہاں جتنی کم ہے یا یہ کہیئے کہ اور گینک فوڈ کی سہولت جہاں جتنی باقی رہ گئی ہے وہاں کھانا کھانا ایک میکانیکی عمل کے بجائے آج بھی اظہارِ شکر کا ایک وسیلہ ہے۔ خاص طور پر مشرق کے فرشی دسترخوان پر جہاں

اہلِ خانہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں کو اہتمام سے رکھتے اور مل بانٹ کر صرف کھانے میں ہی شرکت نہیں کرتے بلکہ زندگی کی مسرتوں اور کلفتوں کو باہم شیئر کرتے ہیں اس کی صحیح قدر و قیمت وہ اہلِ مغرب نہیں سمجھ سکتے جہاں برگر اور سینڈوچ کھا کر ایسا لگتا ہے جیسے خدا نے نعمت نہ دی ہو بس کھڑے کھڑے ٹرخا دیا ہو۔ لندن میں ٹوٹنہم کورٹ روڈ سے گذرتے ہوئے سینڈوچ کی دکانوں پر لوگوں کا ہجوم دیکھ کر اکثر یہ خیال آتا ہے کہ تو نا فش کے یہ سینڈوچ جو دو چار دنوں سے ٹھنڈی الماریوں میں کسی کی راہ تک رہے ہیں کھانے والوں کا پیٹ تو بھر سکتے ہیں اس پر صبر و شکر کے وہ جذبات طاری نہیں کر سکتے۔ سیلز بری کی *simply food* کی دوکانوں سے کٹے کٹائے پھلوں کی سرد قاشیں اس لطف و انبساط سے محروم رکھتی ہیں جو درخت سے پھل توڑ کر کھانے میں محسوس ہوتا ہے کہ انسان درخت سے پھل توڑتے وقت فطری طور پر اپنے اندر اس کائنات اور اس کے خالق سے ایک نامحسوس رشتہ دریافت کرتا ہے۔ خیال ہوا کیوں نہ رات کا کھانا اسی علاقے میں کھایا جائے جہاں پرانے ذائقے کی بوباس ابھی باقی ہے۔

مصطفیٰ اوغلو ابھی راستے میں تھے طئے پایا کہ اسمٰعیل آغا کے اسی قہوہ خانے میں ان کا انتظار کروں۔ اس ریسٹوراں پر قہوہ خانے کی تہمت خواہ مخواہ تھی کہ یہاں قہوہ سے کہیں زیادہ مختلف اقسام کے کھانوں کی تیز خوشبو آ رہی تھی۔ ایک گوشہ میں خاموش ٹیلویژن چل رہا تھا اور ایک سرور آمیز صوفیانہ موسیقی نے ماحول پر کیف طاری کر رکھا تھا۔ قہوہ خانہ کے باہر ملحقہ علاقے میں صاف ستھری کرسیاں، سفید میز پوشوں کے گرد سجی تھیں۔ اندر سے کہیں زیادہ باہر چہل پہل کا سماں تھا۔ میں ابھی یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ کدھر بیٹھوں کہ باہر بیٹھے ہوئے چند نوجوانوں کی گفتگو سے ایسا لگا جیسے وہ اردو زبان میں گفتگو کر رہے ہوں۔ قدرے حیرت اور مسرت کے ساتھ نگاہیں اٹھائیں ان میں سے ایک نوجوان بڑھ کر میری طرف آیا اور سلام کے بعد مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

کیا آپ شیخ محمود کے مرید ہیں؟ اس نے جاننا چاہا۔ ہم لوگ شیخ محمود کی زیارت کے لیے کینیڈا سے آئے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر ایسا لگا شاید آپ کا تعلق بھی پاکستان سے ہو۔

پاکستان سے تو نہیں البتہ ہندوستان سے ضرور ہے، میں نے وضاحت کی۔

ایک اور ترکی قہوہ کا آرڈر دیا گیا اور وطن سے دور ہم زبان نوجوانوں کے مشاہدے کو سمجھنے اور ان سے استفادے کا ایک موقع ہاتھ آ گیا۔ استنبول کے اس حصہّ میں جہاں ٹوپیوں اور داڑھیوں کی کثرت ہے باہم اعتماد اور اخوت کی فضا پائی جاتی ہے۔ زندگی کی برق رفتار تبدیلی کا اثر یہاں کم محسوس ہوتا ہے۔ جب بھی آئیے،

جتنے دنوں بعد بھی آ ئیے، استنبول کے اس حصہؔ کا وہی پرانا رنگ وآہنگ برقرار رہتا ہے۔ یہ علاقہ محمود آفندی کے زیر اثر ہے، جن کی روحانی حکومت کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ جس طرح استنبول میں مولانا کہنے سے مولانائے روم کی ذات مراد لی جاتی ہے اسی طرح یہاں حضرت کا لقب شیخ محمود کے عمومی احترام وعقیدت کا علامیہ ہے۔ حیضرئت (حضرت) محمود آفندی کا نام نامی زبان پر لاتے ہوئے مریدوں کے چہرے پر عقیدت واحترام کی ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے، ہاتھ سینے کی طرف اٹھتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے اہل تشیع آلِ محمدؐ پر صلوٰۃ وسلام بھیجتے ہوئے اظہار احترام کے لیے ہاتھ سینے تک لاتے اور سر کو آگے کی طرف ہلکی سی جنبش دیتے ہیں۔ مریدوں کی نظر میں حضرت کا تعلق بھی آلِ محمدؐ سے ہے۔ ان کے کشف والہام کے قصےّ عام ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسمٰعیل آغا مسجد میں درس وارشاد کا احیاء اسی الہام کے سبب ہے۔ ایک دن انہیں یہ الہام ہوا، بلکہ کہیئے کہ حکم ہوا اور تب وہ بیعت وارشاد کے ٹوٹے سلسلے کو از سرِ نو منظّم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیکھتے دیکھتے حضرت کے مریدوں کی تعداد لاکھوں میں جا پہنچی۔ آپ چاہے استنبول سے کتنی ہی مسافت پر کیوں نہ ہوں، مشرق میں ہوں یا مغرب میں، حضرت کی ذرا سی توجہ آپ کی دادرسی کے لیے کافی ہوسکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پچھلے دنوں حضرت کے مریدوں کو یہ اطلاع ملی کہ عمر کے آخری حصےّ میں حضرت کی یہ خواہش ہے کہ وہ عمرہ کے لیے جائیں۔ کوئی چالیس ہزار مریدان کی ہم رکابی کے لیے تیار ہوگئے۔ چارٹرڈ طیاروں کا انتظام کیا گیا، اطراف حرم کے تمام ہی اہم ہوٹلوں کی بکنگ کا پروگرام بن گیا۔ ہمیں یہ تو نہیں معلوم کہ واقعتاً ساتھ کتنے لوگ گئے لیکن خود ان آنکھوں نے مدینہ منورہ میں حضرت کے ہٹو بچو کا جو منظر دیکھا اس سے علماء ومشائخ کی غیر معمولی سماجی توقیر کے وہ تذکرے ذہن میں پھر سے تازہ ہوگئے جو عہد سلاجقہ کے تذکروں میں پڑھ رکھے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عہدِ سلاجقہ کے بعض قد آور علماء جب باہر نکلتے تو ان کے ہم رکاب باوردی علماء کی ایک بڑی فوج ہوتی۔ ہٹو بچو کے اس ہنگامے میں شیخ پر نذرانے لٹائے جاتے، اشرفیوں کی بارش ہوتی اور عوام کالانعام دست بوسی بلکہ قدم بوسی کے لیے ایک دوسرے پر پلے پڑتے۔ اور اگر اژدہام کے سبب قدم بوسی کا موقع نہ ملتا تو جس کے ہاتھ جو کچھ لگتا اسے ہی چوم لینے پر اکتفا کرتا۔ بعض لوگ شیخ کے گھوڑے کی دم کو چوم لینا بھی اپنی سعادت جانتے۔ مدینہ میں حضرت محمود آفندی کی ویل چیئر کے گرد ہٹو بچو کا کچھ ایسا ہی ہنگامہ تھا۔ شیخ کے سیکڑوں باوردی مریدان نے پگڑی نما سفید ٹوپی اور سفید جبّہ میں ملبوس شیخ کی مافوق الفطری تعظیم اور روحانی عظمت کا سکّہ بٹھانے کے لیے ہٹو بچو کا جو منظر قائم کر رکھا تھا ایسے مناظر تو حکمرانوں کی آمد پر بھی دیکھنے کو

نہیں ملتے۔ آج حضرت کے مریدوں میں اٹھتے بیٹھتے ہوئے یہ سوال بار بار میرے ذہن میں آتا رہا۔ اب جو پاکستانی نژاد کینیڈیائی نوجوانوں کا یہ گروہ استنبول کے اس قہوہ خانے میں نظر آیا تو اس سوال کی دھار اور تیز ہوگئی۔

ترکی قہوہ کا پہلا گھونٹ نئے پینے والوں پر قدرے شاق گزرتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کی تلخی مزہ دینے لگتی ہے۔ قہوہ کے دو چار گھونٹ نے جب ہم نشینی اور بے تکلفی کا ماحول پیدا کر دیا تو میں نے ہاشم سے پوچھا حضرت محمود کی ارادت مندی کا شرف اسے کب سے حاصل ہے؟

اس سے پہلے کہ ہاشم کچھ کہتے ولید جس کی عمر یہی کوئی بیس بائیس سال ہوگی، اس نے مداخلت کرتے ہوئے کمال بے اعتنائی سے کہا ابھی تو یہ ایک شیخ کی تلاش میں ہیں۔ کوئی پہنچا ہوا شیخ، اگر آپ بھی کسی ایسے شیخ سے واقف ہوں تو بتائیے۔

ارے ان کی باتوں پر مت جائیے، یہ ہر بات کو مذاق بنالیتے ہیں۔ ہاشم نے سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اپنے سفر استنبول سے کچھ اس طرح آگاہ کیا: میں، ولید اور ساجد اور ہمارے ایک اور دوست عبدالعزیز جو اس وقت انقرہ میں کسی رشتہ دار سے ملنے کے لیے گئے ہوئے ہیں ہم لوگ کینیڈا سے خاص طور پر حضرت محمود کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔ وہاں کینیڈا میں کوئی دو سال ہوئے ہم لوگ نقشبندی سلسلے سے منسلک ہوئے۔ شیخ ہشام کبّانی کو تو آپ جانتے ہوں گے، وہی ہشام کبانی جو شیخ ناظم حقانی نقشبندی قبرصی کے خلیفہ ہیں۔ ہم لوگ ان کے حلقۂ ارادت سے وابستہ رہے، بلکہ اب بھی ہیں۔ لیکن پچھلے دنوں کچھ واقعات ایسے ہوئے جس نے ہمارا سکون درہم برہم کر دیا۔ شیخ ہشام نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا وہ شیخ ناظم کے بجائے اپنی بیعت لینے لگے۔ اس صورت حال نے ان کے بعض رفقاء کو مخالفت پر آمادہ کر دیا۔ اب ایک دوسرے پر الزام تراشی کا سلسلہ ہے، ایک دوسرے کی کرامتوں کا انکار، کشف و کرامات کے نئے دعوے۔ ہماری طرح بہت سے نئے مریدوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ واقعی کس کا کشف سچا ہے اور کس کا جھوٹا۔ بیعت کا اختیار رسولؐ اللہ نے واقعتاً کسے دیا ہے۔ پچھلے دنوں استنبول سے کچھ لوگ ہمارے مرکز میں گئے تھے ان ہی کی زبانی شیخ محمود کی روحانی عظمت کا علم ہوا اور پتہ چلا کہ دنیا ابھی اہلِ حق سے خالی نہیں۔ ہماری آمد کو ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔ چالیس دنوں کے قیام کا ارادہ ہے۔ مسجد اسمٰعیل آغا میں بڑا نورانی اور روحانی ماحول ہے لیکن ابھی تک ہمیں شیخ محمود کی زیارت نہیں ہوسکی ہے۔ آپ جانتے ہیں وہ ان دنوں بیمار رہتے ہیں۔

ولید جو ہماری ان باتوں کو کبھی بے اعتنائی اور کبھی توجہ سے سنتا تھا، کہنے لگا میں نے آپ کو شیخ حمود کے ساتھ مسجد میں گفتگو کرتے دیکھا تھا۔ واقعی وہ بڑے اچھے آدمی ہیں، انہیں دین کی بڑی معلومات ہے۔ کیا آپ حضرت کے پرانے مرید ہیں؟

نہیں! میں بھی آپ ہی کی طرح ایک مسافر ہوں، مجھے بھی ایک شیخ کی تلاش ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی دوران مصطفیٰ اوغلو ہم لوگوں سے آ ملے۔ کہنے لگے میں جب بھی کسی شیخ کی تلاش میں نکلا ہر بار مجھے ایسا لگا جیسے وہ صاحبِ کرامت شیخ خود ہمارے اندرون میں موجود ہو۔ بس اسے متحرک کرنے کی ضرورت ہے۔ باہر کے تمام شیخ فقط باہر سے شیخ ہیں، ان کا اندرون خالی ہے کہ اگر ان کا اندرون منور ہوتو وہ خود کو شیخ کے منصب پر فائز نہیں کر سکتے، نہ کسی کی بیعت لے سکتے ہیں، نہ کسی کو مرید بنا سکتے ہیں اور نہ ہی کسی کی نجات کے ضامن بن سکتے ہیں۔ ان کاموں کے لیے بڑی شقی القلبی کی ضرورت ہوتی ہے۔

مصطفیٰ اوغلو کے الفاظ پاکستانی نوجوانوں کے لیے دھماکے سے کم نہ تھے۔ خاص طور پر ہاشم پر یہ الفاظ بڑے شاق گزرے۔ البتہ ولید کو اپنی تشکیک کے اظہار کا موقع مل گیا جسے غالباً وہ اب تک از راہ مروت چھپائے بیٹھے تھے۔ کہنے لگے: برادر مصطفیٰ! کیا تم شیخ ناظم قبرصی کو جانتے ہو، ان کے مراکز امریکہ اور کینیڈا میں ہیں اور لندن میں بھی ان کا ایک بڑا مرکز ہے جسے برسہابرس پہلے برونائی کے شیخ نے ان کے لیے خریدا تھا۔ شیخ ناظم خود کو سلسلۂ نقشبندیہ کی چالیسویں کڑی بتاتے ہیں اور چالیس کی اہمیت تو آپ جانتے ہی ہیں۔ چالیسویں پشت پر ان کا شجرہ رسولؐ اللہ سے جا ملتا ہے۔ ابھی چند سال پہلے وہ جب گھر سے نکل رہے تھے ان کے ہاں اچانک رسولؐ اللہ بہ نفس نفیس تشریف لے آئے۔ ان کی کھلی آنکھیں اس منظر کی تاب نہ لاسکیں وہ غش کھا کر گر پڑے۔ رسولؐ اللہ نے چار پانچ گھنٹے تک ان سے ملاقات کی اور انہیں اس امر سے آگاہ کیا کہ نقشبندی سلسلہ ہی فرقۂ ناجیہ ہے اور یہ کہ مستقبل کا مہدی بھی اسی نقشبندی سلسلے سے ہوگا۔ یہاں تک تو ہم لوگ شیخ کی کشف وکرامات پر یقین کرتے رہے لیکن پچھلے دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا جس کی رپورٹ الجزیرہ ٹی وی پر بھی آئی تھی۔ شیخ نے یہ دعویٰ کیا کہ انہوں نے فون پر رسولؐ اللہ سے گفتگو کی ہے۔ ہم نوجوانوں کے لیے یہ بات ذہنی خلجان کا سبب بنی اور اس پر مستزاد جب ان کے اندرونی جھگڑے منظرِ عام پر آئے، نقشبندی سلسلے کے عہدے داروں کی باہمی لڑائیاں جب ہمارے سامنے آئیں تو ہمارے عقیدت کا گھڑا چُور رچُور ہوگیا۔ سچ پوچھیے تو مجھے اب ان

قصے کہانیوں پر کچھ زیادہ اعتبار نہیں رہا۔ البتہ یہ ہمارے دوست ہاشم اور ساجد ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا کی سرزمین کبھی اللہ والوں سے خالی نہیں رہتی، ولی کے بغیر کائنات قائم نہیں رہ سکتی سو ہم نے سوچا کہ اس دفعہ چھٹیوں میں استنبول کی خاک چھانی جائے، میں تو شیخ وخ کے چکر میں اب نہیں آنے والا لیکن ایک بار شیخ محمود سے مل لینے میں کچھ حرج بھی نہیں۔ ان کے بارے میں یہاں بڑی اچھی رائے پائی جاتی ہے، مریدین زیادہ تر سنت پر عامل ہیں، اکثر کی داڑھیاں ہیں اور زیادہ تر لوگ ٹخنوں سے اوپر شلوار پہنتے ہیں، مسواک کا استعمال بھی عام ہے، عورتیں مردوں سے الگ برقع میں رہتی ہیں اور غیر محرموں سے مصافحے کا رواج بھی نہیں دِکھتا۔ یہاں تک تو بات ٹھیک لگتی ہے اب دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔

تم ہر بات کو شک سے شروع کرتے ہو یہ رویہ ٹھیک نہیں۔ ہاشم نے تنبیہاً کہا۔ سچے اہل اللہ اپنے کشف کے ذریعہ لوگوں کے شک کا پتہ لگا لیتے ہیں اور جن لوگوں کے دل شکوک کی آماجگاہ ہوتے ہیں شیخ ان پر توجہ نہیں فرماتے۔ یہ اہل دل کا پرانا اصول ہے کہ جب تک سالک میں طلب خالص نہ ہو اس کی طرف نظر عنایت نہیں کی جاتی۔ شک کی سرزمین پر یقین کا پودا برگ و بار نہیں لاتا۔ اگر تم شیخ کی توجہ چاہتے ہو تو تمہیں اپنے دل کو شکوک وشبہات اور اس قسم کے شیطانی وسوسوں سے پاک کرنا ہوگا۔

لیکن یہ بات تو معلوم کرنی ہی ہوگی کہ اگر حق نقشبندی طریقے کے ساتھ ہے تو وہ کون سا نقشبندی طریقہ ہے، شیخ ناظم قبرصی کا یا حضرت محمود آفندی کا؟ مصطفیٰ اوغلو نے معاملے کو اور خراب کرنے کی کوشش کی۔

ویسے آپ کس سے بیعت ہیں ہاشم نے مصطفیٰ اوغلو سے جاننا چاہا۔

مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں کسی سے بیعت کروں؟

ہائیں...... ہاشم کی زبان سے اچانک نکلا۔ آپ کو پتہ نہیں کہ جس کا کوئی شیخ نہیں ہوتا شیطان اس کا شیخ بن جاتا ہے۔

یہ آپ کہاں سے لے آئے؟ مصطفیٰ اوغلو زیر لب مسکرائے۔

جی! آپ کو معلوم نہیں یہ حدیث میں ہے۔

حدیث میں؟

جی ہاں! اور ایک حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ جس مسلمان کی گردن بیعت سے خالی رہی اور وہ اسی حالت میں مرا تو ایسے شخص کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

لیکن اسلام میں بیعت تو صرف خلیفۂ وقت کے لیے ہے۔ یہ ہما شما کو بیعت لینے کا اختیار کہاں سے حاصل ہوگیا۔ مصطفیٰ اوغلو نے اپنے سوال کی دھار کچھ اور تیز کردی۔

دیکھئے میں زیادہ تو نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ سادات کو ہم مسلمانوں کی روحانی تربیت کا فریضہ خود رسولؐ اللہ نے سونپا ہے اور یہ بیعت کا سلسلہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔ پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانی سے لے کر داتا گنج بخش، معین الدین چشتی، مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ اور جتنے بھی بڑے بڑے نام ہیں وہ کسی نہ کسی شیخ سے بیعت رہے ہیں۔ بیعت کے بغیر آپ کی حیثیت اس کٹی پتنگ کی ہوتی ہے جسے شریر بچے لاوارث سمجھ کر لوٹ لیتے ہیں، ہاشم نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

اور اس میں حصولِ فیض کا بھی تو فائدہ ہے۔ ساجد جواب تک خاموشی سے یہ سب کچھ سن رہے تھے اور جس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ ان مسائل سے نابلد ہیں، اس نے بھی مداخلت ضروری سمجھی۔

فیض؟ فیض تو پیر کی ذات کو پہنچتا ہے، مریدوں کے نذرانوں سے، مصطفیٰ اوغلو نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

دیکھئے بزرگوں کی شان میں ایسی جسارت آمیز باتیں نہیں کہنی چاہیے۔ ہاشم نے احتجاج کیا۔

انہیں ہمارے نذرانوں کی ضرورت نہیں۔ خدا نے ان کے لیے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب مسخّر کر رکھا ہے کہ شیخ ناظم کی توجہ سے بہت سے لوگوں کی زندگیاں بدل گئیں۔ صرف ان کی زندگیاں سنت کے مطابق نہیں ہوئیں بلکہ شیخ کی دعاؤں اور فیض کے سبب ان کے مالی حالات بھی بہتر ہوگئے۔ میرے ایک دوست ہیں طالب حسین وہ بھی شیخ کے مریدوں میں سے ہیں۔ ان کی فیملی کو کراچی سے کینیڈا منتقل ہونا تھا۔ دو سال سے کاغذی کارروائی معلّق تھی۔ ہر بار آخری مرحلے میں کوئی نہ کوئی مسئلہ آ کر پھنس جاتا تھا۔ انہوں نے شیخ سے دعاؤں کی درخواست کی اور شیخ نے انہیں ایک مہینہ کے اندر کام ہوجانے کی بشارت سنائی۔ ابھی تیسرا ہی دن تھا کہ ہائی کمیشن سے کلیئرنس کا فون آ گیا۔ دعاؤں کی قبولیت کی ایسی مثالیں تو دسیوں ہیں۔ جو لوگ سلوک کے راستے میں آگے چل نکلتے ہیں ان کے لیے صرف شیخ کی طرف توجہ کرنا کافی ہوتا ہے، آپ دنیا کے کسی بھی حصّے میں بیٹھ کر اپنے شیخ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

ہاں اگر شیخ کے پاس بھی موبائل ہو، مصطفیٰ اوغلو نے پھر شرارت آمیز مداخلت کی۔

معاف کیجئے گا آپ ان امور سے بالکل ہی نابلد معلوم ہوتے ہیں۔ اہل دل کے ہاں رابطہ ایک

اصطلاح ہے اور یہ اس زمانے سے ہے جب موبائل ٹکنالوجی وجود میں نہیں آئی تھی۔ مرید جب اپنے شیخ کی طرف عالم مراقبہ میں توجہ کرتا ہے یا یہ کہئے کہ تصورشیخ کو وہ جس قدر مہمیز کرتا ہے اسی قدر سرعت اور شدت کے ساتھ شیخ کو بھی اپنے مرید کی پریشانی کا علم ہو جاتا ہے اور وہ فی الفور اس کی مدد کے لیے آموجود ہوتا ہے۔ جی ہاں بنفسِ نفیس، فلِش اور بلڈ میں۔ اور یہ شیخ اپنے شیوخ کے ذریعہ اور کبھی براہِ راست بھی رسولؐ اللہ کے رابطے میں ہوتا ہے بلکہ ذات باری تعالیٰ سے بھی براہ راست اس کا رابطہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ کو دنیا کی کوئی طاقت زیر نہیں کر پاتی۔ مرید بظاہر ایک عام سا انسان ہے لیکن وہ اپنے شیخ کے رابطے میں ہونے کے سبب قطب وقت اور تمام بزرگوں سے جڑا ہوتا ہے۔ پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر گویا وہ خدائی مدد کا مستحق ہو جاتا ہے اسی لیے تو ہمارے شاعر مشرق نے کہا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ　　غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز

خیر شاعر مشرق کو چھوڑ یئے میں اردو زبان سے واقف نہیں اس لیے شاعری کو appreciate نہیں کر سکتا۔ یہ بتایئے کہ یہ قطب صاحب جن کے دم سے دنیا کا نظام قائم ہے یا جو اس دنیا کو چلا رہے ہیں وہ کہاں پائے جاتے ہیں اور وہ دنیا کو اتنی خراب حالت میں کیوں چلا رہے ہیں؟ مصطفیٰ اوغلو کی یہ ایمان بھری باتیں ہاشم سے برداشت نہ ہو سکیں۔

دیکھئے اگر آپ واقعی سنجیدہ ہیں تو میں گفتگو کو آگے بڑھاؤں ورنہ دینی معاملات میں تمسخر مناسب نہیں۔ مصطفیٰ اوغلو پر تنبیہہ کارگر رہی۔ انہوں نے پہلو بدلا اور کمالِ معذرت سے کہنے لگے معاف کیجئے گا میرا مقصد خدا کی کارکردگی پر اعتراض کرنا نہیں۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ قطب اور ابدال کی موجودگی کا پتہ ہمیں کہاں سے چلا؟

ان ہی بزرگوں سے جن کی کوششوں سے ہم اور آپ مسلمان ہیں۔ انہوں نے ہی ہمیں اس امر پر مطلع کیا ہے۔ کیا آپ نے ابن عربی کا نام نہیں سنا، ساری دنیا انہیں شیخ اکبر کے نام سے جانتی ہے، انہوں نے ہمیں اس بات پر مطلع کیا ہے کہ دنیا کا نظام چلانے کے لیے خدا نے روحانیوں کی جو ٹیم تشکیل دی ہے اس میں قطب سب سے اونچے مقام پر ہے، جس کی ماتحتی میں دوائمہ، چار اوتاد، سات ابدال، بارہ نقباء اور آٹھ نجباء کام کر رہے ہیں۔ علی الہجویری نے تین سو اخیار، چالیس ابدال، سات ابرار، چار اوتاد اور تین نقباء کو قطب کی نگرانی میں متحرک بتایا ہے۔

ان دونوں حضرات کی معلومات کا ماخذ کیا ہے؟ مصطفیٰ اوغلو، جنہوں نے اب عالموں کی سی سنجیدگی اختیار کر لی تھی، نے کمال متانت سے پوچھا۔

اب آپ ان حضرات پر بھی اعتراض کرنے لگے۔ یہ تو اسلام کے اساطین ہیں، صاحبِ کشف وکرامات بزرگ ہیں، ان کے فرمودات کو اگر دین سے نکال دیا جائے تو باقی کیا رہ جائے گا؟

خرافات کے علاوہ سب کچھ، مصطفیٰ اوغلو پھر پرانے رنگ میں آ گئے۔

معاف کیجئے گا آپ مجھے کچھ دہریہ سے لگتے ہیں۔ آپ کے دل بزرگوں کے احترام سے بالکل خالی ہیں۔ آپ یا تو دہریہ ہیں یا وہابی اور میں دونوں ہی سے بحث کو فضول جانتا ہوں۔ ہاشم کو طیش میں آتے دیکھ کر میں نے مداخلت ضروری سمجھا۔

دیکھئے یہ نہ تو دہریہ ہیں اور نہ ہی وہابی۔ ان کی کار میں صوفی نغموں کی سی ڈیز (CDs) سن سن کر میں تنگ آ گیا ہوں اور پھر ہمارا مقصد تو سمجھنا سمجھانا، ایک دوسرے سے استفادہ اور ایک دوسرے کے دکھ درد کو بانٹنا ہے۔ اہل اللہ کو تو ویسے بھی غصہ زیب نہیں دیتا۔ دہریے اور وہابی ہی تو آپ کی دعوت کے مستحق ہیں۔

میری باتوں سے ہاشم کا غصہ کچھ ٹھنڈا تو ہوا لیکن وہ پھر سے یہ قضیہ لے بیٹھے کہ شبہات کی زمین میں ایمان کا بیج برگ وبار نہیں لاتا۔ کہنے لگے: شیخ الحدیث مولانا زکریا نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی شخص کو گمراہ کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کا دل اولیاء اللہ کے لیے بغض سے بھر دیتا ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے بھی لکھا ہے کہ جو لوگ اولیاء اللہ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں ان کا خاتمہ ایمان پر نہیں ہوتا، اگر تم ان کی قبریں کھول کر دیکھو گے تو پاؤ گے کہ ان کا رخ قبلہ سے موڑ دیا گیا ہے۔

معاف کیجئے گا! آپ غلط سمجھے۔ مصطفیٰ اوغلو نے پھر معاملات کو درست کرنے کی کوشش کی۔ میرا مقصد اولیاء اللہ کی توہین نہیں میں تو خود اولیاء اللہ کا معتقد ہوں۔ بھلا خدا جسے اپنا ولی کہے اس کے خلاف کوئی مسلمان کیسے سر اٹھا سکتا ہے لیکن یہ تو پتہ چلے کہ ہم جس آدمی کو ولی سمجھے بیٹھے ہیں وہ واقعی ولی اللہ کہلانے کا مستحق ہے، آخر ولی کی پہچان کیسے ہوگی؟

ولی کی پہچان کے لیے ولی ہونا ضروری ہے کہ ولی ہی ولی کو پہچان سکتا ہے، ہاشم نے وضاحت کی۔

پھر عام لوگوں پر یہ عقدہ کیسے کھلے گا کہ ایک ولی نے دوسرے ولی کی بابت جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے؟ مصطفیٰ نے معصومیت سے پوچھا۔

جی اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ یا تو اولیاء اللہ کی باتوں پر ایمان لائیں یا پھر خود اس راستے پر چل کر ولایت کے منصب پر سرفراز ہوں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک میں پچھلوں کی ولایت کا اقرار نہ کروں خود میری اپنی ولایت مستحکم نہیں ہوسکتی۔ اپنے آپ کو ولی کہلانے کے لیے یہ لازم ہے کہ میں پچھلوں کی ولایت کا اقرار کروں۔ یہ تو کچھ وہی صورت حال لگتی ہے جب کہانی کے بادشاہ کو برہنہ دیکھ کر بھی دربار کے تمام لوگ صرف اس خیال سے بادشاہ کے لباس کی تعریف کرتے رہے مبادا ان کی حماقت کا پول نہ کھل جائے کہ شاطروں نے یہ پروپیگنڈہ کر رکھا تھا کہ بادشاہ کا یہ نفیس لباس صرف عقلمندوں کو نظر آئے گا، بے وقوف اس کی دید سے محروم رہیں گے۔ ہے نا یہ کچھ ایسی ہی بات؟ کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا؟ مصطفیٰ اوغلو نے ہاشم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اولیاء اللہ کی شان میں تو قرآن مجید میں بھی آیتیں موجود ہیں۔ ہاشم نے مصطفیٰ اوغلو کو لاجواب کرنے کی کوشش کی۔ کیا آپ کی نظر سے وہ آیت نہیں گزری۔ ألا إن أولياء الله لاخوف عليهم ولاهم يحزنون۔ کہ اللہ کے ولیوں کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ غم۔

بھلا اس بات سے کسے انکار ہے۔ اصل مسئلہ تو یہی ہے نا کہ ولی ہے کون؟ آپ قرآن مجید میں ولی کی تعریف کیوں نہیں تلاش کرتے؟ ولا اور براء پر ہمارے ہاں بڑی تفصیلی بحث موجود ہے اور یہ بات قرآن کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور جنہوں نے اس کے دین کی سربلندی کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا دراصل یہی لوگ اللہ والے ہیں، اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں اور ایسے ہی لوگوں کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ ان کے لیے خوف و غم کا کوئی موقع نہ ہوگا۔ دنیا میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں، وہ جو خدا کے باغی، انسانیت کے دشمن اور امن وسکون کو برباد کرتے ہیں یہ لوگ ولی الشیطان ہیں یعنی شیطان کے لیے کام کرنے والے لوگ اور اس کے برعکس جو لوگ خدا شناس زندگی جیتے ہیں، دنیا کو فتنہ و فساد سے پاک کرنے کے لیے سرگرم ہیں، بری باتوں سے روکتے اور بھلائی کا حکم دیتے ہیں، یہ لوگ ولی اللہ یا اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ اس گروہ میں ہم تمام مسلمان شامل ہیں۔ یہ ایک عمومی اصطلاح ہے جو تمام اہل ایمان کو محیط ہے۔ تمام انبیاء کے سچے پیروکار اس بشارت کے مستحق ہیں۔

ہاشم بڑے غور سے مصطفیٰ اوغلو کی باتیں سن رہے تھے۔ ولید اور ساجد بھی محو حیرت تھے ایسا لگتا تھا جیسے انہوں نے یہ بات پہلی بار سنی ہو، اس طرح پہلے انہیں کبھی سوچنے کا موقع نہ ملا ہو۔

لیکن اولیاءاللہ کی روحوں سے فیض بھی تو پہنچتا ہے؟ ہاشم کا انداز اب مخالفانہ کے بجائے طالب علمانہ تھا۔

بھئی یہ سب ایک گورکھ دھندا ہے۔ پہلے تو یہ مانیے کہ فلاں بزرگ فلاں قبر میں جلوہ افروز ہیں جو اپنے مریدوں کی حاجات سنتے، ان کے لیے دعائیں کرتے، ان کی سفارشیں خدا کے حضور پہنچاتے ہیں اور پھر قبر کی طرف توجہ کر کے بیٹھ جائیے، قبر پر چلہ کشی کیجیے اور پھر جب وہ مردہ بزرگ آپ کو بذریعہ کشف کسی علاقے کی روحانی سلطنت عطا کر دے تو وہاں جا کر بیعت وارشاد کا سلسلہ جاری فرما دیجیے۔ حالانکہ جن قبروں سے آپ فیض وبرکت کا ظہور سمجھتے ہیں ان کی حقیقت خاک کے ایک ڈھیر سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ قرآن تو صاف الفاظ میں کہتا ہے إنَّك لاتسمع الموتي (نمل ۸۰) اوروما أنت بمسمع من في القبور (فاطر ۲۲) یعنی تو مردوں کو نہیں سنا سکتا لیکن مزاروں کے مجاوروں نے شب وروز ان قبروں سے فیض وبرکت کے ظہور کا پروپیگنڈہ کر رکھا ہے۔

ہاشم خاموشی کے ساتھ یہ باتیں سن رہے تھے۔ وہ درمیان میں کچھ بولنا چاہتے اور پھر خاموش ہو جاتے۔ کہنے لگے تو کیا کشف والہام کے یہ تمام دعویدار ناقابل اعتبار ہیں؟ کیا حصولِ فیض وبرکت کی تمام کہانیاں جھوٹی ہیں؟

اب یہ فیصلہ تو آپ کو کرنا ہے۔ ایک طرف قرآن کا اعلان ہے اور دوسری طرف نام نہاد بزرگوں کے دعوے۔ مصطفیٰ اوغلو یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ محفل شاید یہیں برخاست ہو جاتی جب ہی ولید نے قہوہ کی اگلی پیالیوں کا آرڈر دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ تو بالکل ہی خاموش ہو گئے۔

میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ہمارا اپروچ طالب علمانہ ہو اور ہم تمام تعصّبات سے اوپر اٹھ کر حقیقت کے متلاشی بن جائیں تو کام آسان ہو جاتا ہے۔ اللہ نے ہم میں سے ہر شخص کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے اور وہ ہماری سمجھ کے مطابق ہی ہم سے حساب لے گا۔ معاملہ تب خراب ہوتا ہے جب ہم غور وفکر کے دروازے بند کر لیتے ہیں۔ اب یہ دیکھئے کہ تصوف کے علمبرداروں نے کس عیاری کے ساتھ غور وفکر پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ یہ کہنا کہ خدا جب کسی شخص کو گمراہی میں مبتلا کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل میں اولیاءاللہ کی مخالفت کا عنصر ڈال دیتا ہے یا یہ بات کہ جس کے دل میں اولیاءاللہ کی محبت نہیں ہوتی اس کا خاتمہ بالخیر نہیں ہوتا، قبر کے اندر اس کی لاش قبلہ رخ سے موڑ دی جاتی ہے، دراصل ہم سے یہ چاہتی ہے

کہ ہم ان مکروہ پروپیگنڈوں پر بلا چوں چرا ایمان لے آئیں۔ ایک بات اور غور کرنے کی ہے جیسا کہ بھائی ہاشم نے اپنی گفتگو میں قطب اور ان کے معاونین اخیار، اوتاد، ابدال وغیرہ کا ذکر کیا تو ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ابن عربی اور علی ہجویری نے قطب اور ان کے حواریوں کی جو تفصیل دی ہے ان کی تفصیلات میں باہم بڑا تضاد پایا جاتا ہے۔ ان دونوں میں سچا کون ہے۔ جب ہم حق کی تلاش میں نکلتے ہیں اور ہمارے دل و دماغ دعائے محمدی اللهم أرني الأشياء كما هي یعنی اے اللہ مجھے چیزوں کو ویسا دکھا جیسی کہ وہ ہیں، سے معمور ہوتے ہیں تو صحیح سمت میں ہمارا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ ہمارا کام اپنی سی جد و جہد کرنا ہے۔ طلب اگر خالص ہو اور دل تعصب و عناد سے پاک ہو تو ہم یقیناً حقیقت تک پہنچ جائیں گے۔

لیکن یہ باتیں تو مسلّمات میں سے ہیں، بزرگوں اور صوفیاء کا اسلام میں شروع سے ایک مقام رہا ہے۔ بڑے پیر صاحب غوث اعظم کو ایک دنیا مانتی ہے، ہاشم نے اپنی الجھن کو ایک نئے انداز سے پیش کیا۔

دنیا مانتی ہے، اسی لیے تو اسلام کی اصل روشنی ہمارے درمیان سے رخصت ہوگئی ہے۔ وہی عبدالقادر جیلانی نا! جنہیں پیرانِ پیر دست گیر بھی کہتے ہیں، مصطفیٰ اوغلو نے سوال کو اچکنے کی کوشش کی۔ بھئی ان کی تو بڑی کرامتیں ہیں، آپ نے تو صرف چالیس اشرفیوں والی کہانی پڑھی ہوگی میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ ان کی پیدائش کے وقت والدہ دردِ زہ میں مبتلا ہوئیں اور حضرت پیدا ہو کر نہ دیتے تھے، ان کے والد اس صورتِ حال سے سخت پریشان ہوئے، وہ اس وقت اپنے عہد کے کسی مشہور بزرگ کے پاس گئے جنہوں نے فرمایا کہ وہ ولیوں کا سردار ہے اس طرح باہر نہ آئے گا، انہوں نے اپنے عمامہ کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر دیا اور فرمایا اسے لے جا کر اپنی بیوی کو دے دو تاکہ وہ اسے نگل لے۔ بیوی نے ایسا ہی کیا اور تب قطب الاقطاب غوث اعظم لنگوٹ باندھے ہوئے باہر آ گئے۔

واقعی؟ ولید نے کسی قدر حیرت کا اظہار کیا۔ لگتا ہے یہ آپ نے کچھ زیادہ کر دیا۔

نہیں میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا۔ یہ تو معمولی کرامات ہیں جو ان اولیاء اللہ سے سرزد ہوتی رہی ہیں اور کیوں نہ ہوں عبدالقادر جیلانی تو ماشاء اللہ سے صاحبِ وحی بھی ہیں۔ کیا آپ کو ایک آیت قدسی سناؤں جو غوث اعظم پر نازل ہوئی۔

آیت؟ کیسی باتیں کرتے ہیں، ہاشم نے حیرت سے پوچھا۔

جی ہاں یہ بڑا گہرا سمندر ہے اس کے اسرار و رموز آسانی سے نہیں کھلتے۔ ابھی تو آپ کو ایسی ایسی باتوں کا

پتہ لگے گا کہ عقل دنگ رہ جائے گی۔ سنیئے کیا فرمایا اللہ تعالیٰ نے غوث اعظم سے۔ یہ کہتے ہوئے مصطفیٰ اوغلو نے اپنی آنکھیں نیم بند کر لیں، تلاوت کے انداز میں باادب سنبھل کر بیٹھ گئے اور پھر مجّو د ترک لہجہ میں کچھ اس طرح گویا ہوئے:

قال یا غوث الأعظم، إن لي عبادا سوي الأنبياء والمرسلين، لا يطلع علي أحوالهم أحد من أهل الجنة، ولا أحد من أهل النار، ولا ملك مقرب، ولا رضوان۔ وما خلقتهم للجنة ولا للنار، ولا للثواب و لا للعقاب، ولا للحوار ولا للقصور ۔فطوبي لمن آمن بهم و إن لم يعرفهم۔ يا غوث الأعظم وأنت منهم۔ و من علاماتهم في الدنيا أجسامهم محترقة من قلة الطعام والشراب و نفوسهم محترقة عن الشهوات، و قلوبهم محترقة عن الخواطر، وأرواحهم محترقة عن اللحظات۔ و هم أصحاب البقاء المحترقين بنور اللقاء۔

تلاوت ختم ہوئی تو ساجد نے مطالبہ کیا کہ ذرا ترجمہ بھی فرمادیں تو اچھا رہے گا۔ ترجمہ تو راشد شاز صاحب سے سنیئے مصطفیٰ اوغلو نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ہمارے دوست شاز صاحب ایک اسلامی اسکالر ہیں، یہ آپ کو لفظاً لفظاً ترجمہ بتائیں گے۔

راشد شاز! Hey!Are you the same guy of Future Islam?

ہاشم نے حیرت آمیز تجسس سے پوچھا۔

جی ہاں آپ نے بالکل صحیح پہچانا۔ مصطفیٰ اوغلو نے تائید کی۔

I have seen some of your stuff.

بہرحال یہ توقع نہ تھی کہ اس طرح اچانک آپ سے ملاقات ہو جائے گی؟

کیا تم ان سے واقف ہو؟ ساجد نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں میں نے ان کی کچھ چیزیں انٹرنیٹ پر دیکھی ہیں۔ ہاشم نے وضاحت کی اور کناڈا میں ہمارے ایک دوست ہیں جوان کے بڑے قائل ہیں انہوں نے ان کی کچھ کتابیں ہندوستان سے منگوائی ہیں، کہتے ہیں بڑی مشکل اردو میں ہے تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ لیکن اب میں اپنے دوست سے کہہ سکوں گا کہ میں ان سے استنبول میں مل کر آیا ہوں وہ یقیناً بہت خوش ہوں گے۔

گفتگو کا رخ بدلتے دیکھ کر میں نے مصطفیٰ اوغلو سے تادیباً کہا تم نے پھر وہی حرکت کی۔ وہ اشارہ سمجھ

گئے۔ بولے: جب موسیٰ سے خضر کی مطلوبہ احتیاط نہ برتی جاسکی تو مجھ سے رازوں کی بے ساختہ افشائی قابل معافی ہے، مصطفیٰ اوغلو نے صفائی پیش کی۔ ولید نے محفل کا رنگ بدلتے دیکھ کر مجھ سے کہا کہ بڑی اہم باتیں ہورہی تھیں آیئے اسے جاری رکھیں۔

مصطفیٰ اوغلو آیتِ غوثیہ پڑھتے گئے اور میں اس کا ترجمہ کرتا گیا:

فرمایا: اے غوث الاعظم! ہمارے بعض بندے ایسے ہیں جو نہ انبیاء ہیں اور نہ مرسلین۔ جن کے احوال سے نہ اہل جنّت واقف ہیں نہ اور نہ ہی اہل نار میں سے کوئی، ان کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ نہ کوئی مقرب فرشتہ رضوان کو ان کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔ انہیں ہم نے نہ جنت کے واسطے پیدا کیا ہے اور نہ ہی دوزخ کے لیے۔ نہ ثواب کے لیے اور نہ عذاب کے لیے۔ نہ حور کے لیے اور نہ قصور کے لیے۔ سومسرت ہے اُن لوگوں کے لیے جو ان پر ایمان لائیں خواہ انہیں ان کی معرفت حاصل ہو یا نہ ہو۔ اے غوث اعظم تم ان ہی لوگوں میں سے ہو۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ ان کے جسم کم کھانے پینے کی کمی کے سبب جھلسے ہوئے ہوں گے۔ ان کے نفس کی لذتیں اور خواہشات جل بھن گئی ہوں گی اور ان کے دل خطرات سے حفاظت کے سبب اور ان کی روحیں لذتوں سے روک تھام کے سبب جھلسی ہوئی ہوں گی۔ جان لو کہ یہی لوگ اہل بقیٰ میں سے ہیں جن کے وجود نورلقا کے سبب جل بھن گئے ہیں۔

ترجمہ ختم ہوا تو ان تینوں نوجوانوں پر سکتہ سا طاری تھا۔ لحن داؤدی میں مصطفیٰ اوغلو کی تلاوت نے انہیں پہلی بار قرآن کے علاوہ کسی اور وحی سے آگاہ کیا تھا۔

کیا غوثِ اعظم کی وحی کا کوئی مجموعہ بازار میں مل جاتا ہے؟ ہاشم نے جاننا چاہا۔

بازار میں چاہے نہ ملے لائبریری میں تو مل ہی جائے گا۔ اس کے بہت سے نام ہیں، رسالہ غوث الاعظم، فتوحات ربّانی، الہامات غوث الاعظم اور اس قسم کے مختلف ناموں سے چھٹی صدی ہجری سے یہ رسالہ علماء ومشائخ میں متداول رہا ہے، مصطفیٰ اوغلو نے وضاحت کی۔

تو کیا ہمارے علمائے کرام کو ان باتوں کی خبر نہیں۔ ڈاکٹر شاز آپ بھی تو کچھ بولیے۔ یہ تو بڑا نازک مسئلہ ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے رہے ہیں کہ صرف غلام احمد قادیانی جیسے لوگ اس جرم میں ملوث ہیں جنہیں علمائے اسلام نے دین بدر کر دیا ہے۔ اب برادر مصطفیٰ نے یہ بتایا کہ ابن عربی سے لے کر شاہ ولی اللہ تک بڑے بڑے نام خدا سے راست رابطے کے دعویدار ہیں۔ ان باتوں کو ہم نے کیسے انگیز کر رکھا ہے خدارا اس مسئلہ پر کچھ روشنی

ڈالیے۔

ہاشم ذہنی طور پر بڑے مضطرب لگ رہے تھے۔ مجھے ان کے جذبۂ صادق پر والہانہ پیار آیا۔ میں نے ان کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا برادرِ عزیز میری یا کسی اور کی تلاش کردہ حقیقت پر آنکھیں بند کر کے ایمان مت لائیے جب تک آپ خود حقیقت کی تلاش میں نہیں نکلتے آپ کے اندر حق کے سلسلے میں اعتماد کی کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ اب تک ہماری گمرہی کا بنیادی سبب یہی ہے کہ ہم بڑے ناموں کے پیچھے چلنے کے عادی ہیں۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ جب بڑے بڑے علماء کسی بات کی صداقت پر گواہی دے رہے ہیں تو یقیناً یہ حق ہوگا کہ اتنے سارے لوگ احمق اور گمراہ تو نہیں ہوسکتے اور خاص طور پر جب ان ناموں کے گرد تقدس کا ہالہ بھی قائم ہو۔ اگر ان کی باتوں پر اعتبار کرنے کے بجائے آپ نے میری رائے کو فتویٰ کے طور پر قبول کرلیا تو پھر آپ آراءالرجال کے ان ہی دائروں میں گھومتے رہیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ خود ان سوالات کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ میری رائے ایک شخص کی رائے ہے آپ اسے بھی عقل کی میزان پر وحی کی روشنی میں پرکھیئے۔ رہا آپ کا یہ استعجاب کہ دینِ اسلام میں اتنے جسارت آمیز اور خلاف قرآن دعووں کو اب تک کیونکر انگیز کیا جاتا رہا ہے تو یہ ایک ایسا راز ہے جسے سمجھنے کے لیے اسلامی تاریخ سے گہری واقفیت، گروہی اور سیاسی رقابتوں کے معروضی اور تفصیلی مطالعہ کے علاوہ قرآن مجید کے غیر فرقہ وارانہ اور چشم کشا مطالعہ کی ضرورت ہے۔ سرِ دست صرف اتنا سمجھئے کہ روحانیوں کی ان ہفوات کو جس نے ختم نبوت کا کھلے عام مذاق اڑایا ہے کبھی شطحیات کبھی تفردات اور کبھی علم باطن کے حوالے سے سند عطا کرنے کی کوشش کی گئی ہے حالانکہ قرآن مجید کا ایک معمولی طالب علم بھی یہ سمجھے بغیر نہیں رہ پاتا کہ فتوحات اور فصوص میں ابن عربی نے قرآن کی باطنی تشریح کے ذریعے ظاہری معانی کو شکست دینے کی کوشش کی ہے۔ جس طرح ان حضرات نے کشف والہام کے کثرت سے دعوے کیے ہیں، ملائے اعلیٰ سے اپنی واقفیت کی خبر دی ہے، ان تمام ہفوات کے لیے کم از کم اس دین میں کوئی گنجائش نہیں ہے جو محمدؐ رسول اللہ کو خدا کا آخری رسول اور قرآن مجید کو آخری وحی کے طور پر پیش کرتا ہے۔ لیکن ہمارے ثقہ علماء کا حال یہ ہے کہ کچھ تو عوامی عتاب کے ڈر سے اور کچھ علم وجرأت کی کمی کے سبب وہ یہ کہہ کر ان خرافات پر پردہ ڈالتے رہے ہیں کہ یہ بڑوں کی باتیں ہیں جن پر لب کشائی ہمیں زیب نہیں دیتی۔ وہ برملا کہتے ہیں کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔ نتیجہ یہ ہے کہ تیسری چوتھی صدی کے ہنگامی حالات میں فکری التباسات کی جو آندھی اٹھی وہ آگے چل کر التباسات کی دھند میں اضافہ ہی کرتی رہی۔ فاطمی

اور عباسی خلفاء کی باہم رقابتوں نے زیرِ زمین صوفی تحریک کے لیے راہ ہموار کی۔ ہر آنے والا صوفی پچھلے صوفی کے کندھوں پر کھڑا ہو کر اپنا قد بلند کرتا رہا۔ اس نے پچھلوں کے الہامی دعوں کا ابطال و انکار کرنے کے بجائے خود ان ہی بنیادوں پر اپنے دعوے کی اساس مستحکم کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹے بڑے، عالم فاضل اور جاہل غافل سبھوں کی تالیفات و ملفوظات کشف و الہام کے دعوں سے بھر گئیں۔ پھر آگے جو اسلام چلا وہ ابن عربی اور عبدالقادر جیلانی کا لایا ہوا اسلام تھا جسے علی ہجویری، مودود چشتی، احمد رفاعی، احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ، گنگوہی، نانوتوی، مولوی زکریا اور ان جیسے سیکڑوں لوگوں کے کشف و الہام نے رنگ و روغن فراہم کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد رسول اللہ کا دینِ خالص پیچھے رہ گیا۔

رات کافی ہو گئی تھی لیکن ان نوجوانوں کے چہروں پر تھکن کے کوئی آثار نہ تھے۔ بڑی توجہ بلکہ تجسّس اور اضطراب کے ساتھ میری باتیں سن رہے تھے۔ ولید کبھی خلا میں گھورتا اور کبھی میز پر پڑی کافی کی خالی پیالی پر اس کی نگاہیں جم جاتیں۔ ساجد عالمِ حیرت میں دکھائی دیتا اور ہاشم کی بابت تو نہ پوچھیے ایسا لگتا تھا جیسے اس کے پیروں تلے زمین نکل چکی ہو۔ الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ چوم لینے کی کوشش کی اور کل کی ملاقات کے وعدے کے ساتھ ہماری کار ہوٹل کی طرف چل پڑی۔

۱۳

یا عبدالقادر جیلانی شیأً للہ

گلیوں سے نکل کر ہماری کار جب شاہراہ پر آئی تو میں نے مصطفیٰ اوغلو سے کہا: مصطفیٰ مجھے اندازہ نہ تھا کہ تم مصحفِ قادریہ کے حافظ بھی ہو۔ تم نے تو ایسی تلاوت کی کہ سماں باندھ دیا۔ وہ مسکرایا، کہنے لگا: ایک زمانے میں تو مجھے الہاماتِ قادریہ کی اکثر آیتیں یاد تھیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں شیخ علی العلی کا شاگرد تھا اور میرے روزانہ وظائف میں ان کی تلاوت بھی شامل تھی۔ بات یہ ہے کہ جب تک ان حضرات کی جعلی وحی کو اصلی وحی کے مقابل میں نہ رکھا جائے ان کی کراہیت واضح نہیں ہوتی، ان پر تقدس کا پردہ پڑا رہتا ہے۔ میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جعلی وحی کے یہ تمام وثیقے اور کشف والہام کے یہ تمام دعوے قرآن مجید کا زور توڑنے کے لیے بلکہ یہ کہیئے کہ رسالۂ محمدی کو شکست دینے کے لیے تشکیل دیئے گئے ہیں۔ ان الہامات میں قاری کو جو باتیں ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہیں وہ عقل اور وحی سے حددرجہ مغائر بلکہ اس کی بدترین مخاصمت پر مشتمل ہیں۔ مثال کے طور پر اسی مصحفِ قادریہ کو لیجئے، جس کے مطابق عبدالقادر جیلانی نے جب اپنے رب سے پوچھا کہ اے رب تیری نظر میں کون سی نماز بڑے رتبہ والی ہے تو خدا کا جواب تھا:

قال الصلاۃ التی لیس فیھا سواي والمصلي نفسه غائب عنها

یعنی ایسی نماز جس میں میرے سوا کوئی نہ ہو حتیٰ کہ نماز ادا کرنے والا بھی اس میں سے غائب ہو۔ ایک دوسری آیت مزعومہ میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے صاف کہہ دیا ہے کہ اہل علم کے لیے خدا کے ہاں کوئی جگہ نہیں۔ مصطفیٰ اوغلو نے پھر گلے دار قاریوں والی مصنوعی کیفیت طاری کی اور باندازِ ترتیل کچھ اس طرح گویا ہوئے:

قال یا غوث الأعظم لیس لصاحب العلم عندی سبیل بعد انکاره۔ لأنه لو لا ترك العلم عنده لصار شیطانا۔

فرمایا اے غوث اعظم اہل علم کے لیے مجھ تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں جب تک کہ وہ علم کا حامل ہے۔ ہاں اگر کوئی راستہ نکل سکتا ہے تو وہ علم سے انکار کے بعد لیکن اگر وہ علم کو ترک کر دے تو شیطان ہو جاتا ہے۔

عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ کہنے والے نے کون سی بات کہہ دی۔ لیجیے صاحب علم پر تو خدا تک رسائی کا دروازہ ہی بند ہو گیا۔ علم کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں اس کا گزر نہیں اور علم ترک کرنے کی شکل میں بھی اس کے شیطان بن جانے کی وعید۔ گویا ایک بار علم اگر آپ کو چھو بھی گیا تو کام سے گئے۔ ان ہی شاہِ ولایت کا ایک قول ہے کہ العلم حجاب أکبر۔ اب دیکھیے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ قرآن تو ہمیں علم و اکتشاف، غور وفکر اور تدبر وتفکر پر لگانا چاہتا ہے اور غوث اعظم کی وحی علم کے چھو جانے کو بھی ایسا نا قابل تلافی گناہ بتاتی ہے جس کے بعد نجات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

تو کیا صحیفۂ قادریہ یا جسے آپ الہاماتِ غوث اعظم کہتے ہیں صوفیاء کی مجلسوں میں عمومی وظائف کا حصّہ ہیں، میں نے مصطفیٰ اوغلو سے پوچھا۔

نہیں! مبتدئین کے ہاں اوراد و وظائف کے مختلف مجموعے متداول ہیں البتہ خواص کی سطح پر ان الہامات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن مجید کی بعض مختصر سورتوں اور بعض دعاؤں کی تلاوت کے بعد ان آیتوں کی تلاوت بھی مجربات میں بتائی جاتی ہے اور صلوٰۃ غوثیہ کی ایجاد کے پیچھے بھی اسی قسم کے الہامات کا ہاتھ ہے، مصطفیٰ اوغلو نے وضاحت کی۔

آپ کا حافظہ ماشاءاللہ بڑا زبردست ہے جب آپ ان آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے آپ کبھی بہ سمتِ بغداد پڑھی جانے والی صلوٰۃ غوثیہ کے امام رہے ہوں گے، میں نے انہیں چھیڑنے کی کوشش کی۔

بولے: اس قسم کی خرافات کا ذخیرہ تو میرے حافظے میں خاصا ہے۔ ذرا رکئے میں ابھی آپ کو ایک چیز سنواتا ہوں یقیناً آپ محظوظ ہوں گے۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی کار میں لگے آڈیو پلیئر کے بٹن کو آگے پیچھے حرکت دی اور تب ہی دف کی دھمک پر عرفتُ الهوي منذ عرفت الهواء کا وجد آفریں نغمہ بلند ہوا:

و أما الذی أنت أهل له   فكشفك لي الحجب حتي أراك

کہیے کیا خیال ہے؟

جی ہاں! موسیقی تو بڑی سحر انگیز ہے اور قافیہ ردیف کا صوتی آہنگ بھی بڑے غضب کا ہے۔ اب حظ کی اس کیفیت میں کہنے والا سب کچھ کہہ جاتا ہے، وہ بھی جس کا کہنا اسے زیب نہیں دیتا، میں نے اپنی رائے دی۔

یہ مراقش کے مشہور فرقہ ابن عربی (ابن عربی بینڈ) کا مقبول عام نغمہ ہے۔ ان حضرات کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اندلس کی اس صوفی موسیقی کو پھر سے رواج بخشا ہے جس کا ابن عربی کے اندلس میں شہرہ تھا۔

دینِ ابن عربی تو غیر محسوس طور پر اپنا کام کر رہا ہے۔ کہیں صوفیانہ نغموں، کہیں الہامات وملفوظات، کہیں کشف وکرامات کے واقعات، کہیں مراقبہ اور مشاہدۂ حق اور کہیں اہل حق کی شطحیات اور عرس وزیارت کے منظّم کاروبار کے ذریعہ اس کی فروغ واشاعت کا کام مسلسل جاری ہے۔ اس کے برعکس محمدؐ رسول اللہ کا لایا ہوا دین عالمی منظر نامے سے پوری طرح غائب ہے۔ رسالۂ محمدی وحی ربّانی کی شکل میں موجود ومحفوظ تو ہے لیکن اہل حق کی دھمال، فقہاء کی قیل وقال، مفسرین کی تاویلات وتعبیرات اور محدثین کی شانِ نزول کی تراشیدہ روایتوں نے اس کے معانی پر سخت پہرے بٹھا دیئے ہیں۔ اب دیکھئے ہمارے یہ ذہین نوجوان جو دین کی تلاش میں ان روحانیوں کے گرد چکر لگا رہے ہیں، ایسے نہ جانے کتنے لوگ مختلف شیخ طریقت، پیروں فقیروں اور بہروپیوں کے دام میں گرفتار لغو کاموں میں اپنی قوت ضائع کر رہے ہیں۔ کوئی تصورِ شیخ میں دن بھر بیٹھا ہے، کسی کو اکیس ہزار مرتبہ وظیفہ دہرانے کا کام ملا ہے، کوئی کسی قبر پر چلّہ کاٹ رہا ہے تاکہ صاحب قبر سے اسے فیض حاصل ہو سکے اور کوئی سیکڑوں میل دور بیٹھا شیخ کے ہلوسہ اور اس کے رابطہ کی غلط فہمی میں مبتلا خلافِ عقل ووحی کاموں میں لگا ہوا ہے۔ کیسی عجیب ہے یہ صورتِ حال اور کتنا مضبوط اور مکروہ ہے روحانیوں کا یہ جال جس نے پوری امت پر ایک افیمی نیند طاری کر رکھی ہے، میں نے اپنے کرب کا اظہار کیا۔

بولے: مصیبت یہ ہے کہ دین کی نفی کا یہ مذموم کاروبار مسلسل روبہ عروج ہے۔ اب دیکھئے نا یہاں استنبول میں مختلف صوفی خانقاہوں کا احیاء ہو گیا ہے۔ نقشبندیہ، مولویہ، قادریہ، جلوتیہ، شاذلیہ، رفاعیہ اور پھر ان کی مختلف برانچیں، ان سبھوں کے اپنے اپنے حلقے ہیں، ہر صوفی مرکز پر مقامی لوگوں کے علاوہ یوروپ اور امریکہ سے آنے والے زائرین کی بہار ہے۔ اکثر صوفی سلسلوں نے اپنے مراکز دیارِ غرب میں قائم کر رکھے ہیں جہاں سے ان کے مقامی مرکز میں زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

رومی کی بڑھتی مقبولیت اور صوفی مراکز کے احیاء کا اصل سبب کیا ہے؟ میں نے مصطفیٰ اوغلو سے جاننا چاہا۔

کہنے لگے: ایک تو یہی کہ مغرب میں کسی چیز کی مقبولیت ہمارے ہاں بھی قبولیت کا سبب بن جاتی ہے۔ چونکہ ہمارا سوادِ اعظم بلکہ اہل علم کی ایک بڑی تعداد مغرب کے فیشن سے متاثر رہتی ہے۔ لہٰذا ادھر رومی کی امریکہ میں شہرت ہوئی اور ادھر مشرق کے قہوہ خانوں میں اس پر گفتگو چل نکلی۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ مغرب اسلام سے اپنی مخاصمت کو چھپانے کے لیے صوفی اسلام کو پردے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ جب اسلام کی نفی کا اتنا منظّم ادارہ پہلے سے ہی عالم اسلام میں کام کر رہا ہے تو پھر اسلام کو خطرہ سمجھنے والے لوگ کیوں نہ اس کا سہارا لیں۔ ایک تیسری اور اہم تر وجہ یہ ہے کہ خود اہل مغرب کا حال یہ ہے کہ ان کے ہاں ثقافتی، روحانی اور فکری سطح پر بڑا خلا پایا جاتا ہے۔ صوفی رقص اور والہانہ نغموں کے دھمال میں انہیں اس محرومی کا مداوا دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا لوگ کشاں کشاں کبھی یوگا اور کبھی مراقبہ اور کبھی رقص وموسیقی کی روحانیت سے لطف اندوز ہونے کے لیے مشرق کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ مصطفیٰ اوغلو نے مزید وضاحت کی۔

لیکن عام اہل مغرب جو تلاش حق میں استنبول تک آتے ہیں ان کے دل تو تعصب سے پاک ہوتے ہیں وہ تو اس تحریک پر اسلام کا ہی گمان کرتے ہیں۔

جی ہاں، عام لوگوں کے لیے تو ہاؤ ہو کے اس ہنگامے پر اسلام کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ ان کا خلوص اور ان کی حق طلبی شکوک وشبہات سے بالاتر ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ حق تک ان کی رسائی ہو تو کیسے؟ انہوں نے بڑے دکھ سے کہا۔

مصطفیٰ اوغلو جب مجھے واپس پہنچا گئے تھے اس وقت یہی کوئی نصف شب کا عمل رہا ہوگا۔ تھکن کچھ زیادہ نہ تھی۔ اگلے دن کی مصروفیت کے پیش نظر جلد سونے کی کوشش کی لیکن خیالات کا ہجوم کچھ زیادہ تھا۔ ہاشم کے مضطرب اور ولید کے شبہات میں ڈوبے ہوئے سوالات یاد آئے۔ کبھی ان پر افسوس ہوتا کہ وہ کن موہوم سہاروں کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور کبھی ان نوجوانوں کے جذبۂ تلاشِ حق پر رشک آتا کہ ایک ایسی صورت حال میں جب عام لوگ صرف کھانے کمانے میں لگے ہیں، اللہ نے ان حضرات کو زندگی کے معمولات سے اوپر اٹھ کر بڑے سوالات پر غور کرنے کی توفیق دی۔ ترس اس لیے آتا کہ وہ ایک شیخ سے بددل ہو کر دوسرے شیخ کی تلاش میں نکلے ہیں۔ نقشبندی حقانی کو چھوڑ کر نقشبندی خالدی سلسلہ سے بیعت کے لیے استنبول آئے ہیں

گویا تاڑ سے گرے اور کھجور پر اٹکے۔ ہشام کبانی اور ان کے شیخ ناظم حقانی کے مقابلے میں انہیں محمود آفندی کے ہاں سب کچھ تقدس میں ڈوبا ڈوبا لگتا ہے۔ جامع اسماعیل آغا میں لمبی داڑھیوں، سفید پگڑیوں، ڈھیلی ڈھالی ٹخنوں سے اوپر شلواروں اور اس پر لمبے لمبے جبّے میں ملبوس لوگ ان نوجوانوں کو کتنے تقدس مآب لگتے ہیں۔ اس 'دینی ماحول' اور 'نورانی شب وروز' نے ان نوجوانوں کو کس قدر مسمرائز کر رکھا ہے۔ ہشام کبانی اور عبدالکریم قبرصی نہ سہی محمود آفندی کے ہاتھوں میں ان کی حیات ونجات کا اختیار دے کر امّت مزید تین نوجوانوں کی بیش بہا صلاحیتوں سے محروم ہو جائے گی۔ ہاشم اور ان کے ساتھی تو اس phenomenon کا ایک بہت چھوٹا حصّہ ہیں۔ روحانیوں کے اس جال میں جس کا سلسلہ اطراف عالم میں پھیلا ہوا ہے ہر دن نہ جانے کتنے لوگ اتباع شیخ کی خواب آور گولی کھلا کر سلائے جاتے ہیں۔

میں جس قدر سونے کی کوشش کرتا خیالات کا ہجوم بڑھتا جاتا۔ آج پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ سکون کی نیند سونا کچھ آسان نہیں۔ شاید یہ انھیں لوگوں کے حصےّ میں آتی ہے جو کسی شیخ کے سفینۂ نجات پر سوار اس بھروسے سوتے ہیں کہ وہ سوئیں یا جاگیں شیخ کی قیادت میں سفینہ کا سفر نجات کی طرف جاری ہے۔ مجبوراً بستر سے اٹھ بیٹھا، کھڑکی کا پردہ ہٹایا، دور سمندر کے ساحل پر ملگجی روشنی میں چند متحرک انسانی سایے نظر آئے۔ ایسا لگا جیسے میری طرح وہ بھی مضطرب ہوں، جن سے حالات کی سختی اور مسائل کی پیچیدگی نے رات کا سکون چھین لیا ہو۔ دیر تک باسفورس کے کنارے ان پراسرار حرکتوں پر نگاہیں جمائے رہا۔

شاید اسی منظر نامے کو دیکھ کر احمد اوفلو کو یہ خیال آیا ہو کہ استنبول میں ساحلوں پر صبح صادق سے پہلے رجال اللہ کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے جو اہل استنبول کی داد رسائی کے لیے رات کے آخری پہر مختلف گلی کوچوں میں گشت کرتے ہیں۔ البتہ باسفورس اور خلیج کے دونوں طرف ساحلوں پر ان کی چلت پھرت کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ اوفلو کو تو اس بات پر اتنا یقین ہے کہ وہ کئی بار صبح صادق سے پہلے واک وے کا چکر بھی لگا چکا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک صبح جب میں رجال اللہ کی تلاش میں مختلف وظائف پڑھ کر نکلا مجھے ایک عجیب تجربہ ہوا۔ ایک سفید ریش بزرگ بالکل سفید جبّہ اور سفید پگڑی میں اپنے ہاتھوں میں ایک عصا لیے میری طرف آتے دکھائی دیے۔ مجھ پر مسرت، استعجاب اور کسی قدر دہشت کی کیفیت طاری ہوگئی، مارے دہشت کے میں نے آنکھیں بند کر لیں، مٹھیاں بھینچ لیں، ایسا لگا جیسے ایک روشنی میرے پاس سے ہو کر گزری ہو، بڑی دیر بعد میرے ہوش بحال ہوئے۔ اوفلو کہتا ہے کہ تب سے میں پراسرار لمحات میں ساحل کی طرف نہیں جاتا۔ میں نے

سوچا انسان بھی کتنا gullible اور اوہام پرست ہے اور انسانی ذہن بھی کتنا زرخیز اور کتنا پیچیدہ ہے۔ خود ہی اسطورہ تخلیق کرتا ہے اور خود ہی اس میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

۱۷

ہوجا عثمان

دوسرے دن طے شدہ پروگرام کے مطابق پھر سے مسجد اسمٰعیل آغا کی زیارت کرنی تھی۔ شیخ حمود سے وعدہ کرآیا تھا۔ ہاشم اوران کے احباب بھی ہمارے منتظر تھے لیکن اچانک مصطفیٰ اوغلو کے ٹیلیفون نے پروگرام میں تبدیلی پیدا کردی۔ کہنے لگے آج شب استنبول کے ایشیائی علاقے میں شیخ علی داغستانی کی مجلس ہے۔ اسمٰعیل آغا تو آپ کبھی بھی جا سکتے ہیں، البتہ اس قسم کی خواص کی مجلسیں روز روز منعقد نہیں ہوتیں اور پھران میں داخلہ آسان بھی نہیں ہوتا۔ عصر کے بعد ہوٹل میں تیار رہیئے گا اگر میں نہ آسکا تو ہوجا عثمان آپ کو لینے آئیں گے۔ میں ہاشم کو مطلع کردوں گا کہ وہ شیخ حمود سے آج کی حاضری کے لیے معذرت کرلیں۔ یہ کہہ کر مصطفیٰ اوغلو نے ٹیلیفون منقطع کردیا۔

علی داغستانی؟ میں نے ذہن پر زور ڈالا۔ کیا عجب کہ یہ حمیداللہ داغستانی کے عزیز یا شاگرد ہوں۔ میں نے کوئی سات آٹھ سال پہلے انہیں جبل قاسیون کی مسجد امام مہدی میں نغمۂ ذکر گاتے سنا تھا۔ خاص طور پر جب شیخ اللهم صل علي پر رک کر محمدٍ وعلي سے مصرعۂ ثانی بناتے اور آلِ محمد کہتے ہی دوبارہ مصرعہ اولیٰ میں اللهم صلى علي کو اس طرح جوڑتے کہ علیٰ علیٰ کے صوتی آہنگ سے، جسے پورا مجمع بیک زبان گاتا، مجلس پر ایک انبساط انگیز کیفیت طاری ہوجاتی۔ علی داغستانی سمرقند سے آرہے تھے اور قریب ہی بخارا کی سرزمین میں نقشبندی سلسلہ کے بانی مبانی بہاء الدین نقشبندی کی قبر بھی واقع ہے۔ گویا یہ کہہ لیجئے کہ وسط ایشیاء کے نقشبندی ہیڈ کوارٹر سے ایک مستند روحانی شیخ استنبول کے پراسرار شہر میں وارد ہورہا تھا۔ وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی مصطفیٰ اوغلو ہوجا عثمان کے ساتھ مجھ سے آملے۔ ہوجا جوترک کی زبان میں استاد کا متبادل لفظ ہے کسی محترم

شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں اور مسلسل خطاب کے سبب کبھی کبھی یہ لفظ بعض لوگوں کے نام کا حصہ بھی بن جاتا ہے۔ ہوجا عثمان بھاری بھرکم جسم والے ایک بردبار تاجر نکلے۔ یہی کوئی ساٹھ پنیسٹھ کی لپیٹ میں ہوں گے۔ ان کا منقش ترکی ٹائلوں کا بڑا کاروبار ہے۔

میں نے ان سے پوچھا: آپ درودیوار کی تزئین و آرائش کے لیے منقش ٹائلس بناتے ہیں۔

کہنے لگے ہاں یہ میرا خاندانی بزنس ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اب زیادہ تر وقت اہل اللہ کی خدمت میں گزارتا ہوں۔

آپ درو دیوار کی تزئین و آرائش سے روح کی بالیدگی یا اس کی تزئین و آرائش کی طرف کیسے متوجہ ہوئے؟

فرمایا: جب تک اندرون حُسن اور سکینت سے خالی ہو انسان اپنے گردوپیش کو خوبصورت نہیں بنا سکتا۔ یہ جو آپ استنبول میں قدیم دیو پیکر عمارتیں دیکھتے ہیں تو ان عمارتوں کا جاہ وشکوہ دراصل ہمارے داخلی استحکام اور قلب ونظر کی سکینت اور اعتماد کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اس عہد کی یادگاریں ہیں جب ہم یہ سمجھتے تھے کہ دنیا ہمارے لیے مسخر کی گئی ہے اور دارالخلافہ کی حیثیت سے استنبول کو عالمی دارالحکومت کی حیثیت حاصل ہے۔ جب اندر کا اعتماد جاتا رہا تو ہماری پرشکوہ عمارتیں بھی ویران ہوگئیں۔

ہوجا عثمان واقعی میں ہوجا نکلے۔ ان کی شخصیت کیا تھی جیسے منقش اور دلکش ٹائلوں سے کوئی خوبصورت پیٹرن بنا رکھا ہو۔ گفتگو میں بھی جیومیٹریائی پیٹرن۔ وہی ناپ تول، لفظ لفظ جچا تلا، اپنی جگہ پرفٹ۔ مصطفیٰ اوغلو سے ان کی پرانی دوستی تھی بلکہ کہہ لیجئے ایک زمانے میں مصطفیٰ اوغلو ان کے پیر بھائی بنتے بنتے رہ گئے تھے لیکن آج بھی جذب وسرمستی کی روحانی محفلوں میں وہ انہیں مدعو کرنا نہیں بھولتے۔ ہوجا اپنے حسِ مزاح کے سبب بہت جلد بے تکلف ہوگئے۔ پوچھا کیا تم بھی سیٹلائٹ ٹیلیفون والے ہو؟ پھر خود ہی وضاحت کی کہ ایک زمانے میں وہ اور مصطفیٰ اوغلو دونوں لینڈ لائن ٹیلیفون میں یقین رکھتے تھے۔ یعنی خدا سے رابطے کے لیے شیخ کا توصل استعمال کرتے۔ اب ادھر چند سالوں سے، جب سے موبائل فون کی لعنت عام ہوئی ہے بہتوں کے عقیدے ہل گئے ہیں۔ مصطفیٰ کہتا ہے کہ موبائل اور سٹیلائٹ فون کے زمانے میں شیخ کے توصل کا پرانا نظام فرسودہ ہوگیا ہے۔ اب میری سمجھ میں بات آئی کہ ہوجا کہہ کیا رہے ہیں۔

میں نے کہا ہاں ایسا کیوں نہ ہو، جب ہمارے شیخ طریقت بھی رسولؐ اللہ سے رابطے کے لیے موبائل

فون کا استعمال کرتے ہوں۔ کیا آپ نے شیخ ناظم کا یہ دعویٰ نہیں سنا کہ انہوں نے راست رسولؐ اللہ سے ٹیلیفون پر گفتگو کی ہے۔

شیخ ناظم! اللہ اللہ! انہوں نے شیخ کا نام کچھ اس انداز سے دہرایا جیسے عالم جذب میں ہوں۔ چند ثانیے آنکھیں بند کرلیں، خاموش رہے۔ کیا پتہ کسی نے غلط پروپیگنڈہ کیا ہو یا عالم سکر میں کوئی بات ان کی زبان سے نکل گئی ہو، بڑے رتبے ہیں شیخ ناظم کے، وہ سلسلۂ ذہب کی چالیسویں کڑی ہیں، ان کا سلسلۂ نسب مولانا روم اور عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے، انہیں وہ کچھ نظر آتا ہے جنہیں ہماری آنکھیں نہیں دیکھ پاتیں۔

مصطفیٰ اوغلو جواب تک خاموشی سے کار چلاتے ہوئے ہماری گفتگو سن رہے تھے، کہنے لگے: ہوجا رسولؐ اللہ سے ٹیلیفون پر گفتگو کی بات تو چھوڑ یئے ۲۰۰۸ء میں شیخ ناظم تو ایک صحبت میں یہاں تک کہہ بیٹھے تھے کہ 'تم لوگ جس خدا کی تلاش میں ہو وہ میں ہی ہوں'۔ ان کے مرید اس خبر کو لے اڑے۔ کچھ دنوں تک انٹرنیٹ پر بڑی گرما گرمی رہی یہاں تک کہ نیویارک میں شیخ کے ایک خلیفہ عبدالکریم حقانی کو ایک خصوصی مجلس میں اس مسئلہ پر مریدوں کی تادیب کرنا پڑی۔

فرمایا: یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر شور مچایا جائے۔ اہل حق پر ایسی کیفیات گزرتی ہیں جب خدا اور بندے کے مابین فاصلہ ختم ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ گذشتہ سال علی داغستانی کی مجلس میں سورۃ نجم کی تشریح میں یہ بات تفصیل سے آئی تھی۔ شاید آپ اس میں نہیں تھے بڑا روحانی بیان تھا۔ قاب قوسین کی وہ تفسیر میں نے نہ اس سے پہلے کبھی سنی اور نہ ہی اس کے بعد کہیں پڑھنے یا سننے کو ملی۔ کتنا باریک سا پردہ ہے بندے اور خدا کے درمیان۔ شہہ رگ سے بھی قریب ہے وہ: نحن أقرب إليه من حبل الوريد۔ نہ تھا تو کچھ نہ تھا اور پھر وہ نورِ محمدی میں جلوہ گر ہوا۔ یہ سب سّر الاسرار ہے میرے بھائی۔ ہوجا نے یہ کہتے ہوئے میرے شانے کو شفقت سے تھپتھپایا۔ فرمایا اس راز سے وہی لوگ واقف ہوسکتے ہیں جو تختۂ دار پر انا الحق کہنے کی جرأت رکھتے ہوں۔ جب زندگی اور موت کا حجاب اٹھ جاتا ہے تب انسان پر یہ عقدہ منکشف ہوتا ہے کہ مافي جبتي إلاالله اور پھر بلاساختہ خود اس کی زبان سے اپنی ہی ذات کی تعریف میں اس قسم کے الفاظ نکل پڑتے ہیں کہ سُبحاني ما أعظم شأني۔ یہ کہتے ہوئے ہوجا عثمان خاصے سنجیدہ ہوگئے۔

یا مولانا شیخ ناظم! ہوجا نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ یا مولانا کے کلمات ان کی زبان سے کچھ اس طرح نکلے گویا وہ عقیدت کے شیرے میں لت پت ہوگئے ہوں۔

لیکن یہ تو اہل دل کے ساتھ صدیوں سے ہوتا آیا ہے، شیخ ناظم اس معاملے میں تنہا نہیں۔ میں نے مصطفیٰ اوغلو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہمارے ہاں دہلی کے ایک ثقہ عالم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جو نقشبندی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے اپنے والد شاہ عبدالرحیم کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک دن جب وہ اپنے کچھ مریدوں کے ساتھ سیر کو نکلے اور تلاش حق کے اس سفر میں عصر کا وقت ہو چلا۔ راستے میں ایک مسجد میں نماز کے بعد آپ نے اپنے مریدوں سے پوچھا کہ تم لوگ یہ جدو جہد کس لیے کر رہے ہو، کس کی تلاش میں سرگرداں ہو، سبھوں نے بیک زبان کہا کہ خدا کی تلاش میں۔ یہ سن کر شاہ عبدالرحیم اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرمایا وہ میں ہی تو ہوں اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے لوگوں کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ شاہ صاحب کا یہ روحانی لطیفہ سن کر مصطفیٰ اوغلو کے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ طلوع ہوئی اور ہوجا عثمان کو شاید سنبھالا ملا کہ چلیے شیخ ناظم اس دعویٰ میں تنہا نہیں، ان کی پشت پر صدیقین کی روحانی ثقافت موجود ہے۔

اب ہم لوگ شہر سے باہر نسبتاً ویران علاقے میں آ گئے تھے۔ سڑکیں شاید عدم استعمال کے سبب اسٹریٹ لائٹوں سے خالی اور جا بجا شکستہ تھیں۔ ایک ویران پہاڑی پر ویران خرابے میں کسی نے سفید کاغذ پر Tekke لکھ کر لگا دیا تھا۔ دروازے پر دو بڑی مشعلیں جل رہی تھیں اور نیم شکستہ دروازوں کے اندر، راہدری میں، روایتی شمعدانیں آویزاں تھیں۔ اندر قدرے بڑے ہال میں آرامدہ گدوں پر چاندنی بچھی تھی۔ اعلیٰ درجے کی ترکی قالینوں سے ایک چھوٹا سا فرشی اسٹیج بنالیا گیا تھا جس کے عقب میں دونوں طرف آتش دان روشن تھے۔ کھڑکیوں اور طاقوں میں جا بجا چھوٹی چھوٹی مشعلیں آویزاں تھیں۔ ابھی شیخ علی کی آمد نہ ہوئی تھی سو لوگ چھوٹے چھوٹے گروپوں میں باہم گفتگو میں مصروف تھے۔ ویران خانقاہ، رات کا منظر، شکستہ در و دیوار جنہیں ضروری مرمت کے بعد قابل استعمال بنالیا گیا تھا، آتشدان اور شمع کی روشنی میں ایک پر اسرار منظر پیش کر رہے تھے۔ شیخ کی آمد سے پہلے ہی ایک طرح کی سرّیت نے ماحول کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اچانک کچھ ہلچل سی ہوئی کچھ لوگ راہدری کی طرف بڑھے اور بہتوں نے ہال میں ہی احترام و عقیدت کی کمیں گاہوں میں اپنی پوزیشن لے لی۔ اِدھر شیخ علی فرشی اسٹیج پر تشریف فرما ہوئے اور اُدھر دست بوسی بلکہ قدم بوسی کے لیے قطار لگ گئی۔

کچھ دیر بعد جب ماحول تھما اور اظہار عقیدت کی ساری رسمیں ادا ہو گئیں تو شیخ علی نے ذکر بالجہر سے مجلس کا آغاز کیا۔ خاموش ویرانے میں اللہ ہو اللہ ہو کی صدا کچھ اس شان سے گونجی کہ ہو کی ہر ضرب پر اس کے جواب

میں ندائے غیبی کا اندیشہ شدید سے شدید تر ہوتا جاتا۔ پکارنے والوں نے بہت پکارا۔ غلو اور شدت جذبات میں پھیپھڑے کی ساری ہوا خالی کر دی لیکن جواب سے محرومی رہی۔ اب شیخ علی نے قلبی ذکر کا حکم دیا۔ فرمایا: جیسا کہ آپ واقف ہیں ذکر بالجہر کی حکمت یہ ہے کہ آپ کو روحانی تجربوں کے لیے warm-up کیا جائے۔ اصل ذکر تو قلبی ذکر ہے جو آپ کے دل میں خدا کو کچھ اس طرح بٹھاتی ہے کہ اللہ ہو کے بغیر بھی آپ کا دل خدا کے جلووں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ یعنی پہلے تو جہری ذکر سے دل کی آلائشات کو دھولیں پھر خاموش قلبی ذکر کے ذریعہ اللہ کو اس میں بسائیں اور پھر تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ نہ جہری ذکر ہو، نہ قلبی، آپ کا دل صرف خدا، مجرد خدا، کے جلووں کی آماجگاہ بن جائے۔ فرمایا: اب مراقبہ اللہ ہو شروع ہوتا ہے، اسم ذات کا مراقبہ۔ آنکھیں اور منھ بند رکھیں، دل کی آنکھیں کھول لیں۔

خاموش قلبی ذکر میں اللہ ہو کی ضرب اب براہ راست دل پر لگ رہی تھی۔ حاضرین کی ایک بڑی تعداد بیٹھے بیٹھے، دائیں بائیں، ہلکے ہلکے ہلتی۔ بعض لوگ آنکھیں بند کیے ہوئے دائیں اور بائیں شانے کو کچھ اس زور سے مسلسل جھٹکا دے رہے تھے جیسے ہو کا کوڑا مسلسل ان کے قلب پر پڑ رہا ہو۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد جب قلب کی کسی قدر پٹائی ہو چکی تو شیخ علی نے اللھم صل علي کی صدا بلند کی۔ ہلتے اچکتے شانے دفعتاً رک گئے۔ فرمایا: ہوش دردم! ہمارے مشائخ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ کوئی سانس خدا کے ذکر سے خالی نہ رہے، ہمیں ہر سانس کا حساب دینا ہے، ہمیں اس مرتبہ کو پہنچنا ہے جب خود بخود ہر سانس کے ساتھ ذکر الٰہی شامل رہے۔ دوسرا اصول نظر بہ قدم کا ہے یعنی نگاہیں اپنے قدموں کی طرف ہوں، اِدھر اُدھر دیکھنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس بات کا نوٹس لینا ہے کہ کوئی آپ کے بارے میں کیا کہہ رہا ہے۔ عام مسلمان صرف نماز میں حالت ارتکاز میں رہتے ہیں۔ جب وہ کھڑے ہوتے ہیں تو ان کی آنکھیں سامنے زمین میں گڑی ہوتی ہیں، رکوع میں وہ اپنے پیر کے پچھلے حصّے کو دیکھتے ہیں، حالتِ سجدہ میں ان کی نگاہیں اپنی ناک پر ٹکی ہوتی ہیں اور جب وہ قعدہ میں ہوتے ہیں تو وہ اپنی گود کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ یہ عام مسلمانوں کا ارتکاز ہے جو انہیں صرف نماز میں حاصل ہوتا ہے۔ ہم اہلِ سلوک کے لیے یہ ایک دائمی کیفیت ہے، ہمیں ہر وقت نماز میں رہنا ہوتا ہے۔ حضرت ربیع بن قاسم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنا سر کچھ اس طرح جھکائے رہتے تھے کہ جو لوگ ان سے واقف نہ تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ شاید یہ نابینا ہوں اور یہی مطلب ہے آیت کریمہ قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم کا۔ تیسرا اصول سفر در وطن کہلاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ سالک اپنے

اندرون کا جائزہ لیتا رہے، فخر و مباہات، کبر و غرور، حبِّ جاہ اور حبِّ مال سے کنارہ کشی اختیار کرے اور جب دنیا کی کوئی خواہش اس کے اندرون میں سر اٹھائے تو اس پر لا کی ضرب لگائے اور الا اللہ کے اظہار سے رب کی معرفت تلاش کرے۔ یاد رکھیے خدا کو پانے کا اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں کہ رسول اللہ اور اولیاء اللہ کی محبتوں سے اپنے دل کو سجایا جائے۔ صدقہ و خیرات سے اسے مہمیز کیا جائے۔ اولیاء اللہ کی زیارت کی جائے اور کثرت سے خود کو ذکر و اذکار میں مشغول رکھا جائے۔ اگر ایسا ہوا تو ہم اپنے آپ کو خلوت در انجمن کی حالت میں پائیں گے۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے قلبی ذکر ہماری زندگی کا حصّہ بن جائے گا۔ صوفی بظاہر تو لوگوں کے درمیان ہوتا ہے لیکن درحقیقت وہ کہیں اور ہوتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے رجال لاتلھیھم تجارۃ و لابیع عن ذکر اللہ۔ ہمارے حضرت خواجہ نقشبند کا کہنا ہے کہ ان کے مریدوں کو ایسا ہونا چاہیے کہ بظاہر تو ہاتھ تجارت میں مصروف ہوں لیکن دل سے مسلسل صدائے اللہ ہو آتی ہو۔ اگلا مرحلہ یاد کرد کا ہے: واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون ۔ کثرت سے خدا کو یاد کرو یہاں تک کہ تم اس تک پہنچ جاؤ یا وہ تمہیں اپنے دیدار سے نواز دے۔ تصوف کی اصطلاح میں اس عمل کو مشاہدۂ حق بھی کہتے ہیں۔ اگلی منزل باز گشت کی ہے جب آپ ذکر کے عادی ہو جائیں اور آپ کے دل پر اللہ ہو کا خاموش ذکر ایک فطری عمل بن جائے تو پھر خدا سے یہ کہتے رہیے کہ بارِ الٰہا میں تیرا طالب ہوں تیری رضا چاہتا ہوں۔ اس کیفیت کو اپنے اندرون میں اتنی شدت سے رچا یئے اور بسایئے کہ ہر لمحہ اس کیفیت کی بازگشت سنائی دے۔ اگلی منزل نگہداشت کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس مرحلہ میں سالک منفی خیالات و افکار کو اپنے دل سے دھکے مار مار کر باہر نکالتا ہے۔ خوف، طمع اور اس قسم کے دنیاوی محرکات سے جب قلب پاک ہو جاتا ہے تو فنائے قلب کی منزل آتی ہے۔ پھر دنیا اپنی تمام رعنائیوں کے باوجود مکھی کے ایک پر کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی۔ انسانی جسم بھوک، پیاس اور ان جیسی دوسری بشری حاجات سے بڑی حد تک مستغنیٰ ہو جاتا ہے۔ پھر سالک کے لیے خیالات کے بھٹکنے کا کوئی موقع نہیں رہتا۔ اس کی شخصیت سراپا یادداشت بن جاتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے، ھو معکم اینما کنتم۔ جب یہ مرتبہ حاصل ہو جائے تو ہمارے مشائخ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہم ہر وقت اس بات کا جائزہ لیتے رہیں کہ پچھلا لمحہ خدا کی یاد میں گزرا یا نہیں اور اس نعمت پر مستقل ہماری زبان کلمۂ شکر و استغفار سے تر رہے گویا ہم اب کسی قدر خدا کے حضور پیشی کے لائق ہو گئے ہیں۔ ولتنظر نفس ماقدمت لغد میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ اس مرحلہ کو مشائخ کی اصطلاح میں وقوفِ زمانی

کہتے ہیں۔لیکن ہم اہل دل کا سفر یہیں ختم نہیں ہوتا۔اگلی منزل وقوفِ عددی کی ہے۔نفی یا اثبات کے ذکر کو طاق عددوں میں ادا کیجئے۔اللہ طاق ہے اور طاق عدد کو اس سے خاص نسبت ہے۔ایک سانس میں تین سے اکیس مرتبہ ذکر کیجئے۔رکنا پڑے تو کسی طاق عدد پر رکیں۔پہلے تین سے شروع کیجئے پھر پانچ اور اسی طرح رفتہ رفتہ ایک سانس میں اکیس مرتبہ ذکر کا ہدف حاصل کیجئے۔عددوں کے سرالاسرار سے صرف خواص کو واقف کرایا گیا ہے یا وہ لوگ جو راسخون فی العلم ہیں۔آپ کا کام اکیس کے عدد تک پہنچنا ہے اور اگر پھر بھی مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہمارا دل ابھی خاموش قلبی ذکر سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہو پایا ہے۔ سالک کو چاہیے کہ ازسرِنو اپنے آپ کو پوری آمادگی کے ساتھ اس راہ پر ڈالے۔البتہ اگر وقوفِ عددی نتیجہ خیز ہو تو سالک کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو آخری منزل یعنی وقوف قلبی کے لیے تیار کرے۔اس مرحلہ میں قلب کو خدا کے علاوہ کسی اور چیز کی حاجت نہیں رہ جاتی۔مولانا رومی نے سچ کہا ہے کہ خدا کی حمد تو گائے اور گدھے بھی کرتے ہیں پھر انسان بھی اگر اسی بےشعوری کے ساتھ ذکر کریں تو انسانوں اور جانوروں میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔

عزیزانِ گرامی! ہمیں خواجگانِ نقشبندیہ نے یہ تعلیم دی ہے کہ ہم ذکر الٰہی میں اخص الخواص کا مقام حاصل کریں۔یقیناً یہ کوئی آسان کام نہیں لیکن مشائخ نقشبندیہ کے توسط اور خواجگان کی پاکیزہ ارواح کے توصل سے یہ سب کچھ بہت آسان ہو جاتا ہے۔شیخ نے اس جملے پر خاص زور دیا، نگاہیں چھت کی طرف اٹھائیں، ایک لمحہ کو توقف کیا اور پھر بآواز بلند فرمایا: الٰہی بحرمت خواجگانِ نقشبند اور پھر اللھم صلّ علي ...... محمدٍ وعلي ایک خاص لحن میں اہل مجلس کی زبان پر بیک وقت جاری ہو گیا۔

کچھ دیر قلب ونظر کو صلوٰۃ وسلام کے جھٹکے لگتے رہے، پھر فرمایا: اللھم صلّ علي محمد گویا یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب صحبت کا اگلا حصہ شروع ہوا چاہتا ہے۔حاضرین پھر ہمہ تن گوش ہو گئے۔فرمایا: توصل میں بڑی قوت ہے۔اس عمل کے ذریعہ آپ کائنات کی قوت محرکہ سے اپنا تعلق قائم کر لیتے ہیں۔رسولؐ اللہ سے لے کر ان کے رفیقِ خاص ابوبکر صدیق اور جعفر صادق سے لے کر شیخ بہاءالدین نقشبندی اور پھر سلسلۂ ذہب کے تمام بزرگان بشمول شیخ عبداللہ داغستانی اور ہمارے مولانا شیخ ناظم نقشبندی، اللہ ان کی عمر دراز کرے، آپ کی پشت پر آ کھڑے ہوتے ہیں۔تمام خواجگان نقشبند کی ارواحِ مطہرہ ہر لمحہ آپ کی مدد اور حفاظت کے لیے مستعد رہتی ہیں۔اور ہمارے شیخ ناظم جن کا تعلق شیخ عبدالقادر جیلانی سے بھی ہے ایک اعتبار سے ان دو بڑے

سلسلوں کے تمام کمالات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اللہ اللہ کتنے خوش نصیب ہیں آپ لوگ۔ المدد المدد یا خواجۂ خواجگان المدد یا عبدالقادر جیلانی، شیئاً للہ! یا رسول اللہ! شیخ نے الحاح وزاری کے ساتھ ارواحِ مقدسہ کو آواز دی۔ ان کے چہرے پر جلال واضطراب کے ملے جلے جذبات ابھرے۔ اکثر حاضرین نے روحانی طور پر خود کو مشتعل محسوس کیا اور پھر بے ساختہ مجلس پر اللھم صل علي ...... محمد و علي کا ورد طرب انگیز جاری ہوگیا۔

پھر فرمایا شیخ سے توصل کے لیے بہترین وقت تہجد کے بعد کا ہے۔ اگر دو وقت توصل کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ توصل کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ایک بار سورۃ فاتحہ اور تین بار سورہ اخلاص پڑھیں۔ پھر کہیں کہ الٰہی میں نے جو کچھ پڑھا اس کا ثواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مقدس کو پہنچا دے، تمام انبیاء ومرسلین کی ارواح، ملائکہ مقربین، صحابہ وتابعین، اولیاء وصالحین خصوصاً خواجگانِ نقشبند اور ہمارے شیخ مولانا ناظم کے استاد شیخ عبدالقادر داغستانی کی روح کو پہنچا دے۔ پھر کہیں: الٰہی بحرمت شفیع المذنبین! الٰہی بحرمت غوث دوراں قطبِ زماں شیخ بہاء الدین نقشبندی وجملہ نقشبندی شیوخ۔ بہتر ہے کہ شیوخ کا فرداً فرداً نام لیا جائے۔ جو لوگ پابندی سے اس عمل کو دہراتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ ایسا کرنے سے شیخ سے توصل نہ بھی حاصل ہو تو کم از کم ابتدائی مرحلے میں اسے شیخ کی توجہ حاصل ہو جاتی ہے۔

عزیزانِ گرامی! توجہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ شیخ اپنے تصرف سے تمہارے قلب کو تبدیل کر دے، لیکن یہ کیفیت دیرپا نہیں ہوتی۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تم شیخ کی اطاعت کرو، اس کی پسند وناپسند کا خیال رکھو، اسے اپنے دل میں بساؤ، اس کو راضی رکھو، اس سے خود بخود شیخ کے دل میں تمہاری محبت پیدا ہو جائے گی تمہارا خیال شیخ کے دل میں لگا رہے گا۔ سو جب حق تعالیٰ کی نظر شیخ کی طرف ہوگی اور وہ شیخ کو اپنی خصوصی توجہ سے نوازے گا تو جب تم اس کے دل میں پہلے سے بیٹھے رہو گے تو تمہیں بھی اس عطائے حق سے اپنا حصہ مل جائے گا۔

توصل، توجہ اور رابطۂ شیخ کے لیے خواجگانِ نقشبند کے مزاروں کی زیارتیں حصولِ مقصد کے لیے مجرب سمجھی گئی ہیں۔ ہمارے مولانا شیخ ناظم کو ان کے شیخ عبدالقادر داغستانی نے چھ ماہ تک شیخ عبدالقادر جیلانی کے مزار مبارک پر مراقبہ کا حکم دیا تھا۔ شیخ کی ذات میں آپ جو کشف وکرامات دیکھتے ہیں یہ ان ہی بزرگوں کی ارواح کے فیض کا نتیجہ ہے۔ ہمارے شیخ وہ کچھ دیکھتے ہیں جس کے دیکھنے کی عام آنکھیں تاب نہیں لاسکتیں۔ وہ

ہمیں مستقبل میں پیش آنے والے واقعات وحوادث سے بھی آگاہ کرتے ہیں اوران کی نگاہیں اپنے شیوخ کے فیوض کے سبب ملائے اعلیٰ پر بھی ہوتی ہیں۔ یہ جو آپ اللہ ہو کا ذکر کرتے ہیں اسے معمولی مت سمجھیے۔ کُن کی آواز نے کائنات تخلیق کی اور ہو کی سرمست فقیرانہ صدا اس کے مستقبل کا فیصلہ کرتی ہے۔ نادان لوگ کہتے ہیں کہ تم یہ کیا اللہ ہو اللہ ہو کرتے ہو، یہ کون سا اسلام ہے۔ نادان تو نادان ہی ہوتے ہیں وہ اس بات سے پریشان ہیں کہ اصل اسلام لوگوں میں مقبول رہا ہے۔ ایک ایسا اسلام جو لوگوں کو اتباع سکھاتا ہے۔ جہاں لوگوں کے لیے اپنے ذاتی پسند و ناپسند کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ رسولؐ کا اسلام ہے، اولیاء اللہ کا اسلام ہے جو ان کے قدموں میں بیٹھنے سے ہی ملتا ہے۔ ہمارے نبیؐ نے کہا ہے کہ آخری دنوں میں مسلمان بہتّر فرقوں میں بٹ جائیں گے، آج وہی ہو رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ میں کمالسٹ مسلمان ہوں، کوئی کہتا ہے میں سیکولر مسلمان ہوں، کوئی کہتا ہے کہ میں مسلمان تو ہوں لیکن ساتھ ہی کمیونسٹ بھی ہوں، ڈیموکریٹ بھی ہوں، فیمینسٹ بھی ہوں۔ اللہ اللہ کتنی قسمیں ہوگئی ہیں مسلمانوں کی۔ یہ سب گمراہ ہیں، اصل اسلام رسول اللہ کا اسلام ہے جسے خواجگانِ نقشبند کے سلسلۂ ذہب نے ہمیں سینہ بہ سینہ پہنچایا ہے۔ آج ساری دنیا اصل اسلام سے خوفزدہ ہے۔ اب یہودیوں کو لیجیے وہ کہتے ہیں کہ تمہارے مسلمان رہنے سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں لیکن قرآن میں کچھ ایسی آیتیں ہیں جو ہمارے لیے قابل قبول نہیں۔ ان کا مطالبہ ہے کہ ہم إنَّ الدین عنداللہ الإسلام پر یقین نہ رکھیں بھلا بتایئے چودہ سو سالوں سے ہم جمعہ کے خطبہ میں یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام کے علاوہ کوئی دین مستند نہیں ہے، خدا کے ہاں قابل قبول نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ موڈریٹ مسلمان بنو۔

انہیں ہمارے لباس پر بھی اعتراض ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم دیکھنے میں ان ہی شیاطین کی طرح لگیں۔ میں کہتا ہوں کہ تمہاری base-ball hat تمہیں مبارک، تمہارے سر base ball کی طرح لگتے ہیں، روحانیت سے خالی۔ تم ان پر جو چاہو رکھو، وہ چاہتے ہیں کہ ہم یہ ڈھیلے ڈھالے لباس ترک کر دیں جس کو پہن کر مرد کی وجاہت نمایاں ہوتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی طرح تنگ چپکی ہوئی جینس میں ہمارا بھی دورانِ خون رک جائے اور رفتہ رفتہ اہل مغرب کی طرح ہم بھی اپنی مرانگی کھو دیں۔ دراصل انہیں مردوں سے خوف آتا ہے اور مسلمان، مرد ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے گرد مردوں کے بجائے صرف عورتیں نظر آئیں۔ مرد-عورتیں، جن پر آسانی سے قابو پایا جا سکے۔ اور پھر یہی لوگ مرد اور عورت کی برابری کا نعرہ لگاتے ہیں۔ عورتوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ مردوں کی طرح رہیں۔ یہ شیطانی اسکیم ہے، دنیا پر کنٹرول کی شیطانی اسکیم۔

کیا آپ کو نہیں معلوم کہ خدا کا آپ سے یہ وعدہ ہے کہ جب تک اس سر زمین پر ایک مرد مومن بھی موجود ہوگا خدا کے نور کو کوئی نہیں بجھا سکتا۔ جب تک مسلمانوں کا فرقۂ ناجیہ اس سر زمین پر باقی رہے گا اور رسولؐ کی سنت جاری رہے گی باطل کو کامیابی نہیں مل سکتی۔ آج سنت پر عمل کرنے والوں میں نقشبندی مریدوں سے بڑھ کر اور کون ہے؟ ہم سنت کے مطابق پہنتے اوڑھتے، کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے ہیں۔ اس بات کا التزام کرتے ہیں کہ آپؐ کی کوئی سنت ہم سے چھوٹی نہ رہ جائے۔ رسولؐ کے سچے پیروکار کبھی جھکائے نہیں جاسکتے۔ ان کے دل خدا کے نور سے پُر ہوتے ہیں۔ ان کی پشت پر کائنات کی طاقت ہوتی ہے۔ اگر وہ جلال میں آجائیں تو چشم زدن میں منظر نامہ بدل جائے لیکن ہمیں اپنے جلال کو قابو میں رکھنے کا حکم ہے۔ کیا آپ ان حدیثوں سے واقف نہیں کہ صحابۂ کرام کے سامنے کئی بار ایسے مواقع آتے جب ان کے لیے رسولؐ اللہ کے جلالی لمحات میں آپؐ کے سامنے بیٹھنا ممکن نہ ہوتا۔ رسول اللہ جب عالمِ جلال میں بولتے تو ایسا لگتا کہ پوری کائنات کانپ رہی ہو۔ یہ ہے اہلِ ایمان کا وہ جلال جس کے ہم وارث ہیں۔ یہ ہمیں اپنی طرح عورت بنانا چاہتے ہیں جہاں ان کے بچے کہتے ہیں میرے باپ تو بالکل میری ماں کی طرح ہیں۔ ان سے ڈر کیا لگے وہ تو خود میری ماں سے ڈرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی بیماری ہے، ایک وبا ہے جو مغرب میں عام ہے۔ اس کا علاج حکیمی دواؤں اور ویاگرا سے نہیں ہوسکتا۔ یہ ہماری موجودہ حالت دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ امت مسلمہ بھی نامردی کا شکار ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ ابھی اللہ کے کچھ بندے اس سر زمین پر باقی ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو پردۂ خفا سے باہر آنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔

بھائیو! حالات سخت ہیں۔ ہم لوگ آخری زمانے میں ہیں۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ آخری زمانے میں جب میری سنت بھلائی جارہی ہوگی...... کیا فرمایا آپؐ نے؟ 'سنت'! سنت ہے کیا؟ کیا داڑھی رکھنا سنت ہے؟ جی ہاں بالکل۔ کیا عمامہ باندھنا سنت ہے؟ بالکل۔ کیا مسواک کرنا سنت ہے؟ یقیناً۔ باطن کے ساتھ ساتھ سنت کے مطابق اپنے ظاہر کو آراستہ کیجیے۔ بعض نادان کہتے ہیں کہ ہمارے ظاہر کو نہ دیکھو ہمارے دلوں کو دیکھو۔ یہ ایک مغالطہ ہے، شیطان کا وسوسہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر رسولؐ اللہ آج ہمارے درمیان ہوتے تو یہ کرتے، وہ کرتے؟ اس طرح رہتے اور اس طرح پہنتے۔ گمراہو یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا رسولؐ اللہ کفار کے لباس کو اختیار کرتے، ان کی طرح دکھائی دیتے؟ استغفر اللہ کیسی خباثت بھری باتیں ہیں یہ سب، جو یہ گمراہ مغرب زدہ مسلمان کرتے ہیں۔ ان وساوس سے اپنے دلوں کو پاک کیجیے۔ اسلام میں اگر مگر کی کوئی گنجائش

نہیں۔اصلی اسلام تو ایک ہی ہے۔یاد رکھیے! اسلام میں پانچ سو نیکیوں کو اختیار کرنے اور آٹھ سو برائیوں سے دور رہنے کی تعلیم ہے، جو لوگ اس راستے پر چلنا چاہتے ہیں خدا ان کی رہنمائی کرتا ہے۔آج اگر کوئی شخص چاہے کہ وہ اسلام پر پوری طرح عامل ہو، سنت کی پاسداری کرے تو اس کا سڑکوں پر چلنا دشوار ہو جائے۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ آنے والے دنوں میں سنتی لباس پہننا اتنا ہی مشکل ہوگا جیسے کوئی شخص اپنے سر پر آگ لے کر چل رہا ہو۔آج ہم اسی دور سے گزر رہے ہیں۔سوٹ ٹائی میں ملبوس آپ جدھر جائیں ہر طرف امان دکھائی دیتا ہے لیکن سنتی لباس میں نکلنے والوں پر ساری دنیا کی سوالیہ نگاہیں لگی ہوتی ہیں۔سنت پر عامل رہنا کچھ آسان نہیں۔یہ ایک بڑا مشکل کام ہے لیکن ہم اسے کسی قیمت پر ترک نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد اللھم صل علیٰ/ محمد وعلیٰ/ آل محمد و سلم، اللھم صل علی/ محمد وعلیٰ کے دائروی ذکر نے ایک بار پھر محفل کو اپنی گرفت میں لے لیا۔کچھ دیر اللہ حق، اللہ حی حی حی..... حق حق حق....یا حی و یا قیوم کی صدا سے مجلس گونجتی رہی۔پھر شیخ نے أشهد أن لا إله إلا الله و أشهد أن محمداً عبده و رسوله کا کلمہ بآواز بلند پڑھا اور لوگ اگلے افادات کے لیے تیار ہو گئے۔

شیخ کے جلال میں اب کسی قدر اضافہ ہو چکا تھا۔فرمایا: جو لوگ ہمیں مٹانے کے درپے ہیں وہ جان لیں کہ اللہ نے ہمارے اندر ایک نور رکھ دیا ہے جسے فنا نہیں کیا جا سکتا۔تمہیں کیا معلوم کہ دنیا نور سے بنائی گئی ہے۔ تم اسے ایٹم کہو یا مالیکیول، شمس، وقمر میں، ارض وسماوات میں نور کی کارفرمائی ہے۔ایٹم کے ایک ذرہ کو جب سائنس دانوں نے تین حصوں میں توڑا تو پتا چلا کہ یہ الگ ہو کر بھی ایک دوسرے سے مسلسل رابطے میں تھے۔ اس کہکشاں سے باہر اور اس کے اندر ہر چیز نور کا اظہار ہے اور ہمارے اندر وہی نورِ محمدی جو دراصل خدا کا نور ہے، تخلیقِ کائنات کا نور ہے، خواجگان اور انبیاء کے سلسلے سے آیا ہے۔اللہ خود نور ہے، اللہ نور السمٰوات والارض۔وہ جسے چاہتا ہے اپنے نور سے ہدایت دیتا ہے۔ہمارے بغیر یہ کائنات باقی نہیں رہ سکتی۔شیاطین کی اسکیم ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی۔

حق اور باطل کی آخری معرکہ آرائی کا وقت آپہنچا ہے۔مہدی علیہ السلام اپنے ننانوے خلفاء کے ساتھ اذنِ ظہور کے منتظر ہیں۔شیخ ناظم حقانی نے ہمیں یہ بشارت دی ہے کہ ان کی آمد کا وقت اب قریب آپہنچا ہے۔ وہ جزیرۃ العرب کے ربع الخالی میں ایک بہت گہرے غار کے اندر پناہ گزیں ہیں۔ہزاروں جن ان کی حفاظت پر مامور ہیں، عنقریب آخری معرکہ آرائی یعنی آرمیگادون کا بگل بجنے والا ہے۔دنیا تہہ و بالا ہو جائے گی۔البتہ

مومنین کوکوئی زک نہیں پہنچے گی۔ جولوگ طریقۂ نقشبندیہ سے وابستہ ہیں وہ دراصل سفینۂ مہدی پر سوار ہیں جوفی الواقع خدا کی کشتی ہے۔ اور جس کا پتوار خود خدا نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہو اور جس کام پر اولیاء اللہ مامور ہوں انہیں کس بات کا ڈر ہے! ألاإن اولياء الله لا خوف عليهم و لاهم يحزنون ۔ یہ کہتے ہوئے آپ نے چند لمحات کا توقف اختیار کیا پھر بآواز بلند ایک خاص انداز سے اللہ اللہ اللہ کی صدا بلند کی۔ پھر کسی قدر ترنم سے أستغفر الله أستغفر الله کا ورد شروع ہوا۔ پھر استغفر کو خاص زیر و بم کے ساتھ ادا کیا گیا۔ تمام اہل مجلس استغ ...فِ... رواللہ کا ورد اس طرح کرتے رہے جیسے پاس انفاس میں ہُو کی ضرب لگاتے ہیں۔ پھر ختم خواجگان کی مروجہ دعاؤں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پوری فضایا مفتح الأبواب، يا مسبب الأسباب يا غياث المستغيثين کی گریہ وزاری سے گونجتی رہی۔ دفعتاً شیخ نے انگشت شہادت بلند کی۔ فرمایا: وأفوض أمري إلي الله إن الله بَصيرِ بالعباد ۔ پھر اپنی انگشت شہادت کا رخ زمین کی طرف کیا، ایک لمحہ توقف کے بعد فرمایا الرابطة الشريفة مع السيد شيخ محمد ناظم الحقاني وسيدى سلطان الأولياء السيد الداغستاني ۔ وقفہ وقفہ سے مختلف اذکار اور فاتحہ کا سلسلہ چلتا رہا۔ کبھی و رفعنالك ذكرك کی صدا بلند ہوتی اور کبھی وعلمتنى من تأويل الأحاديث والی آیت پڑھی جاتی۔ یہاں تک کہ ختم خواجگان پر مجلس اپنے اختتام کو آ پہنچی۔

ہاؤہوُ کے اس طرب انگیز ہنگامے میں وقت کچھ اس تیزی سے گزرا کہ پتہ ہی نہ چلا کہ رات کے دو بجنے والے ہیں۔ اہل مجلس پر نشاط اور وارفتگی کی وہی کیفیت طاری تھی۔ اجتماعی ماحول پر تھکن یا بوریت کا کوئی احساس نہ تھا بلکہ بعضے تو ایک عالم سرشاری میں خود کو پہلے سے کہیں زیادہ ہشاش بشاش اور اندرونی طور پر کہیں توانا اور تونگر محسوس کر رہے تھے۔ یہ مجلس ذکر جو گاہے کلمۂ ہُو کی صدا سے گونجتی اور جس پر کبھی ذکر قلبی کی خاموشی سکوت طاری کر دیتی، گاہے مجلس وعظ کا رخ اختیار کر لیتی، مختلف رنگ و آہنگ کے سبب سننے اور سنانے والے کو یکساں شرکت کا احساس دلاتی رہی۔ شیخ علی نے جب أفوض أمري إلي الله کہتے ہوئے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف بلند کی تھی تو نیم بند آنکھوں والے بہت سے مریدوں کے ظاہری احوال سے ایسا لگتا تھا جیسے شیخ علی کے توسط سے وہ خدائے بزرگ و برتر کے رابطے میں آ گئے ہوں۔ کم از کم ہوجا عثمان کے چہرے پر تو وہی کیفیت اور طمانیت تھی جو مومن کو اپنے امور خدا کے سپرد کرنے کے بعد ہوتی ہے۔ البتہ جب شیخ علی نے زمین کی طرف انگشتِ شہادت کا رخ کیا اور اپنے شیخ سے رابطے میں آنے کی کوشش کی تو اس میں اس کیفیت کا

فقدان تھا۔ وہ خود بھی جلد ہی کچھ رواروی میں اس مرحلے سے گزر گئے۔ کہتے ہیں کہ رابطة مع الشيخ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ شیخ وقت یا خواجگانِ خواجہ اور اس توسط سے رسول اللہ سے رابطہ خال خال ہی کسی کے حصے میں آتا ہے لیکن مریدوں کو یہ حکم ہے کہ وہ مایوس نہ ہوں۔ اپنی سی کوشش کرتے رہیں۔

مجلس کا اختتام ایک غیر معمولی بشارت پر ہوا تھا۔ لوگ پر امید تھے۔ شاداں وفرحاں ایک طرف اپنے امور خدا کے سپرد کردینے کا اطمینان تھا اور دوسری طرف خواجگانِ خواجہ کی اعانت اور استعانت، رسول اللہ کی پشت پناہی اور اس حوالے سے خدا کی حمایت پر بھی کسی قدر بھروسہ تھا جوان کی مدد کے لیے اب بہت جلد مہدی کوظہور عام کی اجازت دیا چاہتا تھا۔ سو لوگ کسی قدر مطمئن تھے کہ آنے والا اب جلد ہی آئے گا اور ان کے حالات درست کردے گا۔ لیکن ہمارے ہوجا عثمان کو نہ جانے کیا سوجھی کہ شیخ علی سے الوداعی مصافحہ کے وقت ان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ملتجیانہ لہجہ میں کہنے لگے: یا سیدی اب حالات سہے نہیں جاتے، شیخ ناظم سے کہئے کہ وہ خدا کے حضور دعا کریں، شیخ نقشبندی سے کہیں، پیران پیر سے درخواست کریں اور سلسلۂ ذہب کے تمام شیوخ کو اس بات پر متحرک کریں کہ وہ رسول اللہ کی خدمت میں ہماری بے بسی کا مقدمہ رکھیں۔ شیخ ناظم غوث اعظم کے چہیتے ہیں انہوں نے بغداد میں ان کے روضہ کی مجاوری کی ہے، وقت گزارا ہے، فیض حاصل کیا ہے۔ اللہ اللہ کیا مقام ہے غوث اعظم کا تمام ولیوں کی گردنیں ان کے قدموں کے نیچے ہیں۔ اگر وہ مچل جائیں تو عجب نہیں کہ خدا مہدی کوظہور کی اجازت دے دے۔ بہت ہوگیا یا سیدی، ظلم کی انتہا ہوگئی۔ غزہ پر اسرائیلی بمباری کا اکیسواں دن ہے، ساری دنیا خاموش تماشائی ہے۔ افغانستان تباہ ہو چکا، عراق ایک مسلسل خلفشار اور خانہ جنگی سے دوچار ہے، کھاتے پیتے متمول خاندان تباہ ہوگئے۔ یتیم معصوم بچے اور بے سہارا عورتیں رفیوجی کیمپوں میں پناہ گزیں ہیں۔ دنیا بھر میں مہاجرت، پناہ گزینی یا رفیوجی بن جانے والے لوگوں میں اسّی فیصد کا تعلق امت محمدیہ سے ہے۔ عالم اسلام پر امریکی استبداد کے شکنجے سخت ہیں۔ اب تو کوئی اس صورت حال پر احتجاج بھی نہیں کرسکتا، مبادا گوانتا ناموبے کی عقوبت گاہیں اور اس قسم کے بے شمار تعذیبی مراکز اسے نشانِ عبرت بنا کر رکھ دیں۔ اگر اب بھی مہدی نہ آئے تو آخر کب آئیں گے؟ یہ کہتے ہوئے ہوجا عثمان کا گلا رندھ گیا۔ انہوں نے شیخ علی کے ہاتھ کو فرط جذبات میں اپنی نم آنکھوں اور پیشانی سے ایک بار پھر مس کیا۔ سر اٹھایا، ان کی طرف دیکھا، شاید وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوں مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔

شیخ علی نے ان کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا: عثمان ہمیں صبر کا حکم دیا گیا ہے۔ ہمیں امر ربی میں مداخلت

کی اجازت نہیں۔ یہ ایک ایسا بھید ہے جسے اس سرزمین پر اس وقت شیخ ناظم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ ہمارے خواجگان سے یہ صورتِ حال مخفی نہیں۔ وہ ان مصلحتوں سے خوب واقف ہیں۔ انہیں پتہ ہے کہ ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ انتظار کرو ہوجا انتظار! کہ ہمارا کام انتظار کرنا ہے، صبر کیے جانا ہے۔ اولیاء اللہ کو بڑے کمالات سے نوازا گیا ہے اور ہمارے خواجۂ خواجگان پر تو رسول اللہ کا خاص کرم ہے۔ وہ چاہیں تو چشم زدن میں اپنی جلالی قوتوں سے دشمنوں کو تباہ و برباد کر دیں۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

ہوجا عثمان ایک لمحہ تک مبہوت شیخ علی کی طرف دیکھتے رہے۔ چار و ناچار اٹھے، بھاری قدموں اور دل کے بوجھ کے ساتھ باہر آئے۔ ہوجا کے اضطراب اور امت کے لیے ان کی فکرمندی نے میرے دل میں ان کے لیے احترام و محبت کے جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ مجھے ایسا لگا کہ ہوجا ایک طالب صادق ہوں، حالات سے پریشان، راستے کی تلاش میں سرگرداں۔ کار میں بیٹھتے ہوئے میں نے فرط محبت و احترم میں ان کا ہاتھ دبایا اور بے ساختہ میری زبان سے نکلا الله يحفظكم يا شيخ عثمان۔ پوچھا تم اپنی حفاظت اور دافع بلیات کے لیے کون سی دعا پڑھتے ہو۔ میں نے کہا میری دعاؤں میں سب سے محبوب دعا اللهم أرني الأشياء كما هي کی ہے جو دعائے محمدی بھی ہے۔ یعنی بارِالٰہا مجھے چیزوں کی اصل حقیقت پر مطلع کر دے۔ کہنے لگے بڑے پتے کی بات ہے۔ یہ مقام آسانی سے ہاتھ نہیں آتا۔ اولیاء اللہ کو اللہ نے چیزوں کی حقیقت پر مطلع کر رکھا ہے۔ ہمارے شیخ ناظم کو اللہ نے یہ ملکہ دیا ہے، وہ سیکڑوں میل دور مریدوں کے حال پر مطلع ہو جاتے ہیں۔ ان کی داد رسائی کرتے ہیں، ایسے کئی واقعات میرے علم میں ہیں کہ عین وقت وصال مریدوں نے دیکھا کہ شیخ انہیں جنت میں لے جانے کے لیے آ گئے ہیں۔

جنت میں؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

فرمایا: ہاں! عالم نزع میں حجابات ہٹ جاتے ہیں۔ مرنے والا جو کچھ دیکھتا ہے وہ ہم نہیں دیکھ سکتے۔ ایسے کئی واقعات پیش آئے ہیں جب مرنے والے پر موت کی دہشت طاری تھی لیکن اچانک اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر آئی، اس نے کہا لو وہ آ گئے ہمارے شیخ۔ لیکن یہ کیسے پتہ چلا کہ مرنے والے نے کیا دیکھا؟

وہ اپنے شیخ کو دیکھتا ہے تمہیں نہیں معلوم۔ اصل میں تم اس دنیا کے آدمی نہیں۔ مرتے وقت جانکنی کی صعوبت بہت شدید ہوتی ہے لیکن اگر تم نے کسی صاحب کمال کے ہاتھ پر بیعت کر رکھی ہے تو تمام مراحل

آسان ہوجاتے ہیں کہ تب ملک الموت تمہاری روح قبض نہیں کرتا بلکہ تمہارا شیخ تمہاری روح نکال کر ملک الموت کے حوالے کر دیتا ہے۔ ایسا اس لیے کہ تم نے شیخ کو بیعت کے سبب اپنے اوپر مکمل تصرف کا اختیار دے رکھا ہے۔ یہ تو عام شیخ کی بات ہے ہمارے شیخ ناظم کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ تو قبر میں بھی اپنے مردوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ جب منکر نکیر سوال وجواب کے لیے آتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تمہارا رب کون ہے؟ دین کیا ہے؟ تو شیخ ناظم چپکے سے اپنے مرید کے کان میں سرگوشی کر دیتے ہیں۔ میں اسی لیے تو تم سے کہتا ہوں کہ تم بھی جلد سے جلد کوئی شیخ ڈھونڈ لو، اس طرح بے آسرا نہ پھرو۔ زندگی، موت کا کچھ بھروسہ نہیں۔

یہ کہتے ہوئے ہوجا عثمان نے میرا شانہ تھپتھپایا۔ میں نے دیکھا کہ وہ خاصے سنجیدہ ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے لیے شیخ کی نشاندہی اور میری نجات کا پختہ انتظام کر دیں میں نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا اچھا یہ تو بتائیے مہدی کا سلسلۂ نقشبندیہ میں آنا تو طے ہے جیسا کہ رسول اللہ نے عالم بیداری میں شیخ ناظم کو بشارت دی ہے اور جیسا کہ احمد سرہندی کا بھی اصرار ہے لیکن یہ کیسے طے پائے گا کہ اس کا تعلق نقشبندیوں کے کس طائفے سے ہوگا۔ وہ حقانی نقشبندی ہوگا یا خالدی، مجددی ہوگا یا اسلمی، کہ اگر وہ خالدی سلسلہ میں آیا تو ناظم حقانی کا دامن تھامنے سے کیا حاصل؟ پھر تو محمود آفندی کے پاس چلنا چاہیے۔ مگر وہ تو کہتے ہیں کہ مہدی اس صدی میں نہیں آئے گا۔

میرے اس اعتراض پر ہوجا عثمان کچھ خاموش سے ہوگئے۔ ایسا لگا جیسے وہ کسی جواب کی تلاش میں ہوں۔ میں نے سوچا پتہ نہیں ہوجا عثمان سے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو۔ کیوں نہ چلتے چلاتے ان کے ہاتھوں میں چند سوالات تھما دوں کہ سوالات اگر اپنی تمام تر ابعاد کے ساتھ مرصع ہوجائیں تو سالک کو حقیقت تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی۔ سو یہ سوچ کر میں نے ہوجا سے کہا۔ ہوجا ایک بات بتاؤں؟ انہوں نے نیم بند آنکھوں سے میری طرف دیکھا، جیب سے چھوٹی سی خوبصورت تسبیح نکالی اور اسے انگلیوں سے حرکت دیتے ہوئے سراپا استعجاب بن کر بیٹھ گئے۔

میں نے کہا: ہوجا! سچ کہہ دوں! اب کوئی نہ آئے گا۔ آنے والا آچکا۔ وہ خدا کا آخری رسولؐ تھا جو خدا کا آخری پیغام ہمارے حوالے کر کے جاچکا ہے۔ اب دنیا کی تعمیر واصلاح کا کام ہمیں انجام دینا ہے۔ ہم جو اس کے متبعین میں ہیں، اس کے نائبین میں ہیں ہمارے ہاتھوں میں قرآن مجید کی شکل میں وحی کی تجلی تھما دی گئی ہے۔ یہ سب کام اب ہمیں انجام دینا ہے۔ کوئی مسیح، کوئی مہدی اور کوئی امام غائب اب آنے والا نہیں۔ ہوجا

ذرا سوچو توسہی امت کی چودہ سوسالہ تاریخ میں کئی ایسے نازک مراحل آئے جب امت کا چراغ گل ہوا چاہتا تھا۔ عین وفات نبوی کے بعد امت کنفیوژن کا شکار تھی۔ پھر فتنۂ قتل عثمان نے ہماری اجتماعی زندگی کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ پھر وہ دن بھی آیا جب حسین عالم غربت اور بے بسی میں شہید کر دیئے گئے۔ جب حسین کی شہادت پر آسمانی مداخلت نہ ہوئی۔ جب منگولوں کے ہاتھوں سقوط بغداد کے بعد بھی کسی مہدی کا ظہور نہ ہوا، مغل سلطنت کا چراغ بجھا، ترک خلافت کی بساط لپیٹ دی گئی، ہر حادثہ ایک سے بڑھ کر تھا جس نے ہماری اجتماعی زندگی کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا، لیکن مہدی جب بھی اذن کا منتظر رہا۔ ذرا سوچو توسہی جب جگر گوشۂ رسولؐ حسین کی مدد کے لیے آسمانی مداخلت نہ ہوئی تو ہم جیسے گنہگاروں کے لیے کیوں کر ہوگی۔

ہوجا نے حیرت سے میری طرف دیکھا ایسا لگا جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ نیم بند آنکھوں کے ساتھ چند لمحے توقف اختیار کیا پھر میری حفاظت اور نصرت کی دعا فرمائی۔ اپنی خوبصورت قیمتی تسبیح ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بولے: تبرک ہے تبرک! اسے رکھ لو ذکر میں کام آئے گی۔ میں تمہاری کتابیں پڑھوں گا اور تم میری تسبیح پر ذکر پڑھنا۔

ہوجا کی یہ پیشکش سن کر اچانک مجھے اپنے پرانے صوفی دوست ہاشم مہدی یاد آئے جن کے گھر میں ایک بار ابن تیمیہ کی کتابیں دیکھ کر جب میں نے حیرت کا اظہار کیا تب انہوں نے کہا تھا کہ آج کل میں ابن تیمیہ کو پڑھ رہا ہوں اور ابن تیمیہ قبر میں میری کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ مزید فرمایا کہ ایک دن میں نے خواب دیکھا کہ ابن تیمیہ مجھ سے نالاں ہیں، میں نے صفائی پیش کی۔ عرض کیا کہ محترم شیخ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، آپ میری کتابیں دیکھئے۔ میں نے انہیں اپنی کتابیں دیں جس کے جواب میں ابن تیمیہ نے اپنی کتابوں کا سیٹ مجھے عنایت کیا۔ سو آج کل میں انہیں پڑھ رہا ہوں اور وہ قبر میں میری کتابوں کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ میری حیرت پر ہاشم نے بتایا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تعلیم و تعلم کا سلسلہ موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔

لین دین کے معاملے میں اکثر اہل دل کو میں نے نقد سودے کا رسیا پایا، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے، سو یہ سوچ کر میں نے ہوجا کی عطا کردہ تسبیح شکریہ کے ساتھ اپنی جیب میں رکھ لی۔

صبح ساحل سمندر پر چہل قدمی کرتے ہوئے مجھے بار بار ہوجا عثمان کا خیال آیا جو ذکرِ حسین پر سراپا حیرت بن گئے تھے۔ بھلا حسین ابن علیؓ سے بڑا سید اور کون ہوگا۔ اگر روحانیوں کے ہاں رابطہ، کشف، توصل کی کوئی حقیقت ہے تو ان سے بڑا اس روحانی دنیا کا محرم راز اور کون ہوگا۔ ہوجا اپنے اضطراب کو الفاظ عطا کرنے سے

قاصر تھے۔ بظاہر تو انہوں نے نیم بند آنکھوں والے مراقبہ میں پناہ لے رکھی تھی لیکن ان کا اضطراب بتا تا تھا کہ وہ کچھ اسی کنفیوژن کا شکار ہیں جو اساطیر کی ماری قوموں کا مقدر ہوا کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ نازی جرمنی میں اہل یہود کے ربائیوں اور دیندار یہودیوں کو اس بات پر سخت حیرت تھی کہ جب وہ خدا کے چہیتے بندے ہیں اور انہیں توراۃ کی تکمیل کا شرف حاصل ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا ان کے دشمنوں کو ان کے قتل عام کی کھلی چھوٹ دے دے۔ اوشوِٹز کے کیمپ میں، جہاں نازیوں کے ہاتھوں اہل یہود کی منظّم نسل کشی کا سلسلہ جاری تھا، اکثر اہل یہود بچے بوڑھے کی زبان اوراد و وظائف سے تر رہتی۔ جس کسی کو توراۃ کا جتنا بھی حصہّ یاد تھا یا کہیں سے کوئی ورق ہاتھ آجاتا وہ اس کی تلاوت میں لگا رہتا۔ اہل یہود کو یقین تھا کہ خدا اپنے پیاروں کو بچانے کے لیے آسمان سے براہِ راست مداخلت کرے گا۔ ایک گروپ کے بعد دوسرا گروپ گیس چیمبر میں داخل کیا جاتا اور باقی رہ جانے والوں کی زبانوں پر اوراد و تلاوت کی شدت میں مزید اضافہ ہوتا جاتا۔ بالآخر جب قومِ یہود کی ایک بڑی تعداد فنا کے گھاٹ اتار دی گئی تو یہودی فقہاء اور مفکرین کے لیے اس سوال نے کلیدی اہمیت اختیار کر لی آیا وہ خدا کے محبوب بندے ہیں بھی یا نہیں۔ اور اگر توراۃ کی تکمیل کے سبب واقعی ان کا امت مختار ہونا مسلم ہے تو خدا نے اپنے پیاروں کو بچانے کا سامان کیوں نہیں کیا۔ کہتے ہیں کہ اس واقعہ نے اہل یہود کے فقہی طرزِ فکر کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان کی دینیات اور ان کی کونیات سخت فکری بحران کی زد میں آگئی۔ آج کچھ یہی صورتِ حال اور کچھ یہی مخمصہ مہدی کے ان منتظرین کو درپیش ہے جو تراشیدہ روایتوں کے سبب صدیوں سے ایک مسیحا کی راہ تک رہے ہیں۔

۱۵

سفینۂ نور

ایک دن اپنے ہوٹل کے جھروکے سے باسفورس کی آہستہ خرام لہروں کو دیکھ رہا تھا۔ یہی کوئی سہ پہر کا وقت ہوگا۔ ہلکی بارش کے سبب افق دھلا دھلا سا لگتا تھا۔ رفتہ رفتہ سورج کے غروب نے بادلوں کی دھند میں اپنی سنہری شعاؤں کو اس طرح پیوست کیا جسے دیکھ کر نہ جانے کیوں اہل کشف کی وہ داستانیں یاد آ گئیں جب ان کی شب گزیدہ عبادت کے سبب تاریک کٹیا سے نور کی ایک شاہراہ آسمان کو جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کیا پتہ دور اولوداغ کی پہاڑیوں پر کوئی روحانی مراقبہ کیے بیٹھا ہو۔ مصطفیٰ اوغلو نے گذشتہ کئی دنوں سے مسلسل یہ امید دلا رکھی تھی کہ وہ عنقریب کیشش داغ (اولوداغ) یعنی جبل الراہب کے حوالے سے کوئی بڑی خبر لانے والے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان پہاڑیوں پر، جواز منہ قدیم سے عیسائی راہبوں کا مسکن رہا ہے، آج بھی رجال الغیب کے پراسرار قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ ویسے تو اولوداغ آج سیاحوں کے لیے موسمِ سرما کے تفریحی مقام کی حیثیت سے معروف ہے جہاں چکنی پھسلتی برف پر اسکائنگ کا لطف لینے کے لیے دور دور سے لوگ آتے ہیں لیکن اہل دل کے لیے یہ ایک خفیہ پراسرار مقام ہے جہاں گاہے بگاہے قطب الاقطاب اور جبل قاسیون کے چالیس ابدال اپنی سالانہ مجلس کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ ان مجالس میں ہما شما کا تو گزر نہیں ہوتا البتہ کبھی کبھی باسفورس کی لہروں پر ان روحانیوں کا کوئی منور سفینہ جذب و سرمستی کی موسیقی اور ہاؤ ہوٗ کے نغمے سے معمور دور سے گزرتا دکھائی دے جاتا ہے۔ بعضے کہتے ہیں کہ یہ بھی محض ایک ہلوسہ ہے۔ البتہ ہوجا عثمان کا کہنا ہے کہ

انہوں نے اس نورانی سفینے کو ایک بارچشمِ خود دیکھا ہے۔ میں ابھی ان ہی خیالات میں کھویا تھا کہ دیکھیں مصطفیٰ اوغلو آج کیا خبر لاتے ہیں۔ اسی دوران ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف ولید اور ساجد بول رہے تھے۔ کہنے لگے کہ ہم لوگ سلطان احمد کے علاقے میں آئے تھے۔ خیال ہوا کہ اگر آپ ہوٹل میں موجود ہوں اور علیک سلیک کی گنجائش ہو تو حاضری دے ڈالیں۔ جلد ہی مصطفیٰ اوغلو بھی تشریف لے آئے۔ آج کچھ زیادہ پر جوش نہ تھے شاید ابھی ان کے ہاتھ وہ بڑی خبر نہ لگی تھی جس کی تسلی بلکہ بشارت وہ کئی دنوں سے مجھے دے رہے تھے۔ انہیں کچھ بجھا بجھا سا دیکھ کر میں نے پوچھا: لگتا ہے کہ جبل قاسیون کے راہبوں کی ابھی استنبول میں آمد نہیں ہوئی ہے۔ فرمایا ۱۴ ستمبر کو اب چند دن باقی ہیں کچھ اور صبر کیجئے البتہ آج کی شب روحانیوں کی ایک مجلس میں آپ کی دعوت کا انتظام ہو گیا ہے۔ چاہیں تو ولید اور ساجد کو بھی لے لیں۔ باسفورس پر سفینۂ نور میں محفل سماع کے ساتھ ڈنر کا خیال کچھ غیر دلچسپ بھی نہیں۔

مختلف کانفرنسوں میں شرکت کے لیے جب بھی میں استنبول آیا کسی نہ کسی بہانے سے باسفورس پر عشائیہ کی تقریب پیدا ہو گئی۔ البتہ آج کے عشائیہ کا رنگ و آہنگ بالکل جداگانہ تھا۔ سفینے کے نصف دائروی ہال میں چاروں طرف دیواروں کے کنارے کرسیاں آویزاں تھیں۔ ایک کنارے جہاں اسٹیج کا منظر تھا سماع زن اپنی گردنیں خم کیے ہوئے والہانہ سپردگی کا احساس دلا رہے تھے۔ حاضرین میں ایک قابل ذکر تعداد ان جبہ و دستار کے حاملین کی تھی جن کی بلند کلاہی اور طویل وسفید ریش کے سبب ان پر اہل سلوک کے شیوخ کا گمان ہوتا تھا۔ حاضرین میں مرد و زن دونوں تھے البتہ ان میں عرب نژاد مغربیوں کی کثرت تھی۔ گاہے سفید فام مغربی بھی دکھائی دے جاتے تھے۔ جلد ہی یہ عقدہ کھلا کہ اہل سلوک کے وہ خواص جو جراحی، نقشبندی، مولوی، قادری اور مختلف سلاسل سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کے مراکز امریکہ اور یوروپ میں قائم ہیں وہ اپنے سلسلے کی خانقاہوں کی زیارت کے لیے استنبول کا رخ کرتے رہتے ہیں۔ ادھر چند سالوں سے باسفورس کی لہروں پر متحرک عشائیوں میں روایتی بیلی ڈانسر کے بالمقابل مولوی رقص کا عنصر بھی شامل ہو گیا ہے۔ البتہ ایسے عشائیے کم ہوتے ہیں اور ان کا اہتمام مقامی خانقاہوں کے تعاون سے گاہے بہ گاہے روحانی سیاحوں کی آمد پر ہوا کرتا ہے۔

سفینہ نے ساحل کو خیر باد کہا۔ تھوڑی دیر کچھ ہلچل کی سی کیفیت رہی۔ بلوری جام میں مختلف رنگوں کی مشروبات کی ٹرے لیے پھرنے والی خادماؤں کے قدم تھمے، حاضرین نے اپنی متعینہ جگہ سنبھالی اور ایک

نوجوان، جو چہرے بشرے سے مقامی ترک لگتا تھا، بزبان عربی مہمانوں کے استقبال کے لیے اسٹیج پر سامنے آیا۔ سماع زنوں نے اپنی خم گردنوں کو سیدھا کیا اور تب ہی دف کی دھمال پر بلند آہنگ موسیقی کے ساتھ عرفت الھویٰ کا معرفت انگیز نغمہ بلند ہوا۔

عرفت الهوي مذعرفت هواك...... وأغلقت قلبي عمن عداك

وہی لے، وہی طرب، وہی جذب، وہی مستی۔ ایسا لگا جیسے یہ نغمہ پہلے بھی کہیں سنا ہو۔ کہنے والا کہہ رہا تھا:

وقمت أنا جيك يامن تري　　خفايا القلوب ولسنا نراك

أحبك حبين-- حب الهوي　　وحبا لأنك أهل لذاك

دف کی تھاپ مسلسل بلند ہو رہی تھی۔ سامعین کے دل رقصاں تھے۔ بعضے جسم کی جنبش سے اس امر کا پتہ دے رہے تھے۔

فأما الذي هو حب الهوي ... فشغلني بذكراك عمن سواك

اور جب مغنی اس شعر پر پہنچا:

وأماالذى أنت أهل له... فكشفك لي الحجب حتي أراك

فلا الحمد في ذا ولا ذاك لي... ولكن الحمد في ذا وذاك

تو ایسا لگا جیسے ضبط دیدار کے سارے بند ٹوٹ گئے ہوں۔ کچھ تو متحرک سفینہ کا ہچکولا، کچھ طرب انگیز موسیقی کی دھمک اور اس پر سامعین کی سرمستی اور پھر عین بیچ سماع زن کا محوِ رقص ہو جانا۔ رنگ برنگی بدلتی روشنیوں کے ہالے، سمٹتے اور بڑھتے دائرے، چند ثانیے کے لیے ایسا لگا گویا ہم استنبول کے ساحل پر نہ ہوں، مراقش کے کسی زاویہ میں مجلس نشیں ہوں یا پھر صدیوں پہلے ابن عربی کے اندلس میں ہوں، دیدار کے طالب، مشاہدہ کے شوقین۔

عرفت الھویٰ کا طرب انگیز نغمہ شاید ایک طرح کا ابتدائیہ تھا یا سامعین کو warm-up کرنے کی کوشش تھی کہ اصل باقاعدہ پروگرام تو اس کے بعد شروع ہوا۔

ایک بزرگ، جو صورت شکل سے شیخ الطائفہ یا میر مجلس لگتے تھے، روشن بارعب چہرہ، طویل سفید ریش، بلند کلاہ، جس کے مرکز میں نقشبندی کلاہوں کی طرح ہلکا سا ابھار، جبہ مراقشی طرز کا، البتہ خلعت روایتی صوفیوں کی سی پہن رکھی تھی، اسٹیج پر وارد ہوئے۔ آتے ہی نغمگی لئے میں صلوۃ وسلام کا ورد فرمایا اور کچھ سیاسی لیڈروں

کی طرح حاضرین کی طرف ہاتھ اٹھائے ہوئے بشارت دی: لوگو! الحاد و مادیت کی اس دنیا میں، جہاں ہر طرف سنّت کی پامالی اور خدا ناشناسی کے مظاہر عام ہیں، آپ لوگوں کو اس سفینۂ نور کی سواری مبارک ہو۔ فرمایا: آپ جس سفینہ پر سوار ہیں اس کی حیثیت سفینۂ نوح کی ہے جو آ گیا وہ بچ گیا، اس کے علاوہ اب اور کوئی جائے پناہ نہیں۔ آئیے آج اس راز سے پردہ اٹھادوں، ان باتوں کو بیان کردوں جن کے سننے کی تاب شاید سفینہ سے باہر رہ جانے والوں کو نہ ہو۔ صلوٰۃ وسلام ہو اس رسولؐ پر جس نے ہمیں اپنی ولایت کے لیے منتخب کیا۔ یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر انہوں نے نغمگی لے میں صلوۃ وسلام سے حاضرین کے قلوب کو گرمایا۔ پھر فرمایا۔ لوگو! ہم اہل سنت والجماعت چار خلفاء کے قائل ہیں، چار ائمہ کو لائق اتباع سمجھتے ہیں۔ سو جان لو کہ جس طرح فقہ ظاہری میں ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، شافعیؒ، اور ابن حنبلؒ کی پیروی لازم ہے اسی طرح فقہ باطن میں نقشبندی، سہروردی، قادری اور چشتی سلسلے کی بیعت کو ہمارے لیے لازم کیا گیا ہے۔ جو لوگ فقہ باطن کی اہمیت سے واقف نہیں اور جو صرف ظاہری طور پر مسلمان بنے رہنے کو کافی سمجھتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ ان کا دین ناقص اور نامکمل ہے۔ یہ سینۂ کائنات کا وہ راز ہے جس سے ارباب اہل دل کے علاوہ اور کوئی آگاہ نہیں۔

خواتین وحضرات! آپ لوگوں نے حضرت اویس قرنی کا نام تو سنا ہوگا، جی ہاں وہی اویس قرنی جو رسولؐ اللہ سے بالمشافہ ملاقات کے بغیر صحابیت کے درجہ پر فائز کیے گئے، جو اپنی ضعیف ماں کی خدمت کے سبب بارگاہِ رسولؐ میں حاضر ہونے سے قاصر رہے، جنہیں اللہ نے مستجاب الدعوات بنایا اور جو خلقت کی نگاہوں سے اس لیے پوشیدہ رہتے مبادا لوگ اپنی جائز اور ناجائز خواہشات کو لے کر ان سے دعاؤں کے طالب نہ ہوں کہ جب ان کے ہاتھ خدا کے حضور اٹھ جاتے تو دعاؤں کا قبول ہونا یقینی ہوتا۔

اب سنیئے اویس قرنی کی ہم اہل کشف کے ہاں اتنی اہمیت کیوں ہے۔ جن لوگوں نے جامی کی شواھد النبوۃ اور عطار کی تذکرۃ الأولیاء پڑھی ہوگی وہ اس حقیقت سے یقیناً واقف ہوں گے کہ رسول اللہ خود اویس قرنی سے ملاقات کے مشتاق تھے۔ وقتِ وصال آپؐ نے اپنی خلعتِ مبارک عمرؓ اور علیؓ کو اس وصیت کے ساتھ سونپی تھی کہ وہ اسے اویس قرنی کی خدمت میں پہنچادیں اور ان سے امت کے حق میں مغفرت کی درخواست کریں۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں اصحاب نے حضرت اویس قرنی کی خدمت میں یہ خلعت پہنچادی۔ امت کے حق میں دعائے مغفرت کی درخواست کی۔ جس کے جواب میں حضرت اویس نے بارگاہِ ایزدی میں اپنے ہاتھ اٹھا دیئے۔ خدا کے حضور کچھ اس طرح سربسجود ہوئے اور اتنی دیر تک ہوئے کہ عمرؓ اور علیؓ کو یہ شبہ ہوا کہ شاید

آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ قریب جا کر دیکھنے کی کوشش کی جس سے اویس قرنی کی عبادت میں خلل واقع ہوگیا۔ آپ نے سجدے سے سر اٹھایا۔ فرمایا: میں تو خدا سے آج یہ ضد لگائے بیٹھا تھا کہ جب تک تو محمد مصطفیؐ کی وصیت کی لاج نہیں رکھے گا، تمام امت محمدیہ کو بخشنے کا وعدہ نہ کرے گا، میں سجدے سے سر اٹھاؤں گا اور نہ ہی تیرے محبوب کے جبۂ مبارک کو پہنوں گا۔ خدائے بزرگ و برتر نے پھر بھی مجھ سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ قبیلہ بنی ربیعہ اور قبیلہ بنی مضر کی بھیڑ بکریوں کے بالوں کی تعداد کے برابر امت محمدیہ کے گہنگاروں کو بخش دے گا۔ یہ سن کر عمر فاروق اور علی مرتضٰی نے خوشی سے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ ولایت کے مقابلے میں، جو خدا نے اویس قرنی کو عطا کی، اور جس کی توثیق کے لیے خلعتِ ولایت عمرؓ اور علیؓ ان کی خدمت میں لے کر آئے، اس ولایت کے مقابلے میں انہیں خلافت بڑی ہیچ نظر آئی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ ولایت کے مقابلے میں جب خلافت کی بے توقیری عمر فاروق پر واضح ہوگئی تو انہوں نے بد دل ہو کر خلافت چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن پھر اویس قرنی کے اصرار پر اور اس خیال سے کہ غیابِ خلافت کے سبب خلق گمراہ ہو جائے گی آپ نے اس بار کو سنبھالے رکھا۔ یہ ہے وہ عظیم امانت جس کے ہم امین ہیں۔ اویس قرنی کی یہ خلعتِ ولایت سینہ بہ سینہ، نسل بہ نسل مختلف طرق اور سلسلوں سے ہوتے ہوئے ہم تک پہنچی ہے۔ یہ ایک بڑا اعزاز ہے جو خدا نے ہمیں عشقِ رسولؐ کے سبب عطا کیا ہے۔ لوگو! بات طویل ہو جائے گی مگر ایک واقعہ سنائے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ کہتے ہیں کہ عمرؓ اور علیؓ کو اس بات پر حیرت ہوئی کہ اویس قرنی کے منھ میں کوئی دانت نہیں۔ پوچھنے پر پتہ لگا کہ جب انہیں معرکۂ احد میں رسولؐ اللہ کے دندانِ مبارک کے شہادت کی خبر ملی تو وہ سخت بے چین ہوئے۔ انہیں یہ بات گوارا نہ ہوئی کہ رسولؐ اللہ کے تو دانت ٹوٹے ہوں اور ان کے دانتوں پر اس کا اثر بھی دکھائی نہ دے۔ اتباعِ رسولؐ میں پیرویٔ سنت کے خیال سے انہوں نے اپنے دو دانت توڑ ڈالے۔ پھر یہ خیال آیا کیا پتہ آپؐ کے کون سے دانت شہید ہوئے ہوں اور میں نے کون سا دانت توڑ لیا ہو سو اس خیال سے انہوں نے جب تک اپنے سارے دانت نہ توڑ ڈالے انہیں اپنی اتباعِ سنّت پر مکمل شرحِ صدر نہ ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس قصۂ عشق کو سن کر عمرؓ اور علیؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ انہیں اپنی جاں نثاری اور اتباعِ رسولؐ ہیچ نظر آئی۔ لوگو! یہ ہے وہ عشقِ رسولؐ جس پر بظاہر دیوانگی اور جنون کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بغیر خلعتِ ولایت ملتی بھی نہیں۔ یہ جو ہمارے صلوٰۃ وسلام کے ہنگامے ہیں، جنہیں ظاہر پرست غلو سے تعبیر کرتے ہیں اور جسے سن کر وہابیوں کا اسلام جاتا رہتا ہے، یا رسول اللہ شیئاً للہ کی یہی وہ وارفتگی ہے جو ہمیں خلعتِ ولایت کا سزاوار بناتی

ہے۔ ولایت وہ چیز ہے جس کے آگے دنیا کا جاہ واقتدار، وقت کی خلافت ہیچ ہے۔ جسے ولایت کا ادراک ہوجائے وہ کبھی خلافت کے لیے تگ ودونہیں کرسکتا۔ آپ کو شاید یاد ہو کہ قتل عثمانؓ کے بعد جب لوگ حضرت علیؓ کے پاس یہ درخواست لے کر آئے کہ وہ منصبِ خلافت قبول کرلیں تو انہوں نے صاف کہا کہ انہیں خلیفہ بننے کے بجائے وزیر ومشیر کی حیثیت سے مشورہ دینا زیادہ پسند ہے۔ مبارک ہو کہ آپ وہ خوش بخت لوگ ہیں جنہیں خدا نے کاروانِ ولایت کے لیے منتخب کیا۔ عشق وسرمستی کی راہ پر ڈالا۔ یہاں فنافی الشیخ ہونا، فنافی الرسول ہونا دراصل بقیٰ کی ضمانت ہے۔ آیئے ایک بار پھر سرور وسرمستی کے ساتھ عالم وجد میں آلِ محمدؐ پر صلوٰۃ وسلام بھیجیں جن کے ہاتھوں میں ولایت کی یہ امانت تھمائی گئی ہے۔ یہ کہتے ہوئے شیخ الطائفہ نے آلِ محمد پر صلوٰۃ کا نغمہ کچھ اس انداز سے چھیڑا کہ شیخ حبّوش کی یاد تازہ ہوگئی۔

چند سال پہلے شیخ حبّوش اپنے طائفے کے ساتھ لندن تشریف لائے تھے۔ غالباً ۲۰۰۵ء کی بات ہے۔ لندن انڈر گراؤنڈ میں بم دھماکوں کا واقعہ ابھی تازہ تھا۔ اسلام اور مسلمان شبہات کے دائرے میں تھے۔ ان ہی دنوں رمضان کی راتوں میں شیخ حبوش نے یـا أبا الحسن حیاك کا نعرہ بلند کیا اور ایسا محسوس ہوا جیسے لندن کے خوفزدہ ماحول میں ابوالحسن کے متبعین کی سہمی ٹھٹھری زندگی کو پھر سے توانائی مل گئی ہو، زندگی کا پہیہ تمام مخالفتوں کو عبور کرتا ہوا آگے کی طرف چل پڑا ہو۔ خاص طور پر شیخ حبوش کی سحر انگیز آواز میں جب قصیدہ آگے بڑھا اور دف کی وجد آفریں تھاپ پر انہوں نے سبحانك یا دائم۔ سبحانك علّام الغیوب۔ سبحانك یا مفرج القلوب۔ سبحانك من له فی کل شئی آیة کی صدا بلند کی اور اس کے ساتھ ہی سماع زن کا رقص شروع ہوا، تو حاضرین پر وہ کیفیت طاری ہوئی کہ انہیں اس بات کا اندازہ ہی نہ ہوسکا کہ کب رسولؐ اللہ سے شفاعت طلبی کا مطالبہ استعانت اور مدد تک جا پہنچا۔ مدد مدد یا رسولؐ اللہ کی صدائے سحر انگیز میں سماع زن رقص کرتے رہے۔ شیخ حبوش کی نغمہ سرائی جاری رہی۔ ایسا لگا جیسے وقتی طور پر حاضرین ایک ایسی پناہ گاہ میں جا پہنچے ہیں جہاں ڈر اور خوف کا کوئی گزر نہیں۔ اہل دل کہتے ہیں کہ لا خوف علیهم و لا هم یحزنون کا خدائی وعدہ جب صوفیانہ مجلسوں میں اتنا سچا سچا لگتا ہے تو پھر آخرت میں اولیاءاللہ کے لیے کیا کچھ نہ ہوگا۔ میں جب بھی ان نغموں کو سنتا ہوں شاعری اور موسیقی کی اثر انگیزی پر مجھے حیرت ہوتی ہے۔ اچھے اچھوں کے حواس معطل اور عقل ماؤف ہو جاتی ہے۔ کتنی مسمرائزنگ قوت ہے اس نغمۂ طرب انگیز میں۔ بظاہر دین ہے، عشق رسولؐ کا والہانہ اظہار ہے اور بباطن نغمہ کی مذہبی زبان میں دین کی نفی کا مکمل اہتمام۔

شیخ الطائفہ جو بظاہر اپنی عالمانہ،صوفیانہ تقریر کے سبب شیخ طریقت معلوم ہوتے تھے اب جو انہوں نے تقریر کے بعد مغنّیوں کے سے انداز میں صلوٰۃ وسلام کا نغمہ بلند کیا تو پتہ چلا کہ یہ تقریر تو محض تمہید تھی اصل نغمہ کی۔انہوں نے شیخ حبوش کی طرح ابوالحسن کو آواز دینے کے بجائے خاص مطوّل لے میں فرمایا:

نادیت للبعض روحي لحیم اطشا نه۔

قاصد حمي بغداد

لیأتوبکأس الحال اروانی

کرمال جدك یا باز حَوِّلو علینا النظر

وأناالمحسوب جیلانی

پھر اللہ یا اللہ کی آواز کچھ دیر تک کورَس میں گونجتی رہی۔پھر اصل نغمہ کچھ اس طرح شروع ہوا۔

أخذت العهد فی أول زماني --- لقیت العهد غالي یا أخواني

دخلت حمي رضا هم بالآمال--- ونلت مناي من طیب الوصال

وفي دیوانهم شیخي الرفاعي-- وشیخي القادري الباز الجیلاني

فقیل یا فقیر من هم مشایخك--- فقال الباز الأشهب والرفاعي

دفعتاً مغنیوں نے نغمہ کی لے تبدیل کی۔بربط پر

یا شمس الاحسانِ یا قطب العرفان۔یاعبدالقادر یا غوثی! یا بشریٰ جیلان

کے نغمے گائے جانے لگے۔

شیخي عالی الجاه-- غوثاه یا غوثاه

انتم للملهوف غوث --أنتم اهل الله

کی صدا پر مغنیوں کا جذب اور بربط کی لے دونوں تیز ہوگئی۔سامعین پر ایک طرح کی جذب وسرمستی چھاتی جارہی تھی۔جوں جوں سرمستی میں اضافہ ہوتا۔مردہ شیوخ سے حاجت روائی کی طلب تیز ہوتی جاتی:

أدرکنا یا شیخي یارفاعي-- یاشیخ العرجاء

یا أهل الامداد-- جودوا با أسیاد

نظرة منکم أهل الهمة-- قل عندي الزاد

یاأحباب الله--- انتم أهل الجاه

أهواكم والشوق إليكم۔ فی قلبي والله

بالآخر یا عبدالقادر یارفاعي یابشری جیلان کی تکرار پرنغمہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ایک کے بعد دوسرے نغمے کی باری آتی رہی۔کبھی ترکی زبان میں دھمال ڈالی گئی اور کبھی فارسی میں منقبت سماعی ہوئی البتہ غالب حصہّ عربی قصیدوں کا رہا۔شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ مہمانوں میں عرب نژاد امریکیوں کی کثرت تھی بعضوں نے مراقشی انداز کے جبّے بھی زیب تن کرر کھے تھے۔مغنیوں نے جس انہماک سے نغمے گائے، سامعین نے اس سے کہیں زیادہ جذب وسرمستی کی کیفیت میں اسے قبول کیا۔بالآخر اللہ یا اللہ کی دھمال پر اچانک دف کی آواز ٹھہر گئی۔سماع زنوں نے خم گردنوں سے الوداعی سلام کیا۔تالیوں کی زبردست گڑگڑاہٹ میں رنگین روشنیوں کے بدلتے ہالے اچانک غائب ہوگئے۔نیم تاریک، پراسرار ماحول ٹیوب لائٹ کی سفید بے کیف روشنی میں اچانک غائب ہوگیا۔ایسالگا جیسے ہم لوگ کسی خواب سے اچانک بیدار ہوگئے ہوں۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

دیکھتے دیکھتے حاضرین اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔کارندوں نے گول میز کے گرد کرسیوں کی ترتیب بدلی اور چشم زدن میں مجلسِ سماع مجلسِ طعام میں بدلتی نظر آئی۔اب تک دورانِ سماع سفینہ کے بیرونی حصّے سے کباب کی خوشبوگاہے بگاہے اندر آجایا کرتی تھی۔اب کباب کی باقاعدہ سجی سجائی پلیٹیں اندر آرہی تھیں۔مصطفیٰ اوغلو نے سفینہ کے عرشے پر نسبتاً کھلی فضا میں ایک میز کی طرف اشارہ کیا اور ہم چاروں نے اس پر اپنا قبضہ جمالیا۔ایک ادھیڑ عمر ایرانی جوڑے نے میز کے گرد دو خالی کرسیوں کو استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ہم نے بخوشی انہیں اپنی میز پر شرکت کی اجازت دے دی۔اظہار گرمجوشی میں یہ بھی پوچھ ڈالا کہ مجلس کیسی رہی۔ کہنے لگے مغنّیوں کے فن اور سماع زنوں کے رقص میں بظاہر تو کوئی کمی نہ تھی لیکن جذب وسرمستی کا وہ ارتکاز نہ تھا جو فِض (فاس) کی مجلسوں کا خاصہ ہوا کرتا ہے۔

فِض؟ تو کیا آپ مراقش کے رہنے والے ہیں میں نے جاننا چاہا۔

نہیں رہنے والا تو شیراز کا ہوں۔میرا نام جعفر ہے اور یہ میرے ساتھ میری اہلیہ فاطمہ ہیں۔ہم لوگ لاس انجلس میں کوئی بیس سالوں سے مقیم ہیں۔مراقش، شام، مصر، سوڈان وغیرہ ممالک میں کثرت سے آنا جانا رہا ہے۔

تو کیا آپ عربی زبان سے بخوبی واقف ہیں؟

فرمایا: اگر میں ایران میں ہوتا تو علماء کے لباس میں آیت اللہ کہلاتا۔قم کے مدرسہ سے فارغ ہوں اور ایام طالب علمی میں مصر اور مراقش میں دن گزارے ہیں۔

پھر تو آپ آیت اللہ جعفر شیرازی ہوئے۔مصطفیٰ اوغلو نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

فرمایا: آیت اللہ نہ کہو صرف جعفر۔اور یہ شیرازی تو میں نے اس خیال سے لگا رکھا ہے کہ کبھی کبھی شعر موزوں کرلیا کرتا ہوں۔

جعفر شیرازی قم سے فارغ التحصیل ایک آیت اللہ اور وہ اہل سنت والجماعت کے سفینۂ نوح پر سوار۔ میرے ذہن میں اچانک کئی ایک سوال آئے۔پوچھا ابھی دورانِ مجلس آپ نے جن چار سلسلۂ طریقت کی بابت سنا کیا ان میں سے کسی سے آپ کی کوئی باقاعدہ وابستگی ہے۔فرمایا: تصوف اور عرفان کی روایت ہم اہل تشیع کے ہاں بڑی قدیم اور بڑی گہری ہے اور سچ بتاؤں تو واقعہ یہ ہے کہ اس وادی میں شیعہ سنّی سب ہی برابر ہیں۔ہماری نگاہ سے دیکھئے تو یہ سب کچھ علی کے جلووں کی کارفرمائی ہے۔تفصیلات کی باریک بینی میں نہ جائیے۔علی سے وفاداری کے بغیر عرفان بے معنیٰ ہے۔

صوفئ باصفا منم دم ہمہ دم علیؑ علیؑ

ولید اور ساجد جواب تک جعفر شیرازی کی بات بڑے غور سے سن رہے تھے کہنے لگے جی ہاں ہمارے ہاں پاکستان میں بھی علیؑ دے دم دم اندر... کے بغیر عرس کی تقریب اور سماع کی کوئی مجلس مکمل نہیں ہوتی۔

عالم عرب ہو یا برصغیر ہندو پاک یہاں مجالس عرفان کے نام پر جو کچھ بھی پایا جاتا ہے اس کی ابتدائی نشو ونما تو قدیم فارس میں ہوئی۔پرانا فارس جس میں ایران کے علاوہ وسط ایشیا کا بڑا حصہ شامل تھا۔تمام با کمال اہل دل شعراء اسی علاقے سے اٹھے۔انہوں نے عرب و عجم، مشرق و مغرب ہر طرف اپنے اثرات ڈالے۔ اب یہ اور بات ہے کہ کسی خاص زمانے میں یہ فن کسی خاص سرزمین میں کمال کو پہنچ جائے جیسا کہ پچھلے کئی سفروں میں مجھے مراقش میں محسوس ہوا۔لیکن آج بھی وسط ایشیا کی زبانوں میں قدیم شعراء کی منقبت سنیئے تو روح پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔جعفر شیرازی نے اپنی رائے ظاہر کی۔

تو کیا آپ کو کبھی وکالۃ الغوری کے صوفی رقص میں شرکت کا موقع بھی ملا ہے۔میں نے ان کے وسیع تجربے کے پیش نظر جاننا چاہا۔

بولے: قاہرہ کی بات کر رہے ہیں؟ وکالۃ الغوری! بالکل بے کیف پھسپھسا۔ وہاں طبلوں کی دھمال بھی ہے، ہاؤ ہو کے ہنگامے بھی ہیں مگر یہ آپ کے اندرون کو بیدار نہیں کرتے، یہ سب کچھ ایک بے مزہ میکانیکی عمل معلوم ہوتا ہے۔ ہاں فِض کی بات اور ہے یا مجموعہ ابوشعر کو لیجئے۔ جب نغمہ زن روتا ہے تو سامعین کا پورا وجود مجسم آہ و بکا بن جاتا ہے۔ آنسو تھم کر نہیں دیتے۔ حبّ رسولؐ کے ایسے مظاہر سے وکالۃ الغوری کو دور کی بھی نسبت نہیں۔ اس کے برعکس ناصر خسرو کی شاعری کو کسی روشن ضمیر نغمہ زن کی زبانی سنیئے تو ایسا لگتا ہے جیسے آپ کی آلودہ روح مسلسل مصفّٰی اور مجلّٰی ہوتی جا رہی ہو۔

جعفر شیرازی تو بحرِ تصوف کے غواص نکلے۔ ہندو پاک سے لے کر مراقش تک اور ملیشیا سے لے کر مغرب کا شاید ہی کوئی معروف صوفی مغنّی ہو جس سے ان کی واقفیت نہ ہو۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے صابری برادران کے خاص انداز میں بھر دے جھولی میری یا محمدؐ، کی چند لائنیں سنا ڈالیں۔ اگر ایرانی لہجہ کی چھاپ ان کے اندازِ تکلم پر نمایاں نہ ہوتی تو یہ ماننا مشکل ہوتا کہ اردو زبان سے ان کی واقفیت بس واجبی سی ہے۔

میں نے پوچھا کہ مختلف ملکوں کے روحانی سفر، مجالس سماع میں شرکت، اہل دل سے قربت میں ان کی اس قدر دلچسپی کا آخر سبب کیا ہے؟ کیا واقعی وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کا یہ روحانی قالب ہی اس کا اصل الاصل ہے؟

میرے اس سوال پر جعفر شیرازی کچھ سنبھل سے گئے۔ فرمایا بعض لوگ حبِ کلام کے رسیا ہوتے ہیں۔ بولنا بلا تکان بولنا انہیں مسرت دیتا ہے۔ بولنے کے مقابلے میں سننا ایک ریاضت چاہتا ہے۔ کثرتِ کلام سے دل کی آنکھیں ویران ہو جاتی ہیں جبکہ کثرت سماع سے دل کی دنیا روشن اور منور ہو جاتی ہے۔ اور جب آپ کے کان ایک بار نغمۂ معرفت کے رسیا ہو جائیں تو پھر عرفان سے کم تر کوئی چیز نگاہوں میں جچتی ہی نہیں۔ پھر سماع جذب و سرمستی کا سامان بھی ہے۔ الفاظ پر نہ جائیے کہ مغنی کیا کہتا ہے۔ کون سی بات خلافِ شرع ہے اور کون سی بات خلافِ عقل۔ اہل سماع جب اپنی منزل ارتکاز پر جا پہنچتے ہیں تو انہیں الفاظ و معانی منتقل نہیں ہوتے بلکہ صرف جذب و سرمستی کی سرور آمیز کیفیت منتقل ہوتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو مجھے ملکوں ملکوں مختلف مجالس میں لیے پھرتی ہے۔ اور ہاں ایک راز کی بات بتاؤں، یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوئی، چہرے پر معنیٰ خیز مسکراہٹ طاری ہوئی۔ فرمایا: یہ سب بنیادی طور پر ہے تو علیؑ کا ہی جلوہ۔ یہ علیؑ کا جادو ہے جو آج سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ذرا دیکھئے تو سہی نقشبندیوں نے اپنے سلسلے سے علیؑ کو ہٹا کر ابوبکر صدیقؓ کو

رکھ دیا لیکن اہل بیت کے بغیر ان کا کام نہ نکل سکتا تھا سو جعفر صادق سے انہیں اپنا رشتہ جوڑنا پڑا۔ اور یہ جو ابھی آپ نے اویس قرنی کا قصہ سنا یہ سب خیالی باتیں ہیں۔ یہ ایک تخیلی اور اسطوری کردار ہے جو علیؓ کی عظمت کم کرنے کے لیے تشکیل دیا گیا لیکن بالآخر نتیجہ کیا نکلا۔ علیؓ علیؓ ہی رہے۔ آج بھی امت پر علوی سادات کی روحانی حکومت قائم ہے۔ خود سنیوں کا کوئی خطبۂ جمعہ پنجتن کے ذکر خیر کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ سچ پوچھو تو اسلام علیؓ ہے اور علیؓ اسلام۔

ساجد جو اس پورے تماشے میں بظاہر گم سم سے بیٹھے تھے واپسی میں کہنے لگے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی بلکہ بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آئیں۔

شاید اسی لیے تم پر حال کی کیفیت زیادہ طاری رہی، میں نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔ کہ تصوف کا سرالاسرار یہ ہے کہ جو جتنا کم سمجھتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ محظوظ ہوتا ہے۔

بولے: نہیں یہ بات نہیں ہے۔ دراصل مجھے آج ایک بڑا جذباتی دھچکا پہنچا ہے۔ اب تک تو میں یہ سمجھتا آیا تھا کہ داتا میرے داتا کہنے والے یا غوث اعظم دستگیر کا نعرہ بلند کرنے والے یا سخی شہباز سے مدد کے طالبین ناسمجھ اور ناخواندہ پاکستانی مسلمان ہیں اور یہ سب کچھ ان کی جہالت اور اسلام سے دوری کے سبب ہے۔ لیکن آج یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یا غوثاہ کہنے والے اور رفاعی اور عبدالقادر سے مدد طلب کرنے والے لوگوں کی عالم عرب میں بھی کمی نہیں۔ جب عرب عجم ہر جگہ المدد یا رسول اللہ یا عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ کی صدا بلند ہو رہی ہے تو پھر اسلام بچا کہاں۔ آج پہلی بار یہ بات مجھ پر منکشف ہوئی کہ 'داتا میرے داتا' کی صدا سے صرف لاہور کا داتا دربار نہیں گونج رہا ہے بلکہ پورا عالم اسلام، بجز چند مستثنیات، خدائے واحد کو چھوڑ کر مردہ پرستی کے کارِ لایعنی میں مبتلا ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ پھر اسلام بچا کہاں؟

ساجد کا یہ ردعمل گو کہ فطری تھا لیکن مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ سفینۂ نور کے طرب انگیز ہنگامے میں بظاہر گم سم بیٹھے اس نوجوان کے دل میں خیالات کا یہ طوفان بپا تھا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تمہارا کہنا بالکل درست ہے۔ ہم مسلمانوں نے بھی عملی طور پر خدا کو اس کے کار منصبی سے معطل کر رکھا ہے۔ جس طرح ہندوؤں نے برہما کو تخلیق کائنات کے بعد لمبی چھٹی پر بھیج رکھا ہے اور ان کے ہاں مختلف دیوی دیوتا لوگوں کی دادرسی کر رہے ہیں اسی طرح مسلمانوں میں غوثِ اعظم کو صنم اکبر کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے جو اپنے مختلف چیلوں اور ولیوں کے توسط سے کچھ اس شان سے ہماری دادرسائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں کہ تمام ولیوں کی گردنیں

ان کے قدمِ مبارک کے نیچے آ گئی ہیں۔

'لیکن یہ جال تو بہت بڑا ہے'، ساجد نے اپنا اضطراب ظاہر کیا۔

ہاں! اور تمہیں یہ معلوم کر کے مزید حیرت ہوگی کہ عام طور پر جن لوگوں کے بارے میں یہ شہرہ ہے کہ وہ تصوف کے مخالفین میں سے ہیں وہ بھی اس جال سے باہر نہیں۔ ابنِ تیمیہ سے تو تم واقف ہو جنہیں سلفی تحریک نے تصوف مخالف باور کرا رکھا ہے۔ وہ بھی اسی صوفی سلسلے کے توسیعہ ہیں، خرقۂ ولایت کے حاملین میں سے ہیں، مصطفیٰ اوغلو نے اپنی معلومات سے جلتی آگ پر تیل چھڑ کنے کی کوشش کی۔

ابنِ تیمیہ؟ تو کیا وہ بھی کسی سلسلے میں بیعت تھے؟ ساجد اب سراپا حیرت تھا۔

وہی خرقۂ ولایت، جس کا آج سفینے پر تذکرہ رہا، عبدالقادر جیلانی سے ابوعمر بن قدامہ اور ان کے فرزند ابنِ عربی عمر بن قدامہ کے سلسلے سے ابنِ تیمیہ کو پہنچا، اور انھوں نے آگے اسے اپنے شاگردِ خاص ابنِ قیم الجوزیہ کو منتقل کیا جو مدارج السالکین (شرح صوفی تصنیف منازل السائرین) کے مولف کی حیثیت سے معروف ہیں۔ بداء العلقه بلبس الخرقه (مولف: یوسف بن عبدالہادی) میں ابنِ تیمیہ کا یہ اعتراف اور اس کے تفصیلی شواہد موجود ہیں کہ انہیں مختلف صوفی سلسلوں بشمول سلسلۂ قادریہ سے نسبت حاصل تھی۔

ساجد کے لیے یہ سب کچھ ایک انکشاف سے کم نہ تھا۔ کہنے لگا: آج سے پہلے مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ روحانیوں نے اتنے بڑے پیمانے پر اپنا جال پھیلا رکھا ہے جس میں بڑی سے بڑی مکھی آ کر چند لمحوں میں اپنا دم خم کھو دیتی ہے۔ اب میں سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ پوری دنیا میں لاکھوں لوگ بے شمار قبروں کی مجاورت کے کام میں مشغول ہیں۔ قوالیوں کی مجلسیں منعقد ہو رہی ہیں، دھمال ڈالے جا رہے ہیں، عرس اور زیارتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ سماع اور نغموں کا فن عروج پر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے بڑے پیمانے پر مسلمانوں کی توانائی اور ان کا پیسہ آخر کس کام میں ضائع ہو رہا ہے۔

ساجد کے بیان کے ساتھ ہی اس کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا۔ وہ عمر کے جس مرحلے میں تھا اس کے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل تھا۔ سفینۂ نور کا سفر اس کے لیے ایک عجیب تجربہ تھا، ایک چشم کشا تجربہ۔ اور بقول مصطفیٰ اوغلو اس تجربہ میں دراصل اس کے باطن کا فیوز اڑ گیا تھا۔

۱٦

رسول اللہ اور بخاری کا درس

ادھر ہاشم فاتح کے علاقے میں ہی رہ گئے تھے۔ باربار ان کا فون آرہا تھا کہ اگر ممکن ہو تو سلوک کی ہفت مجالس میں اپنی شرکت کو یقینی بناؤں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ ایک نادر موقع ہے جب مشائخ نقشبند کی کبار شخصیات سات مختلف مجالس میں طالبین کو سلوک کے اسرار و رموز پر آگاہ کر رہی ہیں۔ ڈھائی دن کے اس خصوصی پروگرام کا انہوں نے جس والہانہ انداز سے تذکرہ کیا اس نے میرے اشتیاق میں بڑی حد تک اضافہ کر دیا۔ کہنے لگے کہ آج شب کی مجلس ایک طرح کا افتتاحی جلسہ تھا جس میں طریقت کی اہمیت سے سالکین کو آگاہ کیا گیا۔ ہمیں یہ بات بھی بتائی گئی کہ انسانی زندگی کو چار مختلف سطحوں پر جینا ممکن ہے گویا یہ چار الگ الگ دنیائیں ہیں جو الگ بھی ہیں اور ایک دوسرے پر سایہ فگن بھی۔ عوام کالانعام کی دنیا عالم ناسوت ہے جس کی پہنچ حواس خمسہ سے آگے نہیں۔ البتہ سالک اپنی ریاضت اور مجاہدے کے ذریعہ عالم ملکوت میں پہنچ سکتا ہے جہاں تسبیح وتہلیل اور قیام وسجود تک پہنچ کر اس کے قدم رک جاتے ہیں۔ اگر سالک کا روحانی سفر جاری رہا تو اس پر عالم جبروت کے دروازے وا ہو جاتے ہیں جہاں ذوق وشوق، وجد وسکر اور صحو ومجد اس کا کل سرمایہ ہوتا ہے۔ اگلی منزل عالم لاہوت کی ہے جو دراصل لامکاں ہے، جہاں نہ گفتگو ہے اور نہ ہی جستجو۔ ہاشم کہنے لگے: بڑی گہری باتیں ہیں۔ کاش آپ اس پروگرام میں شریک ہوتے۔ یہاں بڑے پرانے سالکین ہیں اور ایسے طالبین حق ہیں جنہوں نے چالیس چالیس سال ذکر ومجاہدہ میں لگائے ہیں۔ ان حضرات کا تاثر ہے کہ جو باتیں

انہیں برسہابرس کی صحبتوں میں نہ ملیں وہ اس مختصر سی مجلس میں سہل ممتنع کے انداز میں بیان کردی گئی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ علم لدنی کی تعلیم کے ساتھ ہی مراقبے اور مجاہدے کا پروگرام بھی رکھا گیا ہے تا کہ سالک کے ذہن میں کسی طرح کا کوئی ابہام باقی نہ رہے۔ سچ پوچھئے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے مکاشفے کا صحیح راستہ اب جا کے معلوم ہوا ہے۔ کل ہم میں سے ہر شخص پر ایک سفید چادر ڈال دی گئی۔ کوئی گھنٹہ بھر تاریک کمرے میں ہم لوگ اپنی اپنی چادروں کے اندر کشفِ قبر کی مشق کرتے رہے۔ عالم تصور میں کوئی شیخ سرہندی کی قبر پر پہنچا، کسی نے بہاء الدین نقشبندی کی قبر پر توجہ کی اور کسی نے اپنے زندہ شیخ کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ میرے ساتھ مصیبت یہ تھی کہ میں اب تک شیخ سے محروم ہوں سو میں نے رسول اللہؐ کی قبر مبارک کو اپنی مشق کے لیے منتخب کیا۔

بہت خوب! میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ پھر نتیجہ کیا رہا؟ میں نے جاننا چاہا۔

بولے: مجھے تو کچھ زیادہ کامیابی نہ ملی، بس گنبدِ خضراء کا منظر نگاہوں میں گھومتا رہا۔ البتہ جن لوگوں نے زندہ شیوخ کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا تھا ان کا کہنا ہے کہ انہیں اس دوران کئی بار ایسا لگا جیسے ان کے شیخ طریقت کبھی تمثیل میں اور کبھی فی الواقع ان کے سامنے آپہنچے ہوں۔ ایک صاحب نے تو یہ بھی بتایا کہ ان کے شیخ جو کیلیفورنیا میں رہتے ہیں وہ بزبان عربی کچھ کہہ رہے تھے جس کے معانی تک ان کی آگہی نہ ہو سکی۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اس بارے میں اپنے تجربہ کا افشا مناسب نہیں خیال کیا جاتا۔ اس لیے بہت کم لوگ اس پر زبان کھولتے ہیں البتہ جب میں نے اپنے تجربے کی ناکامی کا ذکر کیا تو بعض دوستوں نے بتایا کہ رسول اللہؐ سے راست تعلق قائم کرنا ہما شما کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے کسی ایسے شیخ کا دامن تھامنا ضروری ہے جو تمہیں رسول اللہؐ کے دربار تک پہنچا سکے۔ بہرحال دوسرے ساتھیوں کے مقابلے میں میری حیثیت تو نو وارد کی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تجربہ برا بھی نہیں۔

ہاشم کی زبانی ہفت مجالس کا یہ ابتدائی تجربہ سن کر میرا اشتیاق مزید بڑھ گیا۔ سوچا اس نادر موقع سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے۔ رات کی افتتاحی مجلس سفینۂ نور میں شرکت کے سبب پہلے ہی ہاتھ سے جاتی رہی تھی۔ سو اگلی صبح حاضری کے وعدہ کے ساتھ میں نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ ولید اور ساجد جواب تک میری بات شوق اور تجسس سے سن رہے تھے، بولے: کیا واقعی کل آپ فاتح آئیں گے؟ پھر تو بڑا لطف آئے گا لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم دونوں اس پروگرام میں شریک نہیں ہو سکتے۔ ہمیں مبتدئین کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ پتہ نہیں آپ کو بھی اس میں رسائی مل پائے گی یا نہیں۔ ہو سکتا ہے شیخ حمود کا توسط کام آجائے۔ وہ آپ سے بڑے متاثر ہیں۔

مبتدئین کے نصاب میں تمہیں کیا پڑھایا جا رہا ہے؟ میں نے ساجد سے جاننا چاہا۔

میرے لیے پانچ ہزار مرتبہ اسمِ ذات کا ذکر تجویز ہوا ہے اور ولید کو ہر روز اکیس ہزار مرتبہ نفی اثبات کا ذکر کرنا ہے۔

اکیس ہزار مرتبہ! میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

کتنی دیر لگتی ہے اکیس ہزار مرتبہ کے ذکر میں؟

ابھی تو آدھا دن نکل جاتا ہے البتہ مشاق لوگ تین گھنٹہ میں اس عمل سے نکل جاتے ہیں۔

پھر جو لوگ سلوک کی اعلیٰ مدارج طے کرتے ہیں انہیں تو بڑا وقت صرف کرنا پڑتا ہوگا؟

جی ہاں! انہیں ذکر کے ساتھ ساتھ مراقبہ، کشف، توجہ اور رابطہ کے لیے بڑا مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن کہتے ہیں کہ اگر ایک بار آپ صحیح راستہ پر چل نکلے اور شیخ کی توجہ آپ کو حاصل ہوگئی تو پھر زندہ مردہ بزرگوں، صاحب قبر حتیٰ کہ رسول اللہؐ کی زیارت ممکن ہو جاتی ہے، بلکہ ولی کامل تو راست خدا کے رابطہ میں آ جاتا ہے۔ خدا سے اخذ کرتا اور بندوں کو بانٹتا ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے لیے یقین وایمان درکار ہے اور اسی کی اپنے اندر کمی کا شکوہ ہے۔ ولید نے زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ یقین اور شبہات میں لپٹی ہوئی بات کہی۔

ویسے شیخ نے یہ بھی بتایا ہے کہ کشفِ قبر کے لیے قبر کی قربت مہمیز (catalyst) کا کام دیتی ہے۔ البتہ ایک بار اگر اس عمل میں کامیابی مل جائے تو فیوض کا سلسلہ پھر رکتا نہیں، ولید نے مزید وضاحت کی۔

تمہیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ ہمارے بعض ثقہ علماء نے مکاشفہ کے ذریعہ بڑے مدارج طے کیے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کا تو یہ دعویٰ ہے کہ انہوں نے بلا واسطہ خود رسول اللہؐ سے قرآن مجید پڑھا ہے اور عبدالقادر جیلانی کی تو باقاعدہ تربیت رسول اللہؐ کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ متاخرین میں قاسم نانوتوی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں بعض اصحابِ کشف نے رسول اللہؐ سے بخاری کا درس لیتے دیکھا ہے۔

ولی اللہ الدہلوی؟ مصطفیٰ اوغلو نے حیرت سے پوچھا۔ واقعی انہوں نے ایسی کوئی بات خود کہی ہے یا مخالفین کا پروپیگنڈہ ہے؟ راسخ العقیدہ مسلمانوں میں تو ان کا بڑا اعتبار ہے۔

جی ہاں! انہوں نے الفوز الکبیر اور فیوض الحرمین میں کھلے الفاظ میں یہ بات کہی ہے۔ بلکہ اسی پر کیوں جائیے شاہ صاحب نے تو اپنی کتاب دُرّثمین فی مبشرات النبی میں ایسی چالیس حدیثیں نقل کی ہیں جو ان کے والد شیخ عبدالرحیم نے رسول اللہؐ سے راست سنی ہیں۔

واقعی؟ یہ سب کچھ ہمارے ثقہ علماء کی کتابوں میں موجود ہے؟ ولید نے حیرت کا اظہار کیا۔

پھر تو مکاشفہ ایک ایسا چور دروازہ ہے جس کے ذریعہ اسلام میں مختلف قسم کے الّم غلّم خیالات کو داخل ہونے کا موقع مل سکتا ہے۔ جس کا جی چاہے رسولؐ اللہ سے ایک نئی خبر منسوب کر دے۔ پھر تو سنت کا دائرہ حدّ وحساب سے باہر ہو جائے گا۔ صحاح ستّہ کی روایتوں پر تو آپ جرح وتعدیل کرتے ہیں۔ کبھی راوی کی ثقاہٹ شک کے دائرے میں آتی ہے۔ یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ سننے والے نے راست رسولؐ اللہ سے سنا ہے اور اگر مکاشفہ معتبر ذریعہ ہے تو پھر ان حدیثوں کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ساجد ہماری گفتگو بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ وہی گم صم کا سا انداز جیسے یہ باتیں اس کے لیے انکشاف کا درجہ رکھتی ہوں۔ کہنے لگا کہ میں نے سنا ہے کہ شیخ محمود کے ہاں بھی رسولؐ اللہ کی بہ نفس نفیس تشریف آوری ہوتی رہتی ہے۔ ایک بار غالباً شادی کی یا ایسی ہی کوئی تقریب تھی، لوگ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجلس میں کچھ ہلچل کی سی کیفیت رہی۔ پتہ چلا کہ رسولؐ اللہ مبارک باد دینے کے لیے تشریف لائے تھے جنہیں اس موقع پر موجود سادات کی آنکھوں نے دیکھا۔ کیا واقعی یہ سب ممکن ہے؟ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔ ساجد نے اپنے اضطراب کا اظہار کیا۔

میں نے کہا کہ چونکہ اس سوال سے بہت سے سوالوں کے تار جڑے ہیں اس لیے اس پر گہرے غور وفکر اور تحقیق کے بعد ہی کوئی موقف قائم کرنا چاہئے اور چونکہ یہیں سے دین میں تحریف کا چور دروازہ کھلتا ہے اور یہ مسئلہ حساس اور نازک بھی ہے اس لیے لازم ہے کہ تم اس بارے میں میرا یا کسی اور کا فتویٰ قبول کرنے کے بجائے طالب علمانہ تلاش کے ذریعہ اس عقدہ کو حل کرو۔ قرآن مجید کی کسوٹی پر اصحاب کشف کے دعاوی کو پرکھو۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

لیکن یہ تو امت کا متفقہ عقیدہ ہے نا کہ آپؐ اپنی قبر میں زندہ ہیں؟ اس نے اپنے سوال پر اصرار جاری رکھا۔

دیکھو متفقہ عقیدہ تو صرف وہ ہے جو صاف صاف طور پر قرآن مجید میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کے باہر جو کچھ ہے وہ لوگوں کے اپنے اندازے ہیں جس کی بنیاد کسی اثر یا کسی روایت پر ہے۔ جس کی تحقیق وتنقید کا حتمی کام ابھی باقی ہے۔ البتہ تمہاری معلومات کے لیے یہ بتاتا چلوں کہ بہت سے بریلوی علماء کی طرح، جنہیں دیوبندی حضرات قبوری گردانتے ہیں، علمائے دیوبند کا بھی یہ عقیدہ ہے، جیسا کہ ان کی کتاب المہند علی

المفند میں لکھا ہے، کہ آپؐ اپنی قبر میں زندہ ہیں اور یہ کہ آپؐ کی یہ حیات دنیا جیسی ہے برزخی نہیں۔ جب ایک بار یہ بات مشہور ہوگئی کہ رسولؐ اللہ باحیات ہیں تو پھر اہل کشف کو آپؐ سے ملاقات کی گویا نظری بنیاد ہاتھ آ گئی۔ اس سلسلے کا ایک مشہور واقعہ شیخ احمد رفاعی کا ہے۔ ۵۵۵ھ میں جب انہوں نے روضۂ اطہر پر کھڑے ہوکر یہ اشعار پڑھے:

فی حالة البعد روحي كنت أرسلها　　تقبل الأرض عني وهی نائبتي

وهذه دولة الأشباح قد حضرت　　فامدد يمينك كي تحظي بها شفتي

یعنی میں مسافت کے سبب اپنی روح کو خدمتِ اقدس میں بھیجا کرتا تھا وہ میری نائب بن کر آستانہ مبارک چومتی تھی۔ اب جسموں کی حاضری کی باری آئی ہے۔ اپنا دستِ مبارک عطا کیجئے تا کہ میرے ہونٹ اس کو چوم سکیں۔

کہتے ہیں کہ اس شعر کے جواب میں قبر مبارک سے آپؐ کا ہاتھ باہر نکلا جسے شیخ رفاعی نے بوسہ دیا۔ لیکن شیخ رفاعی تو پھر بھی زمانی بعد کے سبب حقیقی سے کہیں زیادہ اسطوری کردار کے حامل ہیں۔ تصوف کی کتابوں میں ان کے خرق عادت واقعات کا ایک بڑا دفتر موجود ہے۔ ہمارے زمانے میں حال کی تاریخ میں تبلیغی جماعت کے مولوی زکریا نے عین حالت بیداری میں رسولؐ اللہ سے اپنے ملاقات کے دعوے کر رکھے ہیں۔ ایسے چالیس مکاشفات کا تذکرہ بہجۃ القلوب نامی کتاب میں ان کے ایک مرید محمد اقبال نے مولوی زکریا کے ذاتی روز نامچے کی روشنی میں مرتب کر دیئے ہیں۔ مجھے سارے مکاشفے تو یاد نہیں۔ کتاب بہت پہلے دیکھی تھی، ایک آدھ یاد رہ گئے ہیں۔ سن لو! محظوظ ہونے کے لیے اتنا کافی ہے۔ لکھا ہے کہ عبدالحئی سے مکاشفے میں رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ زکریا کی خدمت کرتے رہو۔ اس کی خدمت میری ہی خدمت ہے اور یہ بھی فرمایا کہ میں اکثر اس کے حجرے میں جاتا رہتا ہوں۔ بعض مکاشفات میں تاریخ کے تعین کے ساتھ لکھا ہے کہ آج بروز فلاں دن بوقت دوپہر حضور اقدس مدرسہ میں میری قیام گاہ پر تشریف لائے اور میری طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ میں انہیں ظہر کی نماز پڑھانے آیا ہوں۔ اس طرح کے لطائف پر مشتمل مکاشفات کا ایک بڑا طویل سلسلہ ہے جو مختلف بزرگوں کی زبانی ہمارے دینی ادب میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا رہا ہے۔ آپ کے ہاں پاکستان میں تو ابھی حال کی بات ہے کہ رسولؐ اللہ، بقول صاحب منہاج القرآن، ان کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے ہر سال پاکستان تشریف لاتے ہیں۔

یہ باتیں سن کر ساجد کچھ مبہوت سا ہو گیا۔ کہنے لگا کہ یہ تو بتائیے کہ اگر یہ باتیں سچ ہیں تو ان کی تصدیق کا طریقہ کیا ہے اور اگر جھوٹ ہیں تو انہیں ہمارے علماء مسترد کیوں نہیں کرتے؟ ان راویوں کو قابل گردن زدنی کیوں قرار نہیں دیا جاتا۔ انہیں امت میں احترام و تقدس کا سزاوار کیوں سمجھا جاتا ہے؟

ساجد کے سوال کی دھار مستقل تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ یہ سوالات مجھے زخمی کریں کیوں نہ اسے صحیح رخ پہ موڑ دیا جائے۔ میں نے کہا یہی تو سب سے بڑا سوال ہے اور تمہیں ایک طالب صادق کی حیثیت سے اس سوال کا جواب تلاش کرنا چاہئے۔

۱۷

کشفِ قبور

دوسرے دن وقت مقررہ پر میں فاتح پہنچ گیا۔ پروگرام بس شروع ہوا چاہتا تھا۔ کچھ لوگ ادھر ادھر کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے، بہت سے شرکاء ہال کے اندر فرشی مجلس میں اپنی جگہ لے چکے تھے۔ ایک طرف فرشی اسٹیج بنایا گیا تھا جہاں خوبصورت فرشی میز پر لیپ ٹاپ اور پروجکٹر جیسی چیزیں رکھی تھیں۔ شیخ طریقت کے آتے ہی صلوٰۃ وسلام کی گونج سے مجلس کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ اسٹیج کے پیچھے لگے بڑے اسکرین پر گنبد خضراء کی تصویر طلوع ہوئی اور جب دعاؤں کا سلسلہ ارواحِ خواجگان تک پہنچا تو اسکرین پر خواجہ بہاء الدین نقشبندی اور سلسلۂ ذہب کے دوسرے شیوخ کی قبروں کی تصویریں یکے بعد دیگرے ابھرنے لگیں۔ کچھ دیر مجلس پر مکمل سکوت طاری رہا۔ شاید یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ سالکین ذکر خفی یا قلبی ذکر میں مصروف ہیں۔ بعضوں نے بتایا کہ سکوت کا یہ وقفہ دراصل رابطہ اور تصور شیخ کے لیے وقف تھا کہ کل پہلی مجلس میں یہ بات ذہن نشیں کرائی گئی تھی کہ مرید کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ بند آنکھوں سے اپنے شیخ کو متصور کرے۔ فنا فی الشیخ ہونا، فنا فی اللہ کی پہلی منزل ہے۔ شیخ سے جتنی زیادہ مناسبت ہوگی اسی قدر اس کے باطن سے فیض حاصل ہو سکے گا کہ پیر کا سایہ ذکر حق سے بہتر ہے۔ اویس قرنی رسولؐ اللہ کے تصور سے فیض لیتے تھے۔ صاحبِ کشف حضرات اولیاء اللہ کے مزارات سے فیض لیتے ہیں مگر چونکہ عام سالکین ایسا نہیں کر سکتے اس لئے ان کو اپنے شیخ کو درمیان میں رکھنا پڑتا ہے۔

واللہ اعلم کس کے تصور میں کیا تھا، میں تو پندرہ منٹ کی خاموشی میں بند آنکھوں سے بھی یہی دعا کرتا رہا کہ اللھم أرنی الأشیاء کما ھي، تبھی شیخ طریقت نے اللھم صلی علیٰ کی صدا بلند کی۔ سالکین کی زبان سے صلوٰۃ وسلام کے کلمات جاری ہوگئے۔ ادھر اسکرین پر مولانا رومی کی iconic تصویر طلوع ہوئی۔ قونیہ کے چند مناظر بدلے اور پھر مثنوی کا پہلا شعر اسکرین پر آ کر رک گیا۔ شیخ طریقت نے بڑی خوش الحانی کے ساتھ مثنوی کے ابتدائی اشعار کچھ اس طرح پڑھے کہ پیر علاء الدین کے درس مثنوی کی یاد تازہ ہوگئی۔ فرمایا لوگو! ہم خواجگانِ نقشبند کے غلام لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے نہیں متعین ہیں۔ تعلیم و تعلم کے لیے تو یونیورسٹیاں قائم ہیں، جابجا کالج کھلے ہیں، تحقیقی ادارے کام کر رہے ہیں ہمارا کام تو صرف آپ کو اپنے آپ سے آگاہ کروانا ہے۔ ایسی ترکیب بتانی ہے کہ آپ کے اندر پوشیدہ غیر مرئی قوتیں بیدار ہوجائیں جسے مشائخ کی زبان میں لطائف کی بیداری کہا جاتا ہے۔ اگر صرف لطیفۂ قلب بیدار ہوجائے تو آپ کے اندر لوگوں کے خیالات پڑھ لینے کی، ان کے دل کا حال جان لینے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے لیکن یہ تو کشف کا صرف ایک درجہ ہے۔ اب جس کے ساتوں لطائف جاری ہوجائیں اس کی بلندی اور عظمت کا کیا کہنا۔ البتہ اس راستے پر کوئی قدم آگے بڑھانے سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہم ہیں کون۔ اگر ہم تمام حجابات کو ہٹا کر فرش سے عرش تک دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے لیے طویل مسافت لمحوں میں طے کرنا، بسیط فضاؤں میں اڑنا، سطحِ آب پر چلنا اور وہ سب کچھ کرنا ممکن ہے جسے عام آدمی کی عقل گوارا نہیں کرتی تو اس کا بنیادی جواز ہے کیا؟ رومی کہتے ہیں کہ بانسری سے سنو وہ کیا قصہ سناتی ہے۔ کہتی ہے کہ جب سے مجھے جنگل سے کاٹ کر جدا کیا گیا ہے میرے نالے سن کر مرد وزن روتے ہیں۔ جو کوئی اپنی اصل سے دور ہوجاتا ہے وہ اپنے ایام وصل کو پھر سے تلاش کرتا ہے۔ لوگو! ہمارا حال بھی اسی بانسری کا ہے۔ روحِ انسانی بھی اصلاً ایک نورانی مخلوق ہے۔ جب سے ہمیں اصل سے کاٹ کر اس دنیا میں بھیجا گیا ہے ہمارا اندرون ہجر وفراق کے سبب شکستہ ہے۔ ہم وصل محبوب یعنی اپنی اصل سے ملنے کے لیے بےقرار ہیں۔ ہماری یہ دکھی روحیں جب کسی ولیٔ کامل کے ساتھ بیعت کا رشتہ قائم کرتی اور اللہ کی طرف توجہ کرتی ہیں تو ان پر وصل الٰہی اور فیضان الٰہی کی بارش شروع ہوجاتی ہے حتی کہ انہیں عالم ارواح کی تمام کیفیات محسوس ہونے لگتی ہیں۔ ایسے لوگوں کو خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ، روح ہوں یا جسم، زمان ومکاں پر تصرف حاصل ہوجاتا ہے۔ وہ پلک جھپکتے ہی طیّ الارض کا معرکہ سر کر لیتے ہیں۔ اس سفر کی پہلی منزل تصور شیخ ہے۔ اہل طریقت کی وساطت کے بغیر یہ سب کچھ ممکن نہیں۔ یہ کہتے ہوئے شیخ نے صلوا علی

النبی کا نعرہ مستانہ بلند کیا۔ سالکین کی زبانیں ایک بار پھر صلوٰۃ وسلام سے تر ہوگئیں۔

فرمایا: عزیزانِ من! آپ لوگ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو حصولِ مقصد کے لیے سب سے اقرب اور سب سے مختصر راستے کی آگاہی دی جارہی ہے۔ ہمارے مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوبات میں فرمایا ہے کہ طریقۂ نقشبندیہ سب طریقوں سے اقرب ہے کہ یہاں وسیلہ ابوبکر صدیقؓ کی ذات ہے جو تمام پیغمبروں کے بعد افضل البشر ہیں۔ ہمارے خواجگان نقشبند نے خدا سے دعا کی تھی کہ انہیں ایسا طریقہ عطا کیا جائے جو اقرب بھی ہو اور موصل بھی۔ جس کے جواب میں آپ پر اللہ تعالیٰ نے یہ الہام فرمایا کہ تم سلوک پر جذبہ کو مقدم رکھو۔ تصوف کے دوسرے طریقے طالبین کو پہلے بڑی مشقتوں اور ریاضتوں میں ڈالتے ہیں جیسے اربعین کی بیداری یعنی چالیس دن مسلسل روز وشب جاگتے رہنا یا مسلسل بھوکا رہنا۔ دوسرے طریقوں میں نفس کو پہلے مصفیٰ کیا جاتا ہے لیکن ہمارے ہاں مرید پہلے دن سے ہی اسمِ ذات کے وظیفے کے ذریعہ اور شیخ کی توجہ کے سبب، فنا اور بقا کی صفت سے متصف ہوجاتا ہے۔ حضرت مجدد نے حظیرۃ القدس میں فرمایا ہے کہ انہیں کشف سے یہ معلوم ہوا کہ اسم ذات کو جذبہ سے زیادہ مناسبت ہے اس لیے ہم نقشبندیوں کے ہاں روز اول سے ہی اسم ذات کے تکرار کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نفی واثبات کا نمبر بعد میں آتا ہے۔ ہمارے ہاں سلوک کی منزل تیزی کے ساتھ طے ہونے کا سبب یہ ہے کہ تصور شیخ کے سبب مرید کو اپنے شیخ کی ریاضت سے بھی حصہ ملنے لگتا ہے۔ حضرت مجدد صاحب نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ بعض اوقات سلسلہ کے دوسرے شیوخ یعنی فیض رساں ہستیوں کی روحیں سالک کے پاس حاضر ہوکر اعانت فرماتی ہیں۔ اسی منہج تربیت کا کمال ہے کہ بعض سالکین کی تربیت ایسی روحوں کے ذریعہ ہوتی ہے جو صدیوں پہلے وصال کرچکی ہیں۔ سید احمد بریلوی کے بارے میں کہا جاتا ہے، جیسا کہ صراط مستقیم میں شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی نے لکھا ہے، کہ ان کی روحانی تربیت کے سلسلے میں غوث الثقلین اور خواجہ بہاء الدین نقشبند کی روحوں کے درمیان کوئی ایک مہینہ تک اس بات پر نزاع برپا رہا کہ کون انہیں روحانی تربیت کے لئے اپنی کفالت میں لے۔ بالآخر ایک مہینہ کی چپقلش کے بعد اس بات پر مصالحت ہوگئی کہ دونوں مشترکہ طور پر یہ خدمات انجام دیں گے۔ سو ایک دن دونوں حضرات کی روحیں ان پر جلوہ گر ہوئیں اور وہ بیک وقت دونوں سلسلوں کی نسبتوں سے سرفراز ہوگئے۔ یہ جو آپ تصوف کی دنیا میں سنتے ہیں کہ فلاں کو نسبت فاروقی ہے اور فلاں کو نسبت صدیقی یا فلاں کو دو سلسلوں کی نسبت سے سرفراز کیا گیا ہے تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ ان حضرات کو قدماء کی روحوں نے اپنی توجہ اور عنایت سے نوازا ہوا ہے۔ اب ذرا غور کیجئے

سلسلۂ نقشبند سے وابستہ ہو کر آپ کتنے اعلیٰ پائے کے شیوخ اور کتنی قوی روحوں کی فی الفور مدد کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

ہمارے یکے از نقشبندی اکابر امداداللہ مہاجر مکی نے رسالۂ مکیہ میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ مرید کو جاننا چاہئے کہ شیخ کی روح کسی خاص جگہ محدود نہیں ہے۔ روحانی دنیا میں قرب اور بُعد بے معنی الفاظ ہیں جہاں مرید ہوگا وہاں شیخ بھی ہوگا۔ مرید کو شہود حاصل ہو یا نہ ہو شیخ کو اور ان کے اکابر شیوخ کی ارواح کو تو شہود حاصل ہوتا ہی ہے۔ پھر یہ عین ممکن ہے کہ شیخ اپنے مرید کی مدد کے لیے فی الفور حاضر ہو جائے۔ شیخ امداداللہ نے یہ بھی ہدایت کی ہے کہ مرید ہر وقت شیخ کو یاد رکھے اس طرح ربطِ قلب پیدا ہو جائے گا۔ اس کی ذات سے ہر دم استفادہ ہوتا رہے گا۔ اور اسے جب کوئی الجھن پیش آئے گی تو شیخ کو اپنے قلب میں حاضر مان کر بزبان حال سوال کرے گا اور اس طرح شیخ کی روح باذن خداوندی اس کو ان الجھنوں کا حل القا کر دے گی۔ البتہ اس کے لیے ربط دوام شرط ہے۔ اور ہاں عزیزو! یہ بھی جان لو، مجدد الف ثانی نے ہمیں خبر دی ہے کہ بزرگوں کی روحوں سے جب بھی مدد طلب کی جائے دستگیری کے لیے فی الفور پہنچ جاتی ہیں۔

تصوف کی دنیا میں روحوں سے فیض لینے کا معاملہ کوئی نیا نہیں ہے البتہ اس کے مراحل ہیں، سب سے پہلے آپ کا شیخ جس پر آپ کو کامل یقین ہونا چاہئے۔ یہ سمجھئے کہ آپ نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کے حوالے کر دیا ہے۔ آپ شیخ کے چشم و ابرو کے شارے کو سمجھنے لگے ہیں۔ اس کے ہر حکم کو بجالانے کے لیے اپنے اندر والہانہ آمادگی پاتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے آپ کا شیخ آپ کی نگاہوں میں مستحضر رہتا ہے۔ اس درجہ کی آمادگی جب تک حاصل نہیں ہو یہ سمجھئے کہ آپ نے ابھی اس راہ میں پہلا قدم بھی نہیں رکھا۔

دوسرا مرحلہ کبارِ شیوخ کی ارواح سے فیض حاصل کرنے کا ہے۔ کشفِ قبور کے لیے آسان طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت نفل پڑھ کر صاحب قبر کی روح کو ایصال کیا جائے۔ پھر قبر پر اس کے چہرے کے بالمقابل بیٹھ کر مراقب ہوا جائے۔ اسی طرح کچھ نوافل کی ادائیگی کے بعد آپ رسولؐ اللہ کے روضۂ مبارک کی طرف رخ کر کے بیٹھ جائیں اور بند آنکھوں سے مراقبہ میں رسولؐ اللہ سے ربط قائم کرنے کی کوشش کریں۔ اگر آپ کا تصور پختہ ہوگا تو آپ کو کشف کے ذریعہ رسولؐ اللہ کی زیارت حاصل ہوگی پھر آپ ان کے حضور اپنی دعاؤں کی درخواست بھی رکھ سکتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ سرکار دو عالم کی دعا خدا کے حضور ضرور قبول ہوتی ہے۔ رسولؐ اللہ کی زیارت، آپؐ سے کلام کا شرف حاصل کرنا، دعاؤں کی درخواست کرنا، کوئی عام شرف نہیں۔ اس کے

لیے مجاہدے کی ضرورت ہوگی لیکن آپ گھبرائیں نہیں، ہمت نہ ہاریں، خواجگانِ نقشبند کی روحیں آپ کو اس راہ پر آگے بڑھانے کے لیے ہمہ وقت مستعد ہیں۔ اس راہ میں بالآخر وہ مرحلہ آکر رہے گا جب آپ عین عالم بیداری میں رسول اللہؐ کی زیارت سے سرفراز ہوں گے۔

عبدالوہاب شارانی نے لکھا ہے کہ سلف میں بعض ایسے بزرگ گزرے ہیں جو کثرت درود کے سبب جب چاہتے تھے عالم بیداری میں رسول اللہؐ کی زیارت کرلیا کرتے تھے۔ تربیت عشاق میں لکھا ہے کہ بعض اولیاء اللہ اس درجہ کو پہنچے ہوتے ہیں کہ وہ پوری کائنات کو اس طرح دیکھ سکتے ہیں جیسے کوئی ہتھیلی پر تل دیکھ لیتا ہے اور وہ جسے چاہیں اسے دِکھا بھی دیتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ خواجۂ خواجگان کی دعاؤں اور استعانت سے آپ تمام طالبین جو اس راہ میں نکلے ہیں ضرور منزلِ مقصود کو پہنچیں گے۔

شیخ طریقت کی اس پر جوش اور ہمت افزا تقریر کے بعد دوسری مجلس اپنے اختتام کو پہنچی۔ برقی روشنیاں مدھم کردی گئیں۔ نیم تاریک ہال میں ایک بار پھر سالکین تصورِ شیخ کی مشق میں مشغول ہوگئے۔

۱۸

بند ڈبے اور سات لطائف

تیسری مجلس کے پیر طریقت روایتی معلمین کے انداز میں اپنے ہاتھوں میں کچھ قدیم مجلد کتابیں اور نوٹس لے کر طلوع ہوئے۔ کتابوں میں جا بجا رنگین کاغذوں کے ٹکڑے غالباً حوالے کے خیال سے لگائے گئے تھے۔ حلیہ وہی نقشبندی شیوخ کا، سفید لمبی داڑھی، ترکی قمیص پر سبز رنگ کا جبّہ، ایک ہاتھ میں کتابیں اور کاغذات اور دوسرے ہاتھ میں نفیس خوبصورت چھڑی جسے دیکھ کر عصائے پیری سے کہیں زیادہ تنبیہ الغافلین کا خیال آتا ہو۔ صلوۃ وسلام کے بعد اپنی چھڑی ہاتھ میں لے کر حاضرین کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ عزیزانِ من! میری چھڑی کے سنہرے دستے پر ایک شعر نقش ہے میں چاہتا ہوں کہ آج گفتگو اسی شعر سے شروع کروں۔

اے نقشبند عالم نقش مرا بہ بند
نقشم چناں بہ بند کہ گویند نقشبند

دوستو! ایک بار خواجہ بہاؤالدین نقشبند عبدالقادر جیلانی کی قبر مبارک پر تشریف لے گئے اور ان کی قبر پر انگلی رکھ کر فرمادیا کہ یا شیخ عبدالقادر جیلانی خدارا میری دست گیری کریں، میرا نقش باندھ دیں۔ اس کے جواب میں حضرت جیلانی نے آپ کو یہ القا فرمایا کہ آپ لوگوں کے قلب پر اللہ کا نقش باندھ دیا کریں تا کہ ماسوا اللہ کا نقش ان کے دلوں سے محو ہو جائے اور آپ اہل یقین میں نقشبند کی حیثیت سے جانے جائیں۔ دوستو! یہ بزرگوں کی ان ہی ارواح کا فیض ہے کہ آج سلسلۂ نقشبند کو تمام سلسلوں پر تفوق حاصل ہے۔ ہم تصور شیخ اور کشف قبر کے

ذریعہ جو کام مہینوں اور سالوں میں کر لیتے ہیں، دوسرے سلسلوں میں حضوری کی وہ کیفیت زندگیاں گزارنے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی۔ دراصل انسان کا وجود ایک ایسا بند ڈبہّ ہے جس کے ایک سرے پر ایک باریک سراخ ہو جس پر حواس خمسہ کا نمائشی بٹن لگا دیا گیا ہو۔ یہ جو آپ کے اردگرد چلتے پھرتے انسان نظر آتے ہیں، یہ سب بند ڈبے ہیں، سربہ مہر لفافے ہیں، انہیں کیا پتہ کہ اشیاء کی حقیقت کیا ہے۔ بند ڈبوں کی مہر توڑنا اور ان کی مخفی قوتوں کے بٹن آن کرنے کا کام اللہ تعالیٰ نے اولیاء اللہ کو سونپا ہے۔ یہ وہ علم لدنی ہے جو کسی کتاب میں نہیں لکھا گیا اور نہ کوئی ورق اس کے لکھے جانے کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اس کی حقیقت پر وہی لوگ مطلع ہو سکتے ہیں جن کے لطائف بیدار ہوں، جو خود بند ڈبہ نہ ہوں بلکہ ان کی اخفی قوتیں بہ تمام و کمال بیدار اور فعال ہوں۔

ذرا غور کرو اگر کسی کا صرف لطیفہ قلبی بیدار ہو جاتا ہے تو وہ دوسروں کے خیالات پڑھ لیتا ہے۔ اس کے ارادوں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ آپ لوگ راہِ سلوک کے مسافر ہیں۔ آپ کو یہ جاننا چاہئے کہ یہ بند ڈبّہ جسے بعض لوگ انسان کہتے ہیں، ایک ہفت پہل یا ہفت ابعاد کی لطیف روحانی شئے ہے جس کے سات دروازے سات سمتوں میں کھلتے ہیں۔ پہلا لطیفۂ قالبی یعنی جسم ہے۔ دوسرا لطیفۂ انفس یعنی نفس ہے۔ تیسرا لطیفہ قلبی ہے جس کا ابھی میں تذکرہ کر چکا ہوں۔ چوتھا لطیفۂ روحی ہے۔ اور پانچویں کو لطیفۂ سرّی کا نام دیا جاتا ہے۔ چھٹا لطیفہ خفی اور ساتواں لطیفہ اخفا سے موسوم ہے۔ یہ وجود کی ابعاد بھی ہیں اور جہتیں بھی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ایک نورانی شے کو، جو اپنے خالق سے جدا ہو کر دوبارہ اس کے وصل کے لئے تڑپ رہی ہے، اس کی کیفیت اور سریت کو الفاظ میں بیان کیا جانا ممکن نہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ منازل سلوک بیان کی نہیں برتنے کی باتیں ہیں۔ آپ حضرات جب تصور شیخ میں مراقبہ زن ہوتے ہیں تو ہر شخص کا تجربہ ایک دوسرے سے اتنا مختلف ہوتا ہے جسے سلوک کے کسی ڈسپلن کے تابع نہیں کیا جا سکتا۔ خواجگانِ نقشبند کے سامنے وقتاً فوقتاً مریدوں کی طرف سے مختلف مسائل پیش کیے گئے۔ ہمارے کبار شیوخ نے مختلف حالات میں مختلف حل تجویز کیے۔ ظاہر بین مسلمانوں کو یہ سب کچھ عجیب لگتا ہے اس لیے کہ ان کا ڈبہ بند ہے، ان کے لطائف منجمد ہیں۔ بھلا وہ ان حقائق کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ اب دیکھئے میں اس نکتہ کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ حضرت مجدد الف ثانی کو کسی خواجہ محمد اشرف نے اپنی ایک ذہنی الجھن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ میرا تصور شیخ اس حد تک غالب آ چکا ہے کہ میں نماز میں بھی اپنے شیخ کے تصور کو اپنا مسجود جانتا اور دیکھتا ہوں۔ اگر نفی بھی کروں تو منتفی نہیں ہوتا۔ شیخ نے اس کے جواب میں لکھا، جیسا کہ مکتوب نمبر ۳۰، دفتر دوم، حصہ اول میں منقول ہے کہ تصور شیخ کی نفی کی قطعی

ضرورت نہیں، یہ وہ دولت ہے جو طالبان حق کی تمنا اور آرزو ہے، ہزاروں میں ایک کو ملتی ہے۔ پریشان ہونے کی بات بھی کیا ہے۔ وہ شیخ مسجود الیہ ہے، مسجود لہ تو نہیں۔ یعنی اس کی حیثیت اس شخص کی ہے جس کی طرف سجدہ کیا جائے نہ کہ جس کو سجدہ کیا جائے۔ اگر محرابوں اور مسجدوں کی طرف سجدہ کرنے سے نماز میں خرابی واقع نہیں ہوتی تو مرشد کامل کی طرف سجدہ کرنے سے ایسا کیونکر ہوسکتا ہے۔ بظاہر یہ ایک باریک فرق معلوم ہوگا لیکن بند ڈبے والے اس امر پر آگاہ نہیں ہوسکتے۔ یہ کہتے ہوئے شیخ طریقت نے اپنے کاغذوں کی ترتیب بدلی۔ فرمایا کہ جو حضرات چاہیں وہ اپنی سہولت کے لیے ان حوالہ جاتی کتب کے نام نوٹ کرسکتے ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن پر ہماری شریعتِ طریقت کا مدار ہے۔

پھر فرمایا: شیخ کی محبت، اس کا دل میں بسانا فی نفسہٖ فیض کا باعث ہے۔ اس کی طرف توجہ کرتے ہی سمجھو کامیابی کا دروازہ کھل جاتا ہے جیسا کہ مکتوب نمبر ۳۶۰، حصہ چہارم، دفتر اول میں حضرت مجدد صاحب نے فرمایا ہے۔ اگر کوئی عقیدت مند توجہ الی الشیخ میں بھی کامل نہ ہو اور ذکر الٰہی میں بھی اس کا دل نہ لگتا ہو تب بھی فقط محبت کے باعث ہدایت کا نور اس کو پہنچتا رہتا ہے۔ پیر کے بغیر مجاہدے کی کوئی کوشش برگ و بار نہیں لاسکتی۔ اگر ہمیں اس سلسلے کی اہمیت کا اندازہ ہو تو کوئی صحیح الدماغ آدمی پیر کے بغیر روحانی فیوض کے حصول کی سوچ بھی نہیں سکتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں اویسی بن جاؤ لیکن جاننا چاہئے کہ یہ وہ منصب ہے جو حق تعالیٰ یا رسالت مآب یا کبار شیوخ کی ارواح خود عنایت کرتی ہیں۔ مجاہدے سے یہ دولت ہاتھ نہیں آتی۔ یہ ایک بڑا پیچیدہ عمل ہے جس کی حقیقت پر بہت کم اہل دل مطلع کیے گئے ہیں۔ میں آپ کی سہولت کے لیے کچھ مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ دیکھئے یہ بات تو اہل سلوک کے درمیان معروف ہے کہ بایزید بسطامی کو جعفر صادق کی روحانیت سے نسبت ہے جبکہ ان کی پیدائش جعفر صادق کی وفات کے بعد ہوئی۔ آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ ابوالحسن خرقانی کو بایزید بسطامی کی نسبت حاصل ہے۔ اسی طرح بہاء الدین نقشبند کی تربیت حضرت خلیل اور خواجہ امیر کلال کے ہاتھوں ہوئی۔ مگر آپ کے معنوی پیر عبدالخالق غجدوانی تھے جو گو کہ آپ کی آمد سے پہلے واصل حق ہو چکے تھے مگر ان کی روح خواجہ بہاء الدین کے باطن پر جلوہ فگن ہوئی اور اس طرح انہیں اپنی راست تربیت میں لے لیا۔ یہ ان ہی کبار روحوں کے اتصال کا نتیجہ تھا کہ حضرت بہاء الدین کو تصوف میں یہ اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔ محض مجاہدے اور ریاضت سے یہ سب کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ حضرت باقی باللہ نے صاحب قبر سے فیض حاصل کرنے کے لیے اپنے پیر کو واسطہ بنانے کی تلقین کی ہے۔ اپنے خلیفہ تاج الدین کو وہ لکھتے ہیں کہ

ویسے تو مقصود حق ہے۔ ہمارا احجاب درمیان میں نہ ہوتو نورعلیٰ نور ہے۔لیکن پیر کو درمیان میں نہ رکھنا عدم ترقی کا باعث بن جاتا ہے۔

عزیزانِ من! اگر کسی کی انگلی پکڑے بغیر راہ سلوک پر چلنا ممکن ہوتا تو معین الدین چشتی جیسے شخص کو علی ہجویری کے مزار پر چلہ کشی کی ضرورت کیوں پیش آتی۔ آپ جسے بھی شیخ بنائیں اس کی غیر مشروط اتباع کو اپنا فریضہ جانیں۔فنافی الشیخ کا مطلب یہی ہے کہ سالک اپنے آپ کو شیخ کی ذات میں محو کردے۔اس کا اپنا علیحدہ کوئی وجود باقی نہ رہے۔جس طرح آفتاب کے سامنے کسی چیز کا سایہ گم ہوجاتا ہے اور جب وہ اوٹ میں چلا جائے تو اس کا سایہ قائم ہوجاتا ہے۔رسولؐ اللہ چونکہ فنافی اللہ تھے اس لیے راویوں نے لکھا ہے کہ ان کا سایہ نہیں بنتا تھا۔مرید کو بھی اسی طرح فنافی الشیخ ہونا چاہئے۔جب آپ اس مقام پہ آجاتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ بیٹھے بٹھائے کسی مجاہدے کے بغیر اپنے شیخ سے اور شیخ کے شیخ سے بلکہ سلسلہ ذہب کی تمام ارواح سے بیک وقت لامتناہی فیض حاصل کررہے ہیں۔

ہمارے شیخ نے ایک بار اپنا تجربہ بتایا کہ ایک دن جب وہ مصروف مراقبہ تھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کی روح جو ہزاروں میل کے فاصلے پر تھی وہ ان سے اس قدر فیض لیے جارہی تھی کہ انہیں ایسا لگا جیسے وہ خالی ہوئے جاتے ہوں۔توجہ کی تو معلوم ہوا کہ وہ ان کا ہی ایک مرید تھا جو اتنی دور سے انہیں خالی کیے جارہا تھا لیکن فیض الٰہی چونکہ لامتناہی ہوتا ہے اس لیے شیخ کا دامن کبھی خالی نہیں ہوتا اور ہاں یہ بھی جان لو کہ فیض کا سلسلہ زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ کی طرف یکساں جاری رہ سکتا ہے کہ اہل دل کی دنیا میں حیات وموت جیسے الفاظ کچھ معنی نہیں رکھتے۔یہ تو بندڈبے والوں کی اصطلاحات ہیں۔آیئے پورے ارتکاز کے ساتھ مکاشفے کی کوشش کریں۔

اللھم صلی علیٰ/محمد وعلیٰ/آل محمد وسلم کے دائروی ذکر کے ساتھ ہی تیز برقی روشنی مدھم ہوگئی اور نیم تاریک ماحول میں حبسِ دم کے ذریعہ شیخ سے اتصال کی کوشش تیز تر کردی گئی۔

ظہر کی اذان کے ساتھ ہی مکاشفے کی مشق اپنے اختتام کو پہنچی۔ان دو مجالس سے کسی قدر اس بات کا اندازہ ہو چلا تھا کہ سالکین کے اس پروگرام میں آئندہ کیا ہونا ہے۔خیال آیا چوتھی مجلس مغرب کے بعد ہوگی کیوں نہ اس دوران جرّاحی کی خانقاہ کا ایک چکر لگالیا جائے۔مصطفیٰ اوغلو انقرہ گئے ہوئے تھے۔ان کا اصرار تھا کہ وہ مجھے لے کر جراحی کی خانقاہ میں چلیں گے۔انہوں نے اس سلسلے میں شیخ برہان الدین سے بات بھی کرلی

تھی لیکن میں نے سوچا کیوں نہ مہمانِ خاص کے طور پر جانے کے بجائے ایک رجل فقیر کی حیثیت سے چیزوں کا مشاہدہ کیا جائے کہ بسا اوقات خاص اور عام مشاہدے میں وہی فرق ہوا کرتا ہے جو کسی چیز کے ظاہر اور باطن میں ہوتا ہے، بلکہ تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ کسی چیز کے مشاہدے کے لیے خاص اور عام دونوں جہتوں سے اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ تبھی حقیقت کسی قدر منکشف ہو پاتی ہے۔ ورنہ خواص حقیقت کی ایک سطح دیکھتے ہیں جہاں تک عوام کی رسائی نہیں ہوتی اور جو چیز عوام کے حصےّ میں آتی ہے خواص اس کے مشاہدے سے محروم رہتے ہیں۔

۱۹

نقشبندی چال

ایک بار کا ذکر ہے میں دہلی کی جامع مسجد کے علاقے میں کتب خانہ انجمن ترقی اردو کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ ان دنوں میری کتاب غلبہ اسلام تازہ تازہ شائع ہوئی تھی۔ گزرتے ہوئے نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ رک کر پوچھنا چاہیے کہ میری کتاب یہاں دستیاب ہے یا نہیں۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ کتاب موجود ہے۔ میں نے کہا بس یہی معلوم کرنا چاہتا تھا تا کہ اگر آپ کے پاس نہ ہوتو بھجوا سکوں۔ دکاندار نے میرے انداز سے بھانپ لیا۔ پوچھا: کیا آپ ہی اس کتاب کے مصنف ہیں؟ پہلے تو میں نے ٹالنا چاہا پھر ان کے اصرار پر میری زبان سے بس اتنا نکلا: 'اتفاق سے'۔ میری یہ گفتگو اندر بیٹھے ہوئے ایک بزرگ بڑے انہماک سے سن رہے تھے۔ اٹھ کھڑے ہوئے، تیز قدموں سے میری طرف آئے، مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ فرمایا: اتفاق سے نہیں بلکہ حسن اتفاق سے۔ جب سے میں نے یہ کتاب دیکھی ہے اللہ سے دعا کر رہا ہوں کہ وہ میرے لیے اس کتاب کے مصنف سے ملاقات کی کوئی سبیل پیدا کر دے۔ میں بوڑھا آدمی ہوں میرے لیے سفر بہت مشکل ہے۔ اللہ نے میری دعا سن لی اور اس نے خود آپ کو میرے پاس بھیج دیا یہ کہتے ہوئے ان بزرگ نے دوبارہ احترام ومحبت میں میرا ہاتھ تھام لیا۔ دکان کا آدھا حصہ بند کر دیا گیا۔ انہوں نے اپنے بعض احباب کو میری آمد کی فی الفور اطلاع دی اور آناً فاناً ہلکی پھلکی ضیافت کا اہتمام کر ڈالا۔ ڈھیر ساری دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ رخصت کرتے ہوئے فرمایا۔ میں نے آپ کی کتاب حضرت جی کو بھی بھجوائی ہے اور

وہ بھی آپ سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔ ابھی تو آپ علی گڑھ جا رہے ہیں۔ اگلی دفعہ جب دہلی آنا ہو تو مجھے مطلع کیجئے گا میں آپ کو ساتھ لے کر ان کے پاس چلوں گا۔

چند ماہ بعد جب دوبارہ دہلی آنا ہوا تو میں حضرت جی سے ملاقات کی خاطر بستی حضرت نظام الدین جا پہنچا۔ جمعہ کا دن تھا، یہی کوئی بارہ بجے کا عمل ہوگا۔ بنگلہ والی مسجد میں چہل پہل کا سماں تھا۔ میں حضرت جی کی بابت معلوم کرتا ہوا ایک ذمہ دار کے پاس پہنچا۔ کہنے لگے: اجی اگر آپ حضرت جی سے مصافحہ کے خیال سے آئے ہیں تو آج اس کا موقع نہیں۔ بہت کچھ ردوکد کے بعد جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ حضرت جی خود مجھ سے ملنے کے خواہشمند ہیں تو کہنے لگے: اجی کیسی باتیں کرتے ہیں حضرت تو تمام خواہشات سے اوپر اٹھ چکے، انہیں کسی چیز کی خواہش نہیں۔ میں نے انہیں زچ کرنے کے لیے کہا: کیا انہیں خدا کے قرب کی بھی خواہش نہیں؟ ایک نوجوان طالب علم کی زبان سے یہ گستاخانہ باتیں سن کر وہ صاحب کچھ ٹھٹکے، کہنے لگے اچھا ابھی یہیں بیٹھئے۔ تھوڑی دیر میں نماز ہونے والی ہے۔ اس دوران اگر موقع ہوا تو حضرت جی تک اطلاع پہنچا دی جائے گی۔

جمعہ کی نماز کے فوراً بعد وہی صاحب مجھے ایک چھوٹے سے حجرے میں لے گئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ شخصیت کسی قدیم عربی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہے۔ ہاتھ میں پنسل ہے جس سے وقتاً فوقتاً وہ کتاب کے حاشیے پر کچھ علامت بنا دیتے ہیں۔ میں نے ادب سے سلام کیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ بزرگ نے ایک لمحہ کو نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ میں دست بستہ کھڑا انتظار کرتا رہا کہ

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض

پانچ سات منٹ تک کائنات اسی طرح ٹھہری رہی۔ پھر آپ نے خادم کو آواز دی، کچھ ہدایت فرمائی، ایک شخص خالی بالٹی اور لوٹے میں پانی لے کر حاضر ہوا۔ تب حضرت جی نے فرمایا: ہاتھ دھوئیے۔ میری سمجھ میں کچھ بات نہ آئی کہ اچانک ہاتھ دھونے کی کیا تقریب نکل آئی۔ لیکن چونکہ راہ سلوک میں زیادہ سوال کرنے کی ممانعت ہے سو میں نے یہ سوچ کر کہ بلاضرورت ہاتھ دھونا ایک مباح عمل ہے، خشوع وخضوع کے ساتھ ہاتھ دھوئے۔ پھر حضرت جی نے بھی ہاتھ دھو کر تولیے سے خشک کیے۔ بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرمایا: آئیے۔ اب میں حضرت کے پیچھے پیچھے چلا۔ پانچ چھ لوگوں نے حضرت کے گرد حفاظتی حصار سا بنا رکھا

تھا۔ انھیں میں سے ایک صاحب نے مجھے ٹہوکا دیا کہ آپ حضرت کے بالکل ساتھ ساتھ رہیں پیچھے رہ گئے تو پھر شرف ملاقات کا امکان جاتا رہے گا۔ زیریں منزل سے ہوتے ہوئے ہم لوگ پہلی منزل پر پہنچے جہاں بہت سے لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ بالائی منزل پر لوہے کا ایک گیٹ لگا تھا جس کے اندر ہر خاص و عام کو داخلے کی اجازت نہ تھی۔ بعض لوگوں نے میری طرف شک کی نگاہوں سے دیکھا کہ شاید گھس پیٹھیا ہے لیکن یہ دیکھ کر کہ حضرت کے قدم سے قدم ملا کر چلتا ہے اور حضرت خود اسے لیے آتے ہیں، کسی کو روکنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں بھی حضرت جی کے ساتھ اس آہنی دروازے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

بالائی منزل پر دس بارہ لوگ تھے جو غالباً حضرت جی کے منتظر تھے۔ فرشی دسترخوان پر کھانا چنا ہوا تھا۔ بیچ میں ایک گدّا رکھا تھا جس پر حضرت تشریف فرما ہو گئے۔ مجھے اپنے سامنے بٹھایا۔ اب یہ پتہ لگا کہ ہاتھ دھونے کی یہ تقریب کسی بیعت کے خیال سے نہیں بلکہ دراصل کھانے کی دعوت تھی۔ دسترخوان پر دو تین طرح کی سبزیاں اور گوشت کا سالن تھا۔ جا بجا چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں مرغ کی بھنی ٹانگیں رکھی تھیں۔ کہیں قریب ہی کسی گوشے سے لانے والا گرم گرم پھلکے لا رہا تھا۔ حضرت نے میری طرف دیکھتے ہوئے فرمایا: کھائیے۔ شروع کیجیے۔ میری توجہ کھانے پر کم اور اہل مجلس کی حرکات و سکنات پر کہیں زیادہ تھی۔

کوئی پھلکے پر پھلکے صاف کیے جا رہا تھا، کسی کی توجہ مرغ کی بھنی ٹانگوں پر تھی۔ بعض حضرات فربہ اندامی کے سبب دیوہیکل شخصیتوں کے مالک تھے، ایک صاحب کی گردن کے پچھلے حصے پر غیر معمولی ابھار ان کے بے ڈول جسم اور غیر متوازن غذا کی چغلی کھا رہا تھا۔ حضرت جی کی اپنی غذا متوازن اور کھانے کے انداز میں بلا کی متانت تھی۔

مجھے نروس دیکھ کر ایک دو بار از راہ شفقت فرمایا: کھائیے نا، لیجیے نا، آپ تو کھاتے ہی نہیں۔

پھر فرمایا: 'آپ غلبۂ اسلام کرنے چلے ہیں اور آپ کے سر پر ٹوپی نہیں۔ آپ کو ٹوپی پہننا چاہیے'۔

میں نے طالب علمانہ انکسار کے ساتھ کہا کہ میں اسی لیے تو آپ جیسے اہل صفا کی مجلس میں آیا ہوں تا کہ آئینے کے سامنے اپنی کمیوں کا اندازہ ہو سکے اور پھر اصلاح کا داعیہ پیدا ہو۔

پھر فرمایا: ہاں سنیے یہ آپ نے اپنی کتاب کے سرورق پر تصویر کیوں بنا دی ہے۔

میں نے اس غلطی کا بھی فی الفور اعتراف کر لیا۔ اب میری امید بندھی کہ حضرت نے مجھے غلبۂ اسلام کے مصنف کی حیثیت سے پہچان لیا ہے۔ اب وہ کتاب کے مندرجات پر اپنی رائے سے نوازیں گے۔ لیکن

کھانے کے بعد حضرت نے کسی مزید گفتگو یا اگلی ملاقات کا عندیہ دیئے بغیر صرف یہ فرمایا کہ اب میرے آرام کا وقت ہے۔ میں نے سوچا شاید آرام کے بعد ملاقات کی کوئی با قاعدہ تقریب پیدا ہو لیکن مصاحبین نے بتایا کہ حضرت سے آپ کی تفصیلی ملاقات تو ہو چکی۔ اب اس سے زیادہ ملاقات اور کیا ہو گی۔

میں بجھے دلوں کے ساتھ واپس آ گیا۔ تب اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ تبلیغ دین کا یہ عالمی مشن جو بظاہر عمومی بیداری کی ایک مقبول عام تحریک نظر آتا ہے دراصل مشاہدۂ حق کی صوفی تحریک کا ایک حصّہ ہے جہاں عوام کالانعام کو بیعت کی صعوبتوں اور مجاہدہ و مکاشفہ کی مشقتوں کے بغیر اس سلسلے سے جوڑے رکھا گیا ہے۔ ایک خالص صوفیانہ تحریک کو، جس کے اکابرین کی گردنیں نقشبندی بیعتوں سے بندھی تھی، ایک جدید تنظیمی ہیئت عطا کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ چہار دانگ عالم میں اسلام کا ایک منحرف نقشبندی صوفی قالب سوادِ اعظم کا دین بن گیا۔ وہی قصے کہانیاں، خرق عادت کے وہی واقعات، کشفِ قبور کی وہی کرامتیں اور بزرگوں کے وہی محیرالعقل واقعات اہل تبلیغ کے ذہن کی تشکیل کرتے ہیں، جنہیں اہل تصوف کی ملفوظات میں دیکھ کر صالح طبیعتیں ابا کرتی ہیں۔

برصغیر ہند و پاک میں نقشبندی سلسلۂ تصوف کو اس قدر غیر معمولی کامیابی نہ ملتی اور نہ ہی نقشبندی تصور دین عالمی سطح پر جمہور مسلمانوں میں اس قدر مقبول ہو پاتا اگر اسے محض بیعت اور تصور شیخ کی ازکا رِرفتہ اسٹریٹجی کے ذریعہ آگے بڑھایا گیا ہوتا۔ مولانا الیاس اور ان کے رفقاء نقشبندی سلسلے سے بیعت اور نقشبندی تصور اسلام کے پروردہ تھے انہوں نے عوام کالانعام کو مکاشفے اور مراقبے کی راہ پر تو نہیں لگایا لیکن ان کے دلوں پر اہل کشف کی برتری قائم کی اور صوفیاء کے بے سروپا قصے کہانیوں کو مستند دین کے طور پر پیش کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجدد وانی اور نقشبندی کا دین تو اقصائے عالم میں پھیل گیا جبکہ محمدؐ رسول اللہ کا دین خود مسلمانوں میں اجنبی ہو کر رہ گیا۔

تبلیغی جماعت کے مؤسّسین کی نقشبندی شناخت کو ذہن میں رکھیے تو فضائل اعمال جیسی کتابوں کا ملفوظات کے طور پر پڑھنا آسان ہو جاتا ہے۔ پھر اگر ایک نقشبندی بزرگ کی کتاب میں آپ کو اس طرح کا واقعہ ملے، جیسا کہ فضائل ذکر میں منقول ہے کہ حضرت ممشاد دنیوری کے انتقال کے وقت جب لوگوں نے ان کے لیے جنت کی دعا کی تو آپ ہنس پڑے۔ فرمایا تیس برس سے جنت میرے سامنے ظاہر ہو رہی ہے لیکن میں نے ایک دفعہ بھی ادھر توجہ نہیں کی۔ اسی طرح فضائل نماز میں کسی حضرت ثابت کے بارے میں لکھا ہے کہ

وہ کثرتِ گریہ کے ساتھ خدا سے دعا کیا کرتے تھے کہ اگر قبر میں نماز پڑھنے کی اجازت ہوسکتی ہے تو مجھے بھی ہوجائے۔ کہتے ہیں کہ دفن کرتے ہوئے لحد کی ایک اینٹ گرگئی تو دیکھنے والے نے کیا دیکھا کہ وہ کھڑے قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ اسی فضائل نماز میں اہل کشف کی بابت یہ بھی لکھا ہے کہ وہ گناہوں کے زائل ہونے کو بھی محسوس کر لیتے ہیں۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب وہ وضو کا پانی گرتے ہوئے دیکھتے تو یہ محسوس کر لیتے کہ کون سا گناہ اس میں دھل رہا ہے۔ فضائل ذکر میں دوزخ سے نجات کا یہ آسان نسخہ بھی بتایا گیا ہے کہ جو شخص ستر ہزار مرتبہ لا الہ الا اللہ پڑھ لے اِسے دوزخ کی آگ سے نجات مل جاتی ہے بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ستر ہزار کا یہ توشہ کسی جہنمی کو بھیج کر اس کی نجات کا سامان کردیں۔ شیخ قرطبی نے کسی صاحب کشف نوجوان کے ہاتھوں اس نصاب کی صداقت کا تجربہ بھی کیا ہے جس کی بابت مولوی زکریا نے قارئین کو مطلع فرمایا ہے۔ فضائل حج میں حضورؐ کے اپنی قبر میں زندہ ہونے پر شواہد فراہم کیے گئے ہیں۔ اسی طرح فضائل حج میں ایک نوجوان کی بابت لکھا ہے کہ جب محدث عبدالرزاق مسجد نبوی میں حدیثیں سنا رہے تھے اس وقت یہ شخص بے اعتنائی کے ساتھ ایک گوشہ میں بیٹھا تھا۔ لوگوں نے پوچھا کہ تمام مجمع حضورؐ کی حدیثیں سن رہا ہے تم ان کے ساتھ مجلس میں شریک کیوں نہیں ہوتے۔ اس نوجوان نے سر اٹھائے بغیر بڑی بے اعتنائی سے کہا کہ اس مجمع میں وہ لوگ ہیں جو رزاق کے عبد سے حدیثیں سنتے ہیں اور یہاں وہ ہے جو کہ خود رزاق سے سنتا ہے نہ کہ اس کے عبد سے۔ اسی فضائل حج میں یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگ کعبہ کے طواف کے لیے مکہ جاتے ہیں اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ خود کعبہ ان کے طواف کو آتا ہے۔ آگے چل کر کسی مالک بن قاسم جبلی کے طے الارض کا واقعہ لکھا ہے جنہوں نے ایک ہفتہ سے کچھ نہیں کھایا تھا اور ان کے ہاتھ سے گوشت کی خوشبو آنے کا سبب یہ تھا کہ وہ مکہ سے ستائیس سو میل دور اپنے وطن میں اپنی والدہ کو کھانا کھلا کر بعجلت آ گئے تھے تاکہ حرم میں فجر کی نماز ادا کرسکیں۔

عام مسلمانوں کو یہ محیر العقل واقعات خلاف عقل اور خلاف وحی معلوم ہوسکتے ہیں لیکن جن لوگوں کی نظر ملفوظاتی ادب اور نقشبندی اسلام کے اصول ومبادی پر ہے ان کے لئے طے الارض، کشف قبور اور مشاہدۂ حق کے یہ واقعات چنداں حیرت انگیز نہیں۔ ہاں حیرت اس پر ضرور ہوتی ہے کہ کس خوش اسلوبی کے ساتھ نامحسوس طریقے پر غالی نقشبندی صوفیاء کے منحرف تصور دین کو آج اسلام کے مستند قالب کے طور پر دیکھا جا رہا ہے اور طرفہ یہ ہے کہ سادہ لوح مسلمان اس کی فروغ واشاعت میں اپنی عاقبت کی ضمانت پاتے ہیں۔

نظام الدین کے تبلیغی مرکز میں کسی توسط کے بغیر میں ایک عام طالب علم کی حیثیت سے گیا تھا۔ پھر بہت کچھ تگ و دو کے بعد حضرت جی کے خاص لطف و کرم سے مجھے خواص کے حلقے میں داخلہ مل گیا۔ اور ایک جواں سال مصنف کی حیثیت سے ان کی شفقتوں کا سزاوار بھی ٹھہرا۔ اس طرح عوام اور خواص دونوں کی سطح پر مرکز کی ایک جھلک دیکھنے کو مل گئی۔ عام سے خاص بننے کا عمل کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا البتہ اگر ایک بار آپ خواص میں شمار کر لیے گئے تو پھر عوامی سطح پر چیزیں جیسی کہ ہیں ان تک رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ سو یہ سب سوچ کر میں نے جراحی کی خانقاہ، مصطفیٰ اوغلو کی رہنمائی اور ان کے اہتمام کے بغیر دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ نظام الدین میں خواص اور عوام کے دو مختلف معیار زندگی، جس کا اظہار دو مختلف قسم کے دستر خوان سے ہوتا تھا، پر تحریک ایمان کا پردہ پڑا تھا۔ بانیان تحریک کی نظری شناخت ان کے تاریخی اور صوفیانہ پس منظر اور ان کی کتابوں کا اس مخصوص پس منظر میں تحقیق و تجزیہ کا تب خیال بھی نہ آیا تھا سو ہر دو حلقے میں چلت پھرت کے بعد بھی اس وقت تحریک کی اصل ماہیت اور اس کے غایت و اہداف کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا۔ بات یہ ہے کہ جب تک آپ چیزوں کو اس کے اصل پس منظر میں نہیں دیکھتے، کڑیاں سے کڑیاں نہیں ملتیں، حقیقت پوری طرح منکشف نہیں ہوتی۔

مجھے یاد ہے کہ وینس کے پہلے سفر میں جب سین مارکو کے ساحل پر میری کشتی رکی اور میں اپنے میزبان کے ساتھ ڈاجز پیلس سے ہوتا ہوا پیازا اسین مارکو اور پھر ریواڈیگلی شیوانی سے ہوتا ہوا ریالٹو برج تک آیا تو عمارتوں کا خالص مشرقی طرز تعمیر دیکھ کر چند ثانیے کے لیے کچھ مبہوت سا ہو گیا تھا۔ میرے لیے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ اس قدر خالص مشرقی بلکہ اسلامی طرز تعمیر پر مشتمل مغرب کا کوئی شہر ہو سکتا ہے۔ پھر جب ہوٹل کے بل پر مقامی رسم الخط میں فاتورہ لکھا دیکھا تو مزید حیرت ہوئی کہ اہل عرب کی طرح یہاں بھی بل کو فاتورہ کہتے ہیں۔ سیر و سفر کا سلسلہ مزید وسیع ہوا اور مجھے یہ معلوم کر کے ابتداً حیرت ہوئی کہ اسپین اور پرتگالی عیسائیوں کی زبان سے عربی کے دسیوں الفاظ مسخ شدہ شکلوں میں نکلتے ہیں۔ حتیٰ کہ پرتگالیوں میں وعدہ وعید کرتے ہوئے اوشااللہ یعنی انشاء اللہ کہنے کا رواج بھی عام ہے۔ لیکن جب یورپ کی اسلامی تاریخ اور عہد وسطیٰ کے تہذیبی تعاملات کا گہرائی سے مطالعہ کا موقع ملا تو وینس کی مشرقی عمارتیں اپنی تمام تر تاریخی اور مذہبی معنویت کے ساتھ خاص تاریخی پس منظر میں روشن روشن ہو گئیں۔ ابہام جاتا رہا، ایسا لگا جیسے کڑیوں سے کڑیاں مل گئی ہوں۔ تبلیغی مرکز کے پہلے سفر پر آج کوئی ربع صدی گزرنے کے بعد اب کہیں جا کر اس کی اصل معنویت اور اس کی غایت واہداف کا کسی قدر اندازہ ہو سکا۔ جب تک نقشبندی تصوف سے اکابرین تبلیغ اور اکابرین دیوبند کے گہرے

تعلق کا علم نہ ہو اور خود نقشبندیت کی اصل حقیقت سے آپ کی آگہی نہ ہو فضائل کی کتابوں میں خرق عادت واقعات پڑھ کر اور بزرگوں کے بیانات میں کشف و کرامات کا ذکر سن کر آپ صرف اس نوجوان کی طرح مبہوت ہو سکتے ہیں جو میری طرح تاریخی اور تہذیبی پس منظر سے ناواقف اچانک وینس جا پہنچا تھا۔

۲۰

من أذى جاره ورثه الله دياره

کاراگمرک میں جراحی کی خانقاہ کی زیارت سے پہلے اسی خیال سے میں نے خاصی معلومات بہم پہنچالی تھی۔خلوتیہ سلسلے کی جراحی کی یہ خانقاہ دراصل سہروردیہ کی ایک برانچ ہے۔وہی شہاب الدین سہروردی جو اپنی زیرزمین سیاسی سرگرمیوں کے سبب نظام وقت کے ہاتھوں شہاب الدین مقتول بنے۔لیکن عامۃ الناس کو ان کے اصل سیاسی عزائم کا پتہ کم ہی ہے۔شام کے جھٹپٹے میں جب میں جراحی کی خانقاہ میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک عجیب ہیئت کذائی میں ایک مجذوب سا شخص سیاہ وسفید بلّی سے کھیل رہا ہے۔سیاہ بلّی کی شعلہ بار آنکھوں سے ایک پراسرار وحشت ہویدا تھی جسے سفید بلّی کی موجودگی نے کسی قدر سنبھال رکھا تھا۔صدر دروازے پر بلیوں کی موجودگی سے پہلے تو یہ اندازہ ہوا کہ شاید یہ بلیوں والے بابا کی خانقاہ ہو لیکن اندر ماحول خاصا مانوس سا تھا۔جابجا دیواروں پر مختلف قسم کے طغرے لٹک رہے تھے۔ایک نسبتاً بڑے فریم پر یا حضرت پیر سلطان سید محمد نورالدین الجراحی لکھا تھا اور ٹھیک اس کے اوپر یا شاہ شہیداں کا فریم آویزاں تھا۔فرشی مجلس کی مناسبت سے ہال کے ایک جانب پیر طریقت کی کرسی لگی تھی۔جس کے اوپر یکے بعد دیگرے تین مختلف فریم آویزاں تھے جن میں ایک تصویر شیخ مظفر اوزک کی تھی۔یہ وہی شیخ مظفر ہیں جنھوں نے سترّ کی دہائی میں جراحی سلسلے کو مغرب میں متعارف کرایا۔کینیڈا، امریکہ اور دوسرے مما لک میں اس کی شاخیں قائم کیں۔

خانقاہ میں اس وقت کچھ زیادہ چہل پہل نہ تھی سو میں نے سوچا کہ عمارت کے اردگرد کا ایک جائزہ لے لیا جائے۔ میری نظر ایک کتبہ پر آ کر رک گئی، لکھا تھا:

مَن اذیٰ جارہٗ ورثہ الله دیارہٗ

کتبہ میں میری دلچسپی دیکھ کر ایک صاحب قریب آئے، پوچھا: کیا آپ عربی زبان سے واقف ہیں؟
میں نے کہا: جی ہاں واقف تو ہوں لیکن مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔
فرمایا: ارے یہ حدیث ہے۔ آپ نہیں جانتے؟
میں نے کہا: لیکن میری نظر سے یہ حدیث پہلے کبھی نہیں گزری۔

آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ انہوں نے غالباً میرے مبلغ علم کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ فرمایا: میں تیرہ سال سے نیویارک کی جراحی خانقاہ سے وابستہ ہوں، یہاں سال میں ایک دوبار آنا ہو جاتا ہے۔ یہ جو آپ حدیث دیکھ رہے ہیں اس کے پیچھے ایک تاریخ ہے۔ نورالدین جراحی جب استنبول تشریف لائے تھے تو ان کی آمد سے پہلے جانفدا مسجد کے مؤذن کو خواب میں رسولؐ اللہ نے یہ حکم دیا تھا کہ وہ حضرت پیر نورالدین کے لیے مسجد میں ایک حجرۂ تنہائی تعمیر کر دیں۔ رسولؐ اللہ نے بتایا تھا کہ پیر کے دن حضرت پیر استنبول تشریف لے آئیں گے۔ سو ایسا ہی ہوا۔ البتہ جب مسجد میں درس وارشاد اور ذکر وسماع کی محفلیں منعقد ہونے لگیں اور حال ودھمال کے سبب خلقت جمع ہونے لگی تو بکر آفندی کو جس کا محل مسجد کے پڑوس میں واقع تھا، اور جہاں اس وقت آپ کھڑے ہیں، جواب خانقاہ کا حصہ ہے، سخت اعتراض ہوا۔ اس نے حضرت پیر کی مخالفت شروع کر دی۔ اسے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ اہل اللہ کی مخالفت کا انجام کیا ہوتا ہے۔ لہٰذا ابھی چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ وہ فالج کا شکار ہو کر مر گیا اور اس کے وارثین اس محل کو نیلام کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان ہی دنوں سلطان احمد ثالث نے ایک خواب دیکھا کہ رسولؐ اللہ اس سے کہہ رہے ہیں کہ تم بکر آفندی کے محل کو خرید کر نورالدین کی خانقاہ کے لیے وقف کر دو۔ قصہ کا ماحصل یہ ہے کہ نگاہِ مردمومن سے بکر آفندی کے محل کی تقدیر کچھ ایسی بدلی کہ جراحی کی خانقاہ میں تبدیل ہو گیا۔ سو یہ واقعہ اس حدیث کی صداقت پر دال ہے جس میں کہا گیا ہے کہ 'جو شخص اپنے پڑوسی کو اذیت دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گھر کا اس کو مالک بنا دیتا ہے'۔

حدیث کا یہ پس منظر سن کر نہ صرف یہ کہ یہ حدیث پوری طرح میری سمجھ میں آ گئی بلکہ اس بات کا بھی کسی قدر اندازہ ہو گیا کہ حدیث کے مقبول عام مجموعوں میں یہ حدیث کیوں نہیں پائی جاتی۔

یہ تو حضرت پیر کی ایک کرامت ہوئی۔اس کے علاوہ اور کون سی کرامتیں آپ سے منسوب ومشہور ہیں؟ میں نے ان سے جاننا چاہا۔

فرمایا ایک تو یہی بات ہے کہ حضرت پیر کے مرقد پر دعائیں جلد قبول ہوتی ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس خانقاہ کے زائرین سے یہ وعدہ کر رکھا ہے۔

اچھا؟ واقعی؟ میری حیرت کو بھانپتے ہوئے انہوں نے پوچھا کہ کیا آپ نے اس قدیم پیشن گوئی کا وہ حصہ نہیں پڑھا جس کا ذکر شیخ کی آمد سے تین سو سال پہلے امام احمد شرنوبی نے اپنی کتاب طبقات الأولیاء میں کیا ہے اور جس کا ایک قلمی نسخہ فاتح کی لائبریری میں بھی موجود ہے۔

تو کیا طبقات الاولیاء کا کوئی نسخہ یہاں خانقاہ میں بھی موجود ہے؟ میں نے جاننے کی کوشش کی۔

فرمایا: کتاب کی بابت تو میں نہیں کہہ سکتا البتہ قلمی نسخہ کے اس صفحہ کا عکس یہاں زائرین کے لیے موجود ہے، یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا، اندر راہداری میں ایک بوسیدہ فریم کے پاس جا کر رک گئے، میں نے بمشکل پڑھنے کی کوشش کی۔لکھا تھا:

> ومنهم سيد نورالدين الجراحي ساكن الاستنبول العليا، ياتي في عام خمسة عشرة ومائة بعد الألف، يعيش من العمر أربعة وأربعين سنة۔ من كرامته أن الله تعالي يتكرمُ عليه يوم موته ويدخل الجنة ومنها أنه سأل الله تعالي ماهوفي عالم الغيب۔ إن الله يكرمه زواره فتستجاب لدعواتهم ۔
>
> یعنی ان میں ایک استنبول کے نورالدین جراحی ہیں جن کا ظہور سال ۱۱۱۵ھ (۴-۱۷۰۳ء) میں ہوگا۔ وہ چوالیس سال زندہ رہیں گے۔ان کی کرامتوں میں سے ایک کرامت یہ ہوگی کہ وہ جس دن مریں گے اسی دن داخل جنت کیے جائیں گے۔وہ خدا سے جو کچھ مانگیں گے انہیں غیب سے عطا کیا جائے گا۔خدا ان کی اور ان کے اہل خانہ کی قبروں کی زیارت کرنے والوں کی دعائیں قبول فرمائے گا۔

میں نے پوچھا اچھا یہ بتایئے کہ یہ کیسے پتہ چلے گا کہ شرنوبی کی یہ کتاب جس کے قلمی نسخہ میں اس پیشن گوئی کا تذکرہ ہے یہ حصہ واقعتاً جراحی کے ظہور سے پہلے تالیف پا چکا تھا کہ قلمی نسخوں میں اس قسم کے اضافے حسب ضرورت کیے جاتے رہے ہیں۔اس قسم کے الحاقات کا سلسلہ بڑا طویل اور دلچسپ ہے۔میرے اس

اعتراض پر وہ کچھ جز بز ہوئے۔فرمایا ایک دو کرامت ہوتو اس کا انکار کیا جائے۔اب اسی بات کو لیجئے کہ یہاں پیرنورالدین عین اپنی ماں کے قدموں کے نیچے مدفون ہیں جو دراصل اس حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ الجنة تحت اقدام الامهات۔ رہا دعاؤں کے مستجاب ہونے کا معاملہ تو اس کا تو مجھے بھی بارہا تجربہ ہوا ہے کہ یہاں آ کر سکینت کا جو احساس ہوتا ہے اور دعائیں جس طرح آسانی سے قبول ہو جاتی ہیں اس کی نظیر کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی۔اگر یہاں دعاؤں میں تاثیر نہ ہوتی تو امریکہ اور یوروپ کے مختلف شہروں سے مریدوں کی آمد کا سلسلہ نہ لگا رہتا۔

میں ان کے اعتقاد کو مجروح کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اللهم أرني الأشياء كما هي کی دعا کو جسے میں نے ایک مدت سے حرز جاں بنا رکھا ہے اور جس کے سبب اشیاء گاہے اپنی اصل ہیئت میں نظر آ جاتی ہیں، اس کے فیض سے انہیں بالکل محروم رکھوں۔سو میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا، ایک بات بتاؤں کہیں آپ کے اعتقاد کو ٹھیس تو نہیں لگے گی!

مسکراتے ہوئے بولے: نہیں بالکل نہیں،ضرور فرمائیں۔

میں نے کہا کہ تہذیب اور تصوف کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے ان کرامتوں اور پیشن گوئیوں کے پس منظر سے بھی کسی قدر واقفیت ہے۔میری بات کو حتمی صداقت کے طور پر قبول مت کیجئے لیکن اگر کبھی وقت اجازت دے تو ان سوالات کی کرید ضرور کیجئے گا کہ جراحی کہ یہ خانقاہ جب قائم ہوئی ہے تو اس کا سبب خواب میں سلطان وقت کو رسولؐ اللہ کی بشارت تھی یا اس کے پیچھے کوئی سیاسی محرک بھی تھا۔ایک شخص اچانک اپنے خدام کے ساتھ استنبول میں وارد ہوتا ہے۔ابتداً جانفدا مسجد میں اس کے قیام کا انتظام ہوتا ہے اور پھر جلد ہی اس کی سرگرمیوں کے لیے ایک محل نما مکان خرید کر اسے عطا کر دیا جاتا ہے۔یہ تو رہی نورالدین جراحی کی بات۔خود خلوتیہ سلسلے نے جب سلطان بایزید کے عہد (۱۴۸۱ء۔۱۵۱۱ء) میں استنبول کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا ہے تو اس کے پیچھے کسی الہام یا بشارت کے بجائے بایزید کی تخت نشینی تھی۔بایزید کے تیس سالہ عہد میں خلوتیوں کو بڑا عروج ہوا۔استنبول کے ایک بڑے بازنطینی چرچ کو خلوتیوں کی خانقاہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ایسا اس لیے کہ خلوتی صوفیوں نے ایامِ شہزادگی میں سلطان کی بھرپور معاونت کی تھی۔خطرات مول لیے تھے۔ترک سلاطین سے مختلف صوفی سلسلوں کے بڑے قریبی روابط رہے۔ان کی ایماء پر تقرریاں عمل میں آتی رہیں۔آپ کو شاید یاد ہو کہ خلافتِ عثمانیہ کے زوال کے ایام میں مولوی فرقے کے صوفیاء نے حکومت کو بچانے کے

لیے باقاعدہ مسلح جدوجہد میں حصہ لیا تھا اور پھر خلافت کے سقوط کے بعد مصطفیٰ کمال کے سیکولر عزائم کو شکست دینے کے لیے شیخ سعید اوران کے حامیوں نے مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کیا تھا۔اس لئے اگر شیخ نورالدین کو اپنی سرگرمیوں کے لیے حکومت کا بھرپور تعاون حاصل رہا تو ایسا کسی کرامت کے سبب نہیں بلکہ نظام وقت کی سیاسی ضرورت کے تحت تھا۔

میری ان باتوں سے ان صاحب کے چہرے پر حیرت کے آثار ہویدا ہوئے پھر ایسا لگا جیسے وہ اپنے شیوخ کی مدافعت میں کچھ کہنا چاہتے ہوں،ان کی زبان سے صرف اتنا نکلا: چلیبی سلطان!

پھر فرمایا: دیکھئے بعض لوگوں نے اہل صفا کو بدنام کرنے کی بڑی کوشش کی ہے۔اہل اللہ کے دروں پر ہمیشہ سلاطین نے حاضری دی ہے۔وہ ان کی دعاؤں کے طلب گار رہے ہیں۔ان پر سیاسی عزائم کا الزام لگانا میرے خیال میں اہل اللہ کی سخت توہین ہے۔

لیکن تاریخ تو تاریخ ہے اس کے تلخ حقائق کو خوش عقیدگی کے پردے میں نہیں چھپایا جا سکتا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا اوران کے جلال میں مزید اضافہ ہوتا مغرب کی اذان نے ہمارے لیے اس مناقشہ سے رہائی کا سامان کردیا۔

جراحی کی اس خانقاہ کو خلوتیہ سلسلے کے عالمی مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔سوچا کیوں نہ مرکزی ہیڈکوارٹر میں مجلس ذکر وسماع کا لطف لیا جائے جہاں پچھلی کئی صدیوں سے ایک خاص انداز کے ذکر کی روایت چلی آتی ہے۔عشاء کے کچھ دیر بعد ذکر کی مجلس شروع ہوئی۔مرد حضرات دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے۔اوپر کی منزل میں لکڑی کے جھروکوں کے پیچھے خواتین نے اپنی جگہ لے لی۔اولاً کورس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو تین مصرعوں میں پڑھنے کی کوشش کی گئی یعنی بسم اللہ/ ہر رحما/ نر رحیم۔پھر کچھ دیر تک نفی اثبات کا ذکر جاری رہا۔صلوۃ وسلام کے بعد لوگ اٹھ کھڑے ہوئے البتہ دائرہ برقرار رہا۔پھر اللہ حیّ کی ورزش شروع ہوئی۔لوگوں نے ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دائرے کو مضبوط کیا۔دائرہ اب گردش میں تھا۔اللہ حیّ اللہ حق کی آواز تیز ہوتی جارہی تھی۔اسی دوران دوسماع زن دائرے کے بیچ رقص کرنے لگے۔حیّ حیّ کی آواز لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جاتی تھی اوراس کے ساتھ ہی گردنوں کی جنبش میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔کچھ دیر کے بعد حیّ حیّ کی آواز متعینہ آہنگ کے ساتھ کم ہوتی گئی اور پس منظر میں دعائیہ کلمات جاری ہوگئے۔ذکر کا یہ سلسلہ کوئی آدھی رات تک چلتا رہا۔

سفینۂ نور کے مقابلے میں جراحی ذکر میں کچھ کیف کی کمی کا احساس ہوا۔شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہی

مناسک اور وہی حرکتیں اگر بار بار دہرائی جائیں تو پھر شاید اس کا لطف جاتا رہتا ہے۔صوفیاء کے لیے بھی یہ کچھ آسان نہیں کہ وہ روز نئی نئی روحانی ورزشیں اور ذکر کے نئے نئے طریقے ایجاد کریں البتہ ہر سلسلے کے اندر جب ایک نیا بانی پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے نام سے ایک نئی شاخ کی ابتدا کرتا ہے تو وہ جاری رسوم میں کچھ نئی رسومات، کچھ نئے اوراد و وظائف کا اضافہ کر جاتا ہے جیسا کہ نورالدین الجراحی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ نے خاص اسمائے حسنیٰ کا نزول کیا، بعض دعاؤں کی تعلیم دی اور انہیں ورد کبیر صباحیہ اور ورد صغیر مسائیہ کے بجالانے کی تلقین کی گئی۔ مجھے یہاں آکر ان اسماء اللہ الحسنیٰ کا پتہ تو نہ چل سکا البتہ اس بات کا اندازہ ضرور ہوا کہ نئی نئی عبادتوں کی ایجاد کے شوق میں روحانیوں کے تمام ہی فرقوں نے بڑی ہی شقاوت قلبی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ذکر کے یہ مختلف طریقے اور مکاشفہ، مجاہدہ، مراقبہ جیسی تمام ورزشوں کی حیثیت ایجادِ بندہ سے زیادہ نہیں۔البتہ جب ایک بار یہ سلسلہ چل نکلا تو پھر ہر نئے آنے والے بانی سلوک نے اپنی علیحدہ شناخت کے لیے نئے اضافوں کا سلسلہ جاری رکھا۔مثلاً بوسنیا اور کوسووو کی نقشبندی خانقاہوں میں جہاں خواتین اپنی علیحدہ مجلسیں منعقد کرتی ہیں ذکر یہ کلمات کہتے ہوئے ایک دائرے میں مسلسل چلتی جاتی ہیں۔اس طرح تیس چالیس خواتین کا ایک دائرہ حالت ذکر میں طواف مسلسل کی صورت حال سے دوچار رہتا ہے۔ ہمارے ہاں شطاری صوفیوں نے جن کا ہندو جوگیوں اور سنّاسیوں سے گہرا تعامل رہا ہے، انہوں نے تو باضابطہ مختلف قسم کی نمازیں بھی ایجاد کر رکھی ہیں۔شیخ محمد غوث کی جواھر خمسہ کا مطالعہ اس حقیقت سے پردہ اٹھانے کے لیے کافی ہے کہ روحانیوں نے کس طرح عبادت اور ریاضت کے پردے میں دینِ اسلام کا تمسخر اڑانے کی کوشش کی ہے۔ شطاریوں کی ایجاد کردہ نماز احزاب، نماز تنویر القبر اور صلوٰۃ العاشقین جیسی عبادتیں ہوں یا اسمائے اکبریہ اور دعائے بسیح کے نام سے قدیم یہودی توہمات کے احیاء کی کوشش، ان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مختلف زمانوں میں تصوف کے پردے میں کس طرح دین اسلام پر شب خون مارنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ جب ایک بار دین میں نئی نئی ایجادات کا سلسلہ چل نکلا اور صوفی شیخ کو یہ اجازت مل گئی کہ وہ اپنے مرید کے لیے اس کے حسب حال اوراد و وظائف اور عبادت کا ایک میزانیہ متعین کرے تو گویا ہر نئے آنے والے کے لئے نئی اختراعات کا جواز پیدا ہو گیا۔استنبول کے اس سفر میں جب مجھے ہارون یحییٰ کی ایک مریدہ نے یہ بتایا کہ ان کے شیخ کے تقویٰ کا عالم یہ ہے کہ وہ ہر نماز وضو کے بجائے غسل سے پڑھتے ہیں اور قرآن مجید کی تلاوت کے دوران مسلسل حالت قیام میں رہتے ہیں، تو مجھے اس بیان پر کچھ زیادہ تعجب نہ ہوا۔

۲۱

بے گفتہ سبق

اگلی صبح قدرے تاخیر سے اسمٰعیل آغا پہنچا۔ راہدری میں چہل پہل دیکھی۔ پتہ چلا کہ چائے کا وقفہ ہے پہلی مجلس ابھی ختم ہوئی ہے۔ ہاشم نظر نہ آئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا ابھی بعض شرکاء ہال کے اندر ہی ارتکاز مکاشفہ میں مصروف ہیں۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد اگلی مجلس کی شروعات ہوئی۔ اسکرین پر اولاً نظامِ شمسی کی مختلف تصاویر طلوع ہوئیں۔ مناظر بدلتے رہے۔ ایسا لگا جیسے ہم لوگ کسی رصدگاہ میں ہوں جہاں لامحدود کائنات کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھنے کو ہو۔ پھر مختلف سیاروں کی ایک تصویر اسکرین پر آکر ٹھہر گئی۔ ایک طرف گول نورانی دائرے میں عربی رسم الخط میں لفظ رابطہ لکھا تھا جس کی شعاؤں سے ایک نورانی راستہ بسمت فلک (لامکاں) جاتا دکھایا گیا تھا۔

شیخ طریقت نے عجمی لہجہ میں اللہ نور السمٰوات کی آیت تلاوت کی۔ پھر فرمایا لوگو! آیت نور کو ہم اہل تصوف کے ہاں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ نور ہے کیا؟ اللہ نور ہے۔ یہ کائنات نور سے بنائی گئی ہے، انسانوں کے اندر نور کی کارفرمائی ہے۔ ظاہر بیں حضرات اس حقیقت سے واقف نہیں کہ ہماری ابتدا بھی نور ہے اور انتہا بھی نور۔ ہم نور سے نکلے ہیں اور نور میں ہی ہمیں واپس جانا ہے۔ ابلیس کو آدم کے سجدے کا حکم اسی نور کے سبب ہوا جو اللہ نے آدم کی پیشانی میں رکھا تھا۔ یہی نور من نور اللہ ہے جس سے اہل کشف باطن کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ جن کی آنکھیں بند ہوں یا جو اندھے ہوں، یہ باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ شریعت میں اندھے امام کو خواہ وہ قرآن اور فقہ کا ماہر ہی کیوں نہ ہو آنکھ والوں پر ترجیح نہیں دی جاتی۔ یہ تو

ظاہری اندھے کی بات ہوئی اب جو لوگ باطنی طور پر اندھے ہیں ان کی قباحت کا اندازہ آپ خود ہی کر سکتے ہیں۔

عزیزانِ مَن! باطن کی آنکھ آسانی سے نہیں کھلتی۔ جس طرح اندھا کسی صاحب بینا کی انگلی پکڑ کر چلتا ہے اسی طرح آپ کو کسی شیخ کامل کی شاگردی اختیار کرنی ہوتی ہے۔ اور شاگردی بھی ایسی کہ جسے ہم اہل تصوف فنافی الشیخ کہتے ہیں۔ بقول حافظ شیرازی:

بہ مے سجادہ رنگین کن گرد پیرمغان گوید کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزلہا

یعنی پیرمغان اگر تجھ سے کہے تو مصلےّ کو بھی شراب سے رنگ لے کہ سالک منزلوں کے رموز سے بے خبر نہیں ہوتا۔ جب تک آپ اپنے آپ کو پوری طرح شیخ کے حوالے نہیں کرتے، شیخ کے فیض سے محروم رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ہمارے شیخ نقشبند مجدد الف ثانی کی خدمت میں ایک عالم تشریف لائے۔ کچھ دیر بیٹھے رہے لیکن شیخ نے آپ سے کچھ کلام نہ کیا۔ جاتے ہوئے وہ لوگوں سے کہہ گئے کہ میں آیا تو اس خیال سے تھا کہ شیخ سے کچھ فیض حاصل ہوگا لیکن شیخ مجدد نے کچھ کلام ہی نہ کیا۔ جب حضرت مجدد کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ جو ہماری خاموشی سے فیض حاصل نہ کر سکا وہ بھلا ہماری گفتگو سے کیا فیض حاصل کرے گا۔ عزیزو! شیوخ کی مجلسوں میں ادب اور خاموشی کی صورت حال دیکھ کر ظاہر بینوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس ''بے گفتہ سبق'' سے طالبین کی تقلیب قلبی کا کام کتنے مؤثر انداز سے انجام پاتا ہے۔

بعض طالبین ابتدائی دنوں میں جوش سلوک میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ شیخ کے متعین کردہ نصاب میں اضافے کے ذریعہ چشم زدن میں سلوک کی منزلیں طے کر سکتے ہیں۔ کاش کہ انہیں یہ بات معلوم ہوتی کہ خدا اور بندے کے درمیان سات سو پردے پڑے ہیں۔ جو جتنا بڑا ولی ہوتا ہے اس پر پردوں کی تعداد اتنی ہی کم ہوتی ہے۔ بڑے ولی کا نور اسی سبب زیادہ ہوتا ہے۔ اس نور کو چھوٹے ولی برداشت نہیں کر سکتے ۔اس لیے اگر تم نے شیخ سے اعراض برتا اور ایک ہی جست میں ساری منزلیں طے کرنے کی کوشش کی تو اندیشہ ہے کہ اپنے آپ کو ہلاک کر لوگے۔ لوگ اس راہ میں زندگیاں لگاتے ہیں جب جا کے کہیں خدا کے نور کو برداشت کرنے کے اہل ہوتے ہیں پھر وہ مقام بھی آتا ہے جب بندے اور خدا کے درمیان سارے حجابات ہٹ جاتے ہیں۔ بقول مولانا روم

پس فقیر آنست کہ بیواسطہ است

شعلہ ہارابا وجودش رابطہ است

یعنی درویش وہ ہے جو کسی واسطہ کے بغیر ہوتا ہے۔ شعلوں کو اس کے وجود سے خاص تعلق ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جب اولیاء اللہ راست خدا سے لیتے اور بندوں کو تقسیم کرتے ہیں۔ یہ جو صوفیاء کہتے ہیں کہ ہم دید کے قائل ہیں شنید کے نہیں وہ اسی سبب سے ہے۔ لیکن سلوک کی یہ منزل خال خال لوگوں کو ہی ہاتھ آتی ہے۔ جس شخص کو فنا فی اللہ کا یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے اسے اپنے آپ کی خبر نہیں رہتی۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص بایزید بسطامی کی خدمت میں تیس سال تک رہا لیکن وہ جب بھی سامنے آتا آپ اس سے پوچھتے کہ تمہارا نام کیا ہے۔ اس شخص کو احتمال ہوتا کہ شاید حضرت مذاق کرتے ہوں۔ پوچھنے پر پتہ لگا کہ وہ مذاق نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے قلب میں اس طرح خدا کا نام جاری تھا کہ اس کے سوا کوئی اور نام انہیں یاد ہی نہیں رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ذوالنون مصری کا ایک مرید بایزید بسطامی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دروازے پر دستک دی، اندر سے آواز آئی کون ہے اور کس کی تلاش میں ہے۔ مرید نے عرض کیا کہ بایزید کی تلاش میں آیا ہوں۔ فرمایا وہ کون ہے اور کہاں ہے میں بھی ایک مدت سے اس کی تلاش میں ہوں لیکن اب تک اسے پانے میں ناکام رہا ہوں۔

عزیزو! جب انسان خدا کے ساتھ واصل ہو جاتا ہے اور جب وہ غیر خدا سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے تو پھر اس کے اپنے وجود اور اپنی خواہش کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ خدا کی مرضی اس کی مرضی بن جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رابعہ بصری کشتی کے سفر میں دریائے دجلہ پر تھیں۔ بیچ دریا میں کشتی طوفان میں گھر گئی۔ مسافر پریشان ہوئے، چیخ و پکار بلند ہوئی، لیکن ایک شخص کشتی میں اطمینان سے لیٹا رہا۔ رابعہ اس شخص کے اطمینان کو دیکھ کر سخت متعجب ہوئیں۔ انہوں نے کہا دعا کا وقت ہے یہ آپ اس طرح کیوں لیٹے ہیں۔ کہنے لگا کہ اگر خدا کی مرضی کشتی کو ڈبونے کی ہے تو میری کیا مجال کہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے کی سوچوں۔ رابعہ نے جب اس سے دعا پر اصرار کیا تو اس شخص نے اپنی چادر اٹھائی اور طوفان کی سمت میں اسے اونچا کر دیا۔ چادر کا اٹھانا تھا کہ ہوا تھم گئی۔ رابعہ کو تجسس ہوا کہ یقیناً یہ کوئی خدا کا محبوب بندہ ہے۔ پوچھنے پر بتایا کہ یہ کوئی ایسی کرامت نہیں، یہ تو تم بھی کر سکتی ہو شرط صرف یہ ہے کہ اپنے کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دو۔ ہم نے یہ درجہ اسی طریقے سے حاصل کیا ہے۔ ترکنا مانریدلمایرید فترك مايريد لمانريد۔

عزیزانِ من! راضی برضا کا یہ مقام بڑی مشقتوں سے ہاتھ آتا ہے۔ بایزید بسطامی جیسے بزرگ کہتے ہیں کہ انہیں تیس سال تک مسلسل اس راہ میں مصائب برداشت کرنے پڑے۔ پھر خدا نے انہیں وہ مقام عطا

کیا کہ وہ پوری کائنات کو اپنی انگلیوں کے درمیان دیکھتے۔ان کا فرمان ہے کہ خدا کی معرفت کے ایک دانہ میں جولذت ہے وہ جنت کی نعمتوں میں نہیں۔فنافی اللہ ہونا گویا زندہ جاوید ہونے کا عمل ہے۔آج کی اس مجلس میں آخری نکتہ کے طور پر اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیجئے کہ خدا سے موصل ہونے کا عمل سالک کی معراج ہے۔اس سے پہلے ان تین مدارج سے گزرنا ہوتا ہے۔پہلا مرحلہ تجلیٔ آثاری کا ہے۔جیسے موسیٰ نے آگ کو دیکھا اور خدا کی آواز سنی۔دوسرا مرحلہ تجلیٔ فعلی ہے۔جس میں سالک کسی کام میں خدائی اسکیم کو متجلی پاتا ہے۔تیسرا مرحلہ تجلیٔ صفاتی ہے، جب خدا سمع، بصر وفواد میں متجلی ہوتا ہے۔چوتھا اور آخری مرحلہ جسے تصوف کی اصطلاح میں تجلی ذاتی کہتے ہیں، دراصل فنافی الحق کی منزل ہے۔جب سالک اپنے آپ کو گم کر دیتا ہے اور اس کے عدم وجود کے سبب اس کی زبان سے أناالحق یاسبحانی ماأعظم شأني اور مافي جبتي إلا الله جیسے کلمات کا صدور ہونے لگتا ہے۔اپنے آپ کو گم کر دینے اور لقائے حق کے سبب باقی رہ جانے کو بقیٰ باللہ کہتے ہیں۔یہ وہ مرحلہ ہے جب نور پر اصل نور کی رنگت غالب آجاتی ہے۔بندہ خدا کے رنگ میں رنگ جاتا ہے؛صبغة الله و من احسن من الله صبغة۔

مجلس اپنے اختتام کو پہنچی۔لوگ باہر جانے لگے اور بعض وہیں فرش پر کمر سیدھی کرنے کے خیال سے لیٹ گئے۔میں نے بھی دیوار کے سہارے ٹیک لگا لی۔ہاشم اپنے بعض دوستوں کے ساتھ میرے پاس آبیٹھے۔ پروجیکٹر ابھی آن تھا اور اسکرین پر شاہراہ نور کا عکس نظر آرہا تھا۔میں نے ہاشم سے پوچھا تمہارا کیا خیال ہے۔ ہم لوگوں نے اس شاہراہ پر ابھی کتنی مسافت طے کر لی ہے؟ بلکہ یہ بتاؤ کہ تم اپنے آپ کو سلوک کے اس سفر میں کس مقام پر محسوس کرتے ہو؟

کہنے لگے: میرا حال تو ان لوگوں کا ہے جو ابھی سفر پر نکلے ہی نہیں۔رختِ سفر ضرور باندھتا ہوں لیکن پھر اپنے اندر اتنی ہمت جٹا نہیں پاتا۔

آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ قریب بیٹھے ایک دوسرے ساتھی نے مداخلت کی۔

بات یہ ہے کہ ہمارے دل مادی آلائشات سے مملو ہیں۔یقین کی کمی ہے،شبہات کا ہجوم ہے لہذا ارتکاز کی پہلی منزل پر ہی خیالات مختلف سمت میں بھٹکنے لگتے ہیں۔پہلا مرحلہ اپنے دل کو غیر اللہ سے خالی کرنا ہوتا ہے جبھی اللہ کی محبت کے لیے وہاں جگہ بن پائے گی۔دونوں چیزیں یکجا نہیں رہ سکتیں۔

لیکن آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ اگر ہم اس عمل میں کامیاب ہو گئے اور بالآخر ہمارے اور خدا کے مابین

سارے حجابات اٹھ گئے تو ہمارے اندر ایک طرح کی خدائی قوت در آئے گی اور یہ جو بڑے بڑے اولیاء اللہ تصرفات فرماتے ہیں، تقدیروں کو بدل ڈالتے ہیں، ہم بھی کسی دن اس مقام پر پہنچیں گے۔

بولے: یہ تو اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کے اندر کس قدر تجلئ الٰہی کو جذب کرنے کی صلاحیت ہے۔ آپ کس قدر تیز نور برداشت کر سکتے ہیں۔ دیکھئے اس راہ میں بہت سے لوگ نکلے لیکن جو مرتبہ اویس قرنی کو حاصل ہوا، جس رتبے سے غوث اعظم اور مشائخ نقشبندیہ کو نوازا گیا، اس درجے پر بہت کم لوگ پہنچ پائے۔

'سلوک کا یہ راستہ انتہائی دشوار گزار ہے۔ اس راستے میں نفس کے خطرات بھی ہیں، بعض لوگ تھوڑی سی کرامتیں پا کر اصل مقصد کو بھول جاتے ہیں ہمیں اس سے ہوشیار رہنا ہوگا' ہاشم نے متنبہ کیا۔

اگلی مجلس دوپہر کے بعد تھی۔ میں سوچتا رہا انسان بھی کتنی gullible مخلوق ہے۔ خدائی کے حصول کی امید میں خود ہی چھوٹے چھوٹے خدا تخلیق کرتا ہے۔ انہیں شیخ اور غوث کا نام دیتا ہے اور پھر ان کی توجہ کے لیے اپنی ساری توانائی اور تمام زندگی صرف کر دیتا ہے۔ اسے خدائی تو نہیں ملتی لیکن انا الحق کہنے کے شوق میں اس کی عزتِ نفس اور تکریم آدمیت کا جنازہ نکل جاتا ہے۔

۲۲

بشارت

آخری مجلس بشارت کے عنوان سے ترتیب دی گئی تھی۔ خیال تھا کہ جو سالکین ہفت مجلس کی تربیت سے گزرے ہیں اور جنہوں نے مجاہدے اور مراقبے میں صعوبتیں برداشت کی ہیں شاید ان میں سے بعض لوگوں کو بطریق مکاشفہ قبولیت کی سند سے نوازا جائے گا، ان کے کامیاب روحانی سفر پر انہیں مطلع کیا جائے گا اور انہیں مستقبل میں ممکنہ کامیابیوں کی بشارت دی جائے گی۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ شیخ طریقت کی تقریر سے پتہ چلا کہ بشارت کا یہ عنوان اس مناسبت سے تجویز کیا گیا ہے کہ طالبین باصفا کو یہ یقین دلایا جائے کہ طلب اگر سچی ہو تو آپ کو ہر مرحلہ میں کبار اولیاء کی امداد ملتی رہے گی۔ فرمایا:

عزیزان من! بخاری نے ابو ہریرہ کی روایت پر ایک حدیث قدسی نقل کی ہے۔ یہ وہ حدیث ہے جو اہل سلوک کی مجلسوں میں کثرت سے بیان ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اولیاء اللہ کے دشمنوں کو خبردار کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ میرا بندہ فرائض اور نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے کسی چیز کا طالب ہو تو اسے ضرور عطا کرتا ہوں اور اگر وہ میری پناہ مانگے تو اسے ضرور پناہ دیتا ہوں۔ امام فخر الدین رازی، جن کا مفسرین میں بڑا اعلیٰ مقام ہے، نے اپنی تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ جب ولی کی آنکھ خدا کی آنکھ بن گئی تو وہ قریب

وبعید کو دیکھے گی اور جب ولی کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن گیا تو وہ قریب وبعید میں تصرف پر قادر ہوگا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور الله تو یہ بھی اسی سبب ہے کہ مومن اپنی آنکھ سے نہیں بلکہ خدا کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ یہ وہ درجہ ہے جو صرف کاملین کے لیے مخصوص ہے۔ آپ نے حضرت عمرؓ کا وہ مشہور واقعہ سنا ہوگا کہ جب انہوں نے مسجد کے منبر سے خطبہ روک کر اچانک یا ساریة إلی الجبل کی آواز لگائی اور یہ آواز کوئی ڈیڑھ ہزار میل دور حضرت ساریہ کے کانوں میں پہنچی، وہ ان دشمنوں سے پیشگی ہوشیار ہو گئے جو پہاڑ کی جانب سے حملہ کرنا چاہتے تھے، تو یہ سب کچھ اس لیے ممکن ہو سکا کہ حضرت عمرؓ خدا کے نور سے دیکھ رہے تھے۔ جس کو خدا کا نور مل جاتا ہے اس کے لیے زمانی اور مکانی فاصلے بے معنیٰ ہو جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ ان کاملین میں تھے جن کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن گیا تھا لہٰذا دریائے نیل جب خشک ہو گیا تو حضرت عمرؓ نے نیل کے نام ایک پرچہ لکھا جس میں لکھا تھا کہ اے نیل تو خدا کے حکم سے جاری ہو جا۔ دنیا جانتی ہے کہ ایسا ہی ہوا۔

عزیز دوستو! کاملین، صدیقین کا یہ مقام جس کسی کو حاصل ہو گیا یہ سمجھئے کہ اسے ارض وسمٰوات کی چابی مل گئی۔ مجدد الف ثانی نے اپنے ایک مکتوب (۲۱۷، دفتر اول، حصہ سوم) میں صاف لکھا ہے کہ تقدیر دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک مبرم اور ایک غیر مبرم۔ مبرم وہ ہوتی ہے جسے ٹالا نہیں جا سکتا۔ لیکن کاملین کے درجے دیکھئے کہ حضرت غوث اعظم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تقدیر مبرم کے بدل دینے کا بھی اختیار دے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے اور انہوں نے اپنے خاص اختیار کے ذریعہ بارہ برس کے بعد، دریا میں ڈوبی ہوئی ایک بارات برآمد کر دی تھی۔ اولیاء اللہ کو چونکہ خدا نے تصرفات کی قوت عطا فرمائی ہے اس لیے ہم ان سے مشکل گھڑی میں استمداد کے طالب ہوتے ہیں۔ ظاہر بینوں کو یہ لگتا ہے کہ ہم شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ کاش کہ وہ یہ جانتے کہ ہم اولیاء اللہ کو خدا کے لطف وکرم کا مظہر جان کر دراصل خدا سے ہی امداد طلب کرتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے إیاك نعبد و إیاك نستعین کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے اس طرح مدد مانگنا کہ انسان اسے خدا کی امداد کا مظہر نہ جانے تو یہ حرام ہے اور اگر توجہ اللہ کی طرف ہو اور اس مخلوق کو خدا کی امداد کا مظہر جانتے ہوئے ظاہری طور پر اس سے مدد مانگے تو دل معرفت سے دور نہیں اور یہ شریعت میں جائز ہے۔ عبدالحق محدث دہلوی نے اشعة اللمعات میں امام غزالی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جس شیخ سے زندگی میں مدد طلب کی جاتی ہے وفات کے بعد بھی اس سے مدد طلب کی جائے گی۔ غزالی کہتے ہیں کہ میں نے خود معروف کرخی اور عبدالقادر جیلانی کو اپنی قبروں میں اسی طرح تصرف کرتے دیکھا ہے جس

طرح وہ زندگی میں کیا کرتے تھے۔

عزیزو! مشاہدۂ حق کا مرحلہ بڑا کٹھن ہے لیکن یہ بات نگاہوں سے اوجھل نہ ہو کہ آپ کے لئے سلوک کے اس سفر میں اولیاء اللہ کی استعانت اور خاص طور پر مشائخ نقشبند کی ارواح سے مسلسل فیض حاصل کرنے کا دروازہ کھلا ہے۔ آپ جہاں بھی ہوں گے اپنے شیخ کو اور ان کے توسط سے کبار شیوخ، حتیٰ کہ رسولؐ اللہ کی مدد سے بھی سرفراز ہوں گے۔ حضرت مجدد صاحب فرماتے ہیں کہ ایک ولی کامل بیک وقت مختلف مقامات پر موجود ہوسکتا ہے۔ ایسا اس لیے کہ اس کے لطائف مختلف جسم اور مختلف شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ حضرت مجدد صاحب کے بارے میں لوگ کہتے تھے کہ انہیں حج میں دیکھا گیا، کوئی کہتا وہ بغداد میں پائے گئے اور کوئی روم میں ان کی موجودگی کی خبر دیتا۔ مجدد صاحب کہتے تھے کہ میں تو گھر سے باہر بھی نہیں نکلا، نہ ہی روم و بغداد کو گیا۔ دراصل یہ پیر کی مثالی صورتیں ہیں جو مریدوں کی مشکل کشائی کے لیے ظاہر ہو جایا کرتی ہیں۔ ایک مکتوب (۲۸۲، دفتر اول، حصہ پنجم) میں مجدد صاحب نے اپنی ایک مجلسِ ذکر کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک دن ان کی مجلس میں حضرت الیاس اور حضرت خضر حاضر ہوئے۔ فرمایا کہ ہم عالم ارواح میں سے ہیں۔ اللہ نے ہمیں اجسام کی شکل میں متمثل ہونے کی قدرت عطا کر رکھی ہے۔ یہی حال اولیاء اللہ کا بھی ہے کہ ان کی روحیں متمثل ہوکر مشکل اوقات میں بندوں کی مدد کو پہنچتی رہتی ہیں۔ تذکرۂ مشائخ نقشبندیہ میں نور بخش توکلی نے یہ لکھا ہے کہ اویس قرنی کا خرقہ جو شیخ عبدالقادر جیلانی کی معرفت سکندر کیتھلی تک پہنچا تھا اور جو شیخ کی وصیت کے مطابق مجدد صاحب کی خدمت میں پہنچایا جانا تھا، جب مجدد صاحب کو پہنچا ہے اور وہ اسے زیب تن کرنے کے بعد حرم سرا میں تشریف لے گئے تو انھوں نے دیکھا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی اپنے تمام خلفاء کے ساتھ وہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر بعد مشائخ نقشبندیہ، کبرویہ اور چشتیہ بھی آ پہنچے۔ سب کا دعویٰ تھا کہ مجدد صاحب پر ان کے سلسلے کا حق ہے۔ بالآخر مشائخ میں صلح ہوگئی اور ہر ایک نے آپ کو اپنی نسبت سے سرفراز فرمایا۔

کہتے ہیں کہ ولی کو کبھی کبھی اس بات کا خود اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کی تمثیلی شکلیں مختلف جگہوں پر ظاہر ہو کر اس کے مریدوں کی مشکل کشائی کر رہی ہیں۔ علی ہمدانی کشمیری کے بارے میں تربیت عشاق کے مصنف نے لکھا ہے کہ انہوں نے ایک ہی وقت میں چالیس آدمیوں کے گھر جا کر کھانا تناول فرمایا اور ہر جگہ بیٹھ کر ایک مختلف غزل لکھی۔ یہ واقعات اس امر پر دال ہیں کہ صدیقین اور کاملین کی ارواح کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی قوت عطا کر رکھی ہے۔ حضرت مجدد صاحب نے اپنے ایک مکتوب (نمبر ۲۸، دفتر دوم، حصہ اول) میں بابا آبریز

کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کا کہنا ہے کہ جب حق تعالیٰ کے ہاں حضرت آدم کی مٹی گوندھی جا رہی تھی تو میں اس میں پانی ڈال رہا تھا۔مجدد صاحب نے فرمایا ہے کہ یہ بات درست ہوسکتی ہے کہ جب ملائکہ اس کام میں حصہ لینے کے مجاز ہیں تو بزرگ کی روح کو بھی اس بات کی اجازت ہوسکتی ہے۔

عزیزانِ من! حق تک پہنچنے کے دو راستے ہیں۔جن میں سے ایک راستہ ولایت کا ہے۔مکتوب (نمبر ۱۲۳، دفتر سوم، حصہ دوم) میں مجدد صاحب نے اس بات کی وضاحت فرمادی ہے کہ ولایت کی پیشوائی پر علیؓ فائز ہیں۔حضرت فاطمہؓ اور حسنؓ، حسینؓ اس منصب میں ان کے شریک ہیں۔ولایت کے اس راستے کا علم لدنی ہمیں سینہ بہ سینہ مشائخ نقشبندیہ کے ذریعہ پہنچا ہے۔سالک کو چاہئے کہ وہ اس دولت کی حفاظت کرے۔انشاءاللہ آپ اس راستہ میں مشائخ نقشبند کی ارواح مبارکہ کو اپنے استمداد پر ہمیشہ مستعد پائیں گے۔چلتے چلاتے آخری بات گرہ میں باندھ لیجئے کہ حصولِ ولایت کا یہ راستہ آپ سے بڑے سخت مجاہدے کا طالب ہے۔شیخ علی ہجویری، بایزید بسطامی، شیخ ابوسعید، معین الدین چشتی جیسے بزرگوں نے مشائخ کی قبروں پر چلہ کشی کی ہے۔ان سے فیض حاصل کیا ہے جبھی وہ آج مرجع خلائق بنے ہوئے ہیں۔آیئے آخر میں مشائخ نقشبند کی ارواح پر دعاؤں کا نذرانہ بھیجیں۔

تقریر کے ختم ہوتے ہی صلوٰۃ وسلام اور ختم خواجگان کا دور شروع ہوا اور پھر الفاتحہ کے اعلان کے ساتھ مجلس اپنے اختتام کو پہنچی۔

۲۳

سبز گنبد، سبز پرندے اور مدنی منّے

عصر کی نماز اسمٰعیل آغا میں پڑھی۔ ابھی نماز سے فارغ ہی ہوا تھا کہ دیکھا کہ ہاشم دو نقشبندی درویشوں کے جلو میں میری طرف آ رہے ہیں۔ ان دونوں حضرات نے سفید جبوں پر سبز پگڑیاں باندھ رکھی تھیں جس کے اندر سے نقشبندی انداز کی ٹوپیاں جھانک رہی تھیں۔ اب جو ذرا غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ان میں ایک تو وہی کا کا آدم خیل کے اللہ یار صاحب ہیں جن سے ہفت مجالس کے دوران گاہے بگاہے ملاقات ہوتی رہی تھی، اور جو ہماری اور ہاشم کی گفتگو میں وقتاً فوقتاً بیٹھ جایا کرتے تھے۔ لیکن تب وہ ایک عام سالک کی حیثیت سے صرف ٹوپی اور جبہّ میں نظر آتے تھے۔ آج جو انہوں نے نقشبندی صوفیاء کا باقاعدہ یونیفارم زیب تن کیا اور پھر سبز رنگ کی پگڑی خاص پاکستانی اہل سنت کے انداز سے باندھی تو انہیں بیک نظر پہنچاننے میں دشواری ہوئی۔ فرمایا شیخ حمود کے کمرے میں چائے کا اہتمام ہے۔

شیخ حمود تو کمرے میں موجود نہ تھے البتہ چائے کا دور چل رہا تھا۔ ہم لوگوں نے ایک گوشہ میں اپنی نشستیں سنبھالیں۔ پھر چائے اور ڈونٹ نما روٹی پر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ اللہ یار خاں کو میں نے ابھی کچھ دیر پہلے تک ایک طالب علم اور سالک کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ اب جو پورے صوفیانہ جاہ وجلال کے ساتھ مکمل نقشبندی یونیفارم میں دیکھا تو ذہن کے گوشے میں پڑا ساجد کا وہ سوال پھر سے سر اٹھانے لگا کہ لوگ سلطان الاولیاء، محبوب سبحانی اور ذبدۃ السالکین کس طرح بنتے ہیں؟ خیال آیا شاید اسی طرح جس طرح اللہ یار خاں نے اپنے

آپ کو اہل صفا کے روایتی لباس میں پوری شان اور آن بان کے ساتھ جلوہ گر کیا ہے۔

آج سے ربع صدی پہلے کراچی کے ایک سفر کے دوران ایک ایسے مذہبی گروہ کی بابت سننے میں آیا تھا جو سبز پگڑی کے ذریعہ سنت کے احیاء کا داعی تھا۔ اللہ یار خاں اسی تحریک کے پروردہ ایک نوجوان ہیں۔ کہنے لگے کہ دیوبندی علماء کے مقابلے کے لیے ہمارے اکابرین نے سبز پگڑی کا احیاء کیا۔ اہل سنت والجماعت دیوبندیوں کے نرغے میں تھے اب اللہ کا شکر ہے کہ ہماری اپنی ایک الگ شناخت ہے۔ سبز پگڑیوں والے پاکستان میں دور سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ ہمارا ایک ٹی وی چینل ہے جو دعوت وارشاد کے علاوہ مدنی منّوں کے لیے بھی باقاعدگی سے پروگرام پیش کرتا ہے۔

مدنی مُنّے؟ جی کیا فرمایا آپ نے؟

میرے اظہار حیرت پر انہوں نے بتایا کہ دراصل یہ اہل سنت کے بچوں کے لیے بولی جانے والی اصطلاح ہے جو خاص مدنی چینل نے وضع کی ہے۔ ہم اہل سنت اپنے بچوں کو مدنی منّا کہتے ہیں، انہوں نے مزید وضاحت کی۔

لیکن دیوبندی بھی تو اپنے آپ کو اہل سنت کہتے ہیں۔ میں نے انہیں کریدنے کی کوشش کی، جس پر وہ قدرے جذبات میں آ گئے۔

فرمایا: دیوبندی؟ ارے وہ اہل سنت کیسے ہوسکتے ہیں، وہ سب کے سب منافق ہیں۔ اہل حدیثوں میں اہل حدیث بن جاتے ہیں اور عام مسلمانوں میں اہلِ سنت بنے رہتے ہیں۔ آپ کو کیا بتائیں، ان دیوبندی منافقوں کے دو چہرے ہیں ایک عوام کے لیے اور ایک خواص کے لیے۔ عوام کے نزدیک یہ عرس کے مخالف ہیں، چادر چڑھانے اور یارسول اللہ کہنے میں بھی انہیں شرم آتی ہے لیکن اپنے خواص کی مجلسوں میں یہ بزرگوں کی کرامات اور ان کی روحوں سے استعانت کے قائل ہیں۔ یہ بھی ہماری طرح نقش بندی یا قادری ہیں لیکن اسے قاسمیت کے پردے میں چھپائے رکھتے ہیں۔ اب انہوں نے ایک نیا فرنٹ قائم کیا، تبلیغی جماعت بنائی تو بیعت کی شرط اٹھالی۔ اب عام لوگوں کو کیا معلوم کہ نقشبندی صوفیاء اس تحریک کے پیچھے ہیں۔ لوگ لاکھوں کی تعداد میں اس جماعت میں شامل ہو گئے۔

تو کیا آپ کی نظر میں تبلیغی جماعت دراصل نقشبندی سلسلہ کا دوسرا نام ہے؟ میں نے وضاحت چاہی۔

جی ہاں! بالکل۔

پھر اگر نقشبندی سلسلہ کا کام آگے بڑھتا ہے تو آپ قادری سلسلہ کے لوگوں کو تو اس پر اعتراض نہ ہونا چاہیئے؟

بالکل نہ ہوتا۔ ہم لوگوں کو نقشبندی اور قادری دونوں سلسلوں سے نسبت ہے۔ ہم یہی تو کہتے ہیں کہ ہم اصلاً ایک ہیں۔ ہمارا سلسلہ ایک، ہماری فقہ ایک۔ لیکن جھگڑا تو ان کی منافقت کے سبب ہے۔ جب یہ اعلیٰ حضرت کی شان میں گستاخی کرتے ہیں، ہمیں قبوری ہونے کی گالی دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اور ان کے عقیدے میں اتنا بھی فرق نہیں۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی دوانگلیوں سے اس فرق کو سمجھانے کی کوشش کی۔

پھر آپ دیوبندی خطرے کا مقابلہ کس طرح کرتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

کر رہے ہیں جی! کرارا جواب دیا ہے ہم نے۔ ہم نے بھی دعوتِ اسلامی بنائی۔ ہری پگڑی کو رواج دیا۔ اب عام لوگوں کی نظر میں اہل سنت کے حقیقی نمائندہ ہم لوگ ہیں۔ دیوبندی تو اہل حدیثوں کے چمچے سمجھے جاتے ہیں۔ ہماری سبز پگڑی کو دیکھ کر دور ہی سے لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ محمدؐ کا کوئی غلام، اس کا کوئی دیوانہ جا رہا ہے۔

تو کیا پگڑی کا یہ سبز رنگ کسی خاص سبب سے ہے؟ میں نے جاننے کی کوشش کی۔

فرمایا: جی ہاں! جس طرح نور کا نور سے رابطہ ہوتا ہے، ایک طرح کے لوگ ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں اسی طرح سبز رنگ اہل اسلام کا رنگ ہے۔

مگر گنبدِ خضراء کے مکیں کو تو آپ لوگ کالی کملی والا کہتے ہیں؟ میرے اس اعتراض پر وہ کچھ جز بز ہوئے۔ کہنے لگے سبز رنگ سے ہم اہل ایمان کو خاص تعلق ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ مومنین، صالحین کی روحیں مرنے کے بعد سبز پرندے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ انبیاء اور اولیاء اللہ تو اپنی قبروں میں زندہ رہتے ہیں البتہ صالحین کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں مومنین کی دستگیری کے لیے اطراف عالم میں منڈلاتی رہتی ہیں۔

اللہ یار خاں کی یہ بات سن کر اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کڑی سے کڑی مل رہی ہو۔ میں نے پوچھا: دریا کے کنارے صبح صادق سے پہلے عامل حضرات جو سبز پرندے کی تلاش میں جاتے ہیں تو کیا وہ یہی صالحین کی روحیں ہوتی ہیں؟

فرمایا: یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کا یہ اندازہ صحیح ہو۔ اس لیے کہ رنگ کا رنگ سے رابطہ ہوتا

ہے۔ یقیناً صالحین کی روحیں ہم سبز پگڑی والوں سے ایک خاص تعلق خاطر رکھتی ہیں۔ اسی پر سبز گنبد کے مکیں کو بھی قیاس کر لیجئے اور سبز تو اسلامی رنگ بھی ہے۔ اللہ یار خاں نے اپنے موقف کو مزید مدلل کیا۔

لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایک زمانے میں قبۂ رسول کا رنگ سفید تھا۔ اور اس سے بھی پہلے لکڑی کا قبہ کسی رنگ سے خالی تھا۔

اچھا! تو یہ شروع سے ایسا نہیں ہے؟ اللہ یار خاں نے کچھ سنبھالا لینے کی کوشش کی۔

جی نہیں! کوئی ابتدائی سات سو سالوں تک رسول اللہ کی قبرِ مبارک کسی قبہ سے خالی رہی۔ ساتویں صدی ہجری میں پہلی بار لکڑی کا قبہ تعمیر ہوا۔ پھر سفید قبہ کی باقاعدہ شکل قائم ہوئی۔ سبز رنگ کا قبہ ترک خلافت کی یادگار ہے۔ رہی یہ بات کہ سبز رنگ اسلامی رنگ ہے تو اس کی بھی کوئی سند نہیں کہ ابتداً اسلامی لشکر کے علم کا رنگ سفید تھا۔ عباسیوں نے سیاہ جھنڈے کو اختیار کیا۔ اور اس کے بالمقابل فاطمی خلفاء نے اپنے لیے سبز جھنڈوں کو منتخب کیا۔ عہد فاطمی میں ملتان کی اسمٰعیلی ولایت میں قاہرہ سے سبز جھنڈوں کے ارسال کیے جانے کی بات تاریخی مصادر میں موجود ہے اور یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ صدیوں بعد برصغیر میں پاکستان کے نام سے جونئی ریاست وجود میں آئی اس کے قومی جھنڈے کا رنگ بھی سبز قرار پایا۔

میری یہ باتیں سن کر اللہ یار خاں چند لمحوں کے لیے ایسا لگا جیسے مبہوت سے ہو گئے ہوں۔ کہنے لگے معاف کیجئے گا مجھے سبز رنگ کی اس تاریخ کا اندازہ نہ تھا۔ ہماری یہ سبز پگڑی تو بس سبز گنبد سے فیض حاصل کرنے کے لیے ہے۔ آقا کی کچہری میں بھی میری حاضری لگ جائے، اپنا تو بس یہی خواب ہے۔

لیکن حاضری تو تب لگے گی جب وہاں کچہری بھی قائم ہوتی ہو۔

ارے تو اس میں کوئی شبہ کی بات ہے۔ یہ تو بزرگوں کا مشاہدہ ہے۔ مختلف اولیاء کی زبانی آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی کچہری کی تفصیلات ہم تک پہنچی ہیں۔ ہر جمعہ کو نماز کے بعد اولیاء و صالحین آپؐ کے ہاں حاضری دیتے ہیں۔ امت کے حال و احوال کا تذکرہ ہوتا ہے۔ کیا آپ کو ان باتوں کا پتہ نہیں؟

پتہ تو جب ہو گا جب میری بھی حاضری لگ جائے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں نے اہل صفا کی صحبت میں یہی سیکھا ہے کہ شنید پر نہیں دید پر یقین رکھو۔

مگر اس بات پر تو تمام امت کا اتفاق ہے کہ رسولؐ اللہ اپنی قبر مبارک میں اپنے جسمانی وجود کے ساتھ زندہ ہیں۔ کبار اولیاء اللہ اور مشائخ ان سے ملاقاتیں کرتے رہے ہیں۔ بعض لوگوں نے آپؐ سے باقاعدہ

حدیثیں سنی ہیں۔ بعض اہل دل جب چاہتے ہیں رسولؐ اللہ کی زیارت کر لیتے ہیں اور بعض مجلسوں میں تو خود رسولؐ اللہ کی تشریف آوری بھی ہوتی ہے، بالکل اسی طرح گوشت پوست کے انسان کی حیثیت سے جیسے ہم اور آپ گفتگو کر رہے ہیں۔

خیر یہ تو صوفیاء کی گپ شپ ہوئی۔ اہل دل کے دعوے ہوئے۔ عقل اور وحی کی روشنی میں اگر حیات رسولؐ بعد از وصال رسولؐ پر کوئی دلیل قائم ہوتی ہو تو بتائے۔

میری یہ بات سن کر اللہ یار خاں کے نقشبندی دوست، جواب تک بڑے تحمّل کے ساتھ ہماری گفتگو انگیز کیے جا رہے تھے، اپنی خانصاحبیت کو نہ روک سکے۔ فرمایا اجی عقل کا یہاں کیا کام؟ یہ سب عشق کی باتیں ہیں۔ عقل والوں کو یہ دولت نہیں ملتی۔ ویسے قرآن میں، حدیث میں ہر جگہ آپ کو اس بات کے دلائل مل جائیں گے کہ رسولؐ اللہ اپنی قبر میں زندہ ہیں۔ ہمارے صلوٰۃ وسلام کے توشے ہر جمعرات کو ان کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

اچھا تو قرآن میں بھی اس بارے میں کوئی آیت موجود ہے میں نے ان کے نقشبندی دوست سے پوچھا۔

فرمایا جی ہاں! کیا قرآن میں نہیں ہے کہ شہیدوں کو مردہ نہ کہو؟

لیکن یہ تو شہیدوں کی بابت ہے۔ میں نے اپنا اعتراض باقی رکھا۔

بولے: جب شہیدوں کا یہ مقام ہے کہ وہ مرتے نہیں اور انہیں خدا کی طرف سے رزق عطا ہوتا ہے تو انبیاء کا درجہ تو اس سے بھی اونچا ہے۔ بخاری میں ایک حدیث ہے کہ رسولؐ اللہ جب معراج کو جا رہے تھے اور وہ حضرت موسیٰؑ کی قبر سے گزرے تو دیکھا کہ موسیٰ قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ اور یہ حدیث تو معروف ہے کہ الأنبیاء احیأ فی قبورهم یصلون۔ ایک اور حدیث میں یہ آیا ہے أن الله حرّم علی الأرض أن تأکل أجساد الأنبیاء۔ ابودردا کی ایک روایت میں تو اس بات کی تخصیص بھی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور انہیں رزق بھی دیا جاتا ہے۔ اور بیہقی کی ایک روایت میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ من زار قبري بعد موتي کمن زارني فی حیاتي۔ سعید بن مسیّب کے حوالے سے سنن الدارمی میں ایک روایت منقول ہے کہ ایام حرّہ میں جب مسجد نبوی تین دن تک اذانوں سے محروم رہی، سعید بن مسیّب جو اس دوران مسجد کے اندر تھے، انہیں نمازوں کے اوقات کا پتہ اس طرح چلتا کہ خاص نماز کے وقت رسولؐ اللہ

کی قبرِ مبارک سے ھمھمہ یعنی کھسپھساہٹ کی آواز آنے لگتی۔اسی حدیث کی بنیاد پر ابن تیمیہ جیسے وہابی نے بھی حیات نبیؐ کے عقیدے کو تسلیم کیا ہے۔ابن حجر عسقلانی نے بھی اس عقیدے کا اظہار کیا ہے کہ رسولؐ اللہ کی زندگی موت کے سبب ختم نہ ہوگئی بلکہ ان کی زندگی جاری ہے اور انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ابن القیم،ابن الجوزی،جلال الدین سیوطی،امام سبکی اور امام شوکانی، یہ سب کے سب حیات نبیؐ کے قائل ہیں۔اب اس کے بعد نا کی گنجائش کہاں ہے حضور! یہ کہتے ہوئے انہوں نے میری طرف فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

میں نے پوچھا: اچھا یہ بتائیے کہ قرآن مجید کی یہ آیت وما محمد إلا رسول قد خلت من قبله الرسل أفان مات أو قتل انقلبتم على أعقابكم کہ محمدؐ تو ایک رسول ہیں ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے، سو اگر وہ مر گئے یا قتل کر دیئے گئے تو کیا تم الٹے پیر پھر جاؤ گے، یا خدا کا یہ کہنا کہ كل نفس ذائقة الموت، یا یہ آیت کہ افان مت فهم الخالدون کہ اے محمدؐ اگر تمہیں بھی مرنا ہے تو کیا یہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان آیات کو آپ حیات نبیؐ کے مروجہ عقیدے سے کس طرح ہم آہنگ سمجھتے ہیں۔پھر یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ بعد کے لوگوں نے عالم بیداری میں رسولؐ اللہ سے ملاقات کے سیکڑوں دعوے کر رکھے ہیں۔کسی کی بزرگی کا یہ عالم ہے کہ وہ جب چاہتا ہے رسولؐ اللہ کی مجلس میں جا بیٹھتا ہے۔بعضوں نے خود کو اس کچہری کا عہد یدار بھی باور کرا رکھا ہے،لیکن اس کے برعکس عہد صحابہ میں ہمیں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جب کبار صحابہؓ رسولؐ اللہ سے مشاورت کے لیے کبھی آپؐ کی کچہری میں حاضر ہوئے ہوں۔حالانکہ عین وفات نبیؐ کے بعد خلافت کے مسئلہ پر امت میں وقتی طور پر نزاع پیدا ہوا۔پھر آگے چل کر صفین اور جمل کی جنگوں میں مسلمانوں کی تلواریں آپس میں الجھ گئیں لیکن ایسے سخت حالات میں بھی کسی کو اس بات کا خیال نہ آیا کہ وہ ان نازک ایام میں رسولؐ اللہ کی قبر مبارک کی طرف رخ کرتا اور ان سے مداخلت کا طالب ہوتا۔اگر رسولؐ قبر کے اندر واقعی زندہ ہوتے اور ان کے ہاں امورِ دنیا پر کچہری لگ رہی ہوتی تو پھر یہ کیسے ممکن ہوتا کہ صدیوں بعد احمد الرفاعی سے ملاقات کے لیے تو آپؐ کا ہاتھ قبر سے باہر آ جائے لیکن آپؐ کے اصحاب اپنے باہمی تنازعات کو سلجھانے کے لیے آپ کی کچہری میں آنے سے احتراز کریں۔

میرے اس اعتراض پر اللہ یار خاں اور ان کے نقشبندی دوست کچھ بجھ سے گئے۔بولے: یہ بھی تو دیکھئے کہ جن لوگوں نے رسولؐ اللہ سے عالم بیداری میں ملاقات کی باتیں کی ہیں یہ بڑے بڑے نام ہیں۔انہیں جھوٹا بھی تو نہیں کہہ سکتے۔

ہاشم جو میری بات کو اب تک بڑے غور سے سن رہے تھے، کہنے لگے ہاں یہ بات تو غور کرنے کی ہے، ادھر میرا ذہن بالکل نہیں گیا تھا، کہ جو رسولؐ، عین عالم بیداری میں، بعد کے اولیاء کی مجلسوں میں اس قدر کثرت سے آتا ہو، اس کی آمد کا چرچا صحابہؓ کرام کے عہد میں کیوں سنائی نہیں دیتا؟

یہ تو رہا رسولؐ اللہ کی حیات بعد موت کا مسئلہ جس پر تمام شواہد بعد والوں نے قائم کیے۔ تمام روایتیں بعد کے عہد میں ایجاد ہوئیں۔ حالانکہ ابتدائی عہد کے مسلمان اس بات کے کہیں زیادہ سزاوار تھے کہ خلافت کے مسئلہ پر باہمی نزاع کو سلجھانے کے لیے رسولؐ اللہ اپنے جسمانی وجود کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی مجلس میں آ وارد ہوں یا کم از کم قبر مبارک کے اندر منعقد ہونے والی ہفت روزہ کچہری میں ان حضرات کو طلب فرمالیں۔ بات یہ ہے کہ اگر حیات نبیؐ کا عقیدہ وضع نہ کیا جائے تو پھر ان تمام روحانیوں کا اپنے قبور میں زندہ ہونے اور فیض پہنچانے کی باتیں اپنا جواز کھو دیں گی۔ میری اس بات پر اللہ یار خاں نے خاموشی میں عافیت جانی۔ ان کے دوست کچھ بجھے بجھے دلوں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔

فرمایا: یقین کی باتیں ہیں جی، یقین کی۔ دلائل اور ریسرچ سے یہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔

ہاشم کچھ گم صم سے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ ان کا اصرار تو یہ تھا کہ ابھی یہ گفتگو اور چلے لیکن میں نے کبھی اور کے وعدے کے ساتھ ان سے اجازت لے لی۔

۲۷

شب جائے کہ من بودم

نقشبندی سلسلے کی وسعت، کثرت تعداد اور زیر زمین روحانی سرگرمیوں کی چہل پہل کے باوجود استنبول کا اصل روحانی رنگ نقشبندی نہیں بلکہ مولوی ہے۔ سیاحوں کے لیے استنبول سماع زنوں کا شہر ہے۔ امریکہ اور یورپ سے مولوی رقص کے شائقین جوق در جوق استنبول کی مولوی خانقاہ میں آتے ہیں اور پھر یہاں سے انہیں گروپ کی شکل میں قونیہ بھیجا جاتا ہے۔

آج ستمبر کی بارہ تاریخ ہو چکی تھی اولوداغ پر روحانیوں کی آمد کا انتظار جاری تھا۔ سوچا کیوں نہ آج مولانا روم کی خانقاہ میں محفل سماع کا لطف لیا جائے کہ پارکوں اور ثقافتی مقامات پر وزارت سیاحت کی طرف سے سماع کی جو محفلیں سرِ شام منعقد ہوتی رہتی ہیں ان کا مقصد محض سیاحوں کے لیے تفریح طبع کا سامان فراہم کرنا ہوتا ہے۔ سو اس خیال سے میں نے گلاٹا ٹاور کے قریب واقع رومی کی خانقاہ جانے کا پروگرام بنالیا۔

گلاٹا ٹاور پر سیاحوں کا ہجوم تھا۔ خاص طور پر کھانے پینے کی دکانوں کے آگے شائقین کا جمگھٹا لگا تھا۔ کہیں سے قہوہ کی مہک آرہی تھی اور کہیں سے بالِک اِکمک کی تیز خوشبو بھوک میں اضافے کا سبب بن رہی تھی۔ سوچا رات کا کھانا نہ جانے کب ملے، محفل سماع کب ختم ہو، سو یہ سوچ کر بالک اکمک کا لطف لیا۔ سنترے کے عرق سے پیاس بجھائی اور ایک درویشانہ وارفتگی کے ساتھ خانقاہ کی طرف چل پڑا۔

اسمٰعیل آغا یا جراحی کی خانقاہ کے مقابلے میں رومی کی خانقاہ میں زائرین کی اکثریت بلادِ غرب سے آنے

والوں کی تھی۔ شاید اس تاثر کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ جس وقت میں وہاں پہنچا تھا عین اسی وقت ایر پورٹ سے سیاحوں کی دو بس ترکی کے نو روزہ روحانی سیاحت کے لیے آئی تھیں۔ استنبول سے قونیہ تک ان کے نو روزہ پروگرام کی تفصیلات ٹریول ایجنٹوں نے پہلے سے ہی طے کر رکھی تھیں۔ مجلس سماع میں ان لوگوں کی شرکت دید نی تھی۔ ایک عالم حیرت تھا جس میں یہ لوگ کھوئے ہوئے تھے۔ ہلکی خمار آلود شمع کی روشنی میں جب سماع زنوں نے نعت کی ابتداء کی اور پھر اس کے خاتمے پر سریلی بانسری نے فن کا جادو جگایا تو مغرب کے یہ زائرین مبہوت سے ہو کر رہ گئے اور پھر جب سماع زنوں نے اپنی گردنیں خم کیں اور چار سلام کے ساتھ اصل رقص کا آغاز ہوا تو ان میں سے بعض حضرات اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے۔ چند ایک نے تو اسی انداز سے رقص کی کوشش بھی کی۔ لیکن پھر جلد ہی انہیں اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا اور وہ ہل ڈل کر بیٹھ گئے۔ کوئی دو گھنٹے تک رقص وسماع کا یہ پروگرام اپنے تمام لوازمات، فنکارانہ مہارت اور اثر انگیز ماحول کے ساتھ چلتا رہا اور تب بیک گراونڈ میں صلوٰۃ وسلام کی آواز بلند ہوئی جو غالباً اس بات کا اشارہ تھا کہ مجلس اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے۔ سماع زنوں نے ایک ادائے خاص کے ساتھ اپنی گردنیں خم کیں اور تالیوں کی گونج نے گویا محفل کے باقاعدہ اختتام کا اعلان کر دیا۔

مجلسِ سماع میں اہل مغرب کی اس قدر کثرت اور محویت دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ آخر ان لوگوں کو کون سی چیز یہاں کھینچ کر لاتی ہے۔ یہ حضرات سماع کے کلمات سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی انھیں صلوٰۃ و سلام کی مذہبی معنویت سے آگہی ہوتی ہے۔ پھر کیا محض مولویانہ رقص اور ماحولیاتی تاثر ان کی تسکین کے لیے کافی ہوتا ہے؟

اس عقدہ کو حل کرنے کے لیے میں نے اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے مسٹر واٹسن سے پوچھا کہ آپ کو یہ مجلس کیسی لگی؟

بولے: ونڈرفل! البتہ قونیہ کے مقابلے میں تھوڑی کم کم محسوس ہوئی۔ وہاں قونیہ کے سماع میں بڑی intensity پائی جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ کا 'آپ' باہر آ جائے گا۔

گویا آپ قونیہ سے ہو کر آئے ہیں؟

کہنے لگے: جی ہاں! میں اور میری بیوی نینسی، جو اس وقت ان کے بازو میں بیٹھی تھیں، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا، پچھلے ہفتے قونیہ میں تھے۔ پھر خود ہی وضاحت کی؛ ہوسکتا ہے کہ اس کا ایک سبب وہاں مولانا کی روحانی موجودگی بھی ہو کہ صوفی ماسٹر خود وہاں موجود ہیں اور شاید اسی لیے وہاں سماع کی مجلسوں پر ایسا لگتا

ہے جیسے رومی کی روحانیت سایہ فگن رہتی ہو۔

تو کیا آپ کا یہ پہلا تجربہ تھا رومی کی زیارت کا۔ فرمایا جی ہاں پہلا لیکن آخری نہیں۔ میں تو یہاں آ کر محو حیرت ہوں۔ ایک نئی دنیا مجھ پہ آشکارا ہوئی ہے۔ محبت اور اخوت کی دنیا۔ یہاں آ کر مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ زندگی اس لیے ہے کہ اسے celebrate کیا جائے۔ غم پالنے اور مال جمع کرنے کے لیے نہیں۔ بہت سکون ہے کیا بتاؤں بہت سکون ہے سماع کی ان مجلسوں میں۔

مسٹر واٹسن کسی نئے مرید کی طرح اپنے شیخ کی برکتوں کا ابھی اور بھی تذکرہ کرتے۔ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا کہ سفر کیسا رہا اور واپسی کب کی ہے؟ فرمایا: سفر کے کیا کہنے یہ کوئی عام سفر نہیں، ایک روحانی تجربہ تھا۔ حیدر پاشا اسٹیشن سے جب ہم لوگ قونیہ کی طرف روانہ ہوئے تو کوئی تیرہ گھنٹہ کے اس سفر میں مجھے بڑی مانوسیت کا احساس ہوا۔ ایسا لگا جیسے رومی نے خود ہمیں اپنی پناہ میں لے رکھا ہو۔ کیا بتاؤں یہ ایک انتہائی ذاتی روحانی تجربہ ہے، بیان سے باہر۔

رات زیادہ ہو چکی تھی۔ مسٹر واٹسن سے مزید گفتگو تو نہ ہو سکی البتہ رومی کے ایک نئے مغربی مرید کے تاثرات نے اس سوال کی دھار اور تیز کر دی کہ آخر رومی کی اس غیر معمولی مقبولیت کا سبب کیا ہے۔ محض مغرب کا روحانی خلا یا کچھ اور؟

رومی دنیائے تصوف کے بانیوں میں ہیں، وہ سماع کے موجد ہیں، روحانی رقص ان کی اختراع ہے۔ انھوں نے اپنی بانسری کی سریلی آواز سے ایک عالم کو رلایا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اہل تصوف کی بائبل لکھی ہے۔ جسے مثنوی معنوی کی شکل میں تمام ہی صوفی حلقوں میں اعتبار حاصل ہے۔ اہل دل کی مجلسوں میں اس کتاب کی باقاعدگی سے تعلیم ہوتی ہے۔ بہتوں کی نظر میں مثنوی کی حیثیت 'ہست قرآن در زبان پہلوی' کی ہے۔ ابن عربی، جنہیں تصوف کا شیخ اکبر کہا جاتا ہے، کے بعد اگر کسی شخص نے اہل سلوک کے قلب ونظر پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے تو وہ مولانا رومی کی ذات ہے جسے اقبال جیسے نابغۂ عصر کے ہاں بھی پیر رومی کی حیثیت حاصل ہے۔ پھر اگر مسٹر واٹسن شعر ونغمہ کے اس سحر انگیز ماحول میں مبہوت ہو جائیں تو اس پر کچھ تعجب نہ کرنا چاہئے۔ سچ تو یہ ہے کہ شعر ونغمہ میں بڑی زبردست قوت ہے اور اگر خیر سے آپ صاحب ذوق بھی واقع ہوئے ہیں تو پھر آپ کے شکار ہو جانے کا امکان بہت بڑھ جاتا ہے۔ رومی کے اشعار اگر آپ نے طائفہ شمس کے مغنیوں کی زبان سے سنے ہوں تو آپ کو کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ شعر ونغمہ کی سحر انگیزی واقعی

ہے کیا۔ چند سال پہلے مجھے ایک بار نیویارک میں اس طائفے کو سننے کا اتفاق ہوا۔ اس مجلس میں دادِ سخن دینے والوں کی ایک بڑی تعداد ایرانیوں کی تھی۔ بربطِ پر:

دلتنگم و دیدار تو درمان منست　　　　بیرنگ رخت زمانہ زندان منست

کا نغمہ جیسے ہی چھڑا ایسا لگا جیسے اہلِ مجلس اپنے داخلی وجود کے ساتھ اچانک بیدار ہوا ٹھے ہوں

تا از تو جدا شدہ است آغوش مرا　　　　از گریہ کسی ندیدہ خاموش مرا

کا شعر جب دلگرفتہ موسیقی کے جلو میں مغنیہ کی زبان سے جاری ہوا تو اہلِ مجلس کی حالت دیدنی تھی اور پھر جب نغمہ زن کسی قدر ہنگامہ خیز لئے میں:

ای عاشقان ای عاشقان آن کس کہ بیند روی او
شوریدہ گردد عقل او آشفتہ گردد خوی او
معشوق را جویان شود دکان او ویران شود
بر رو و سر پویان شود چون آب اندر جوی او

کے مرحلے میں داخل ہوا تو یہ جانئے کہ ضبط کے سارے بندھ ٹوٹ گئے۔ اہلِ دل تو حالتِ وجد میں تھے ہی مقامی امریکی شرکاء نے بھی دھمال کی سی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ ایسے میں کہاں کسی کو اس بات کا ہوش ہوتا ہے کہ کہنے والے نے کیا کہا اور سننے والے نے کیا سنا۔ اصل تو وہ حظ ہے جو آپ کے حصے میں آیا اور جو نغمہ کی سحر انگیزی کے سبب آپ کا سب کچھ بہالے گیا۔ آپ اپنے کھونٹے پر قائم نہ رہ سکے۔

میں جب بھی شعر و نغمہ کی صوفیانہ مجلسوں میں شریک ہوا، نغمہ کی زبان مجھے غیر معمولی طور پر قتالہ لگی ہے، مجرمانہ حد تک قتالہ۔ جن دنوں میں بی۔اے کا طالب علم تھا غالب سیمینار کے موقع پر ایک شام ایوانِ غالب میں اساتذہ کی غزلیں معروف مغنیوں کی زبانی سنائے جانے کا پروگرام تھا۔ بچپن سے میری تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی وہاں مغنیوں سے غزلیں سننا، خواہ وہ اساتذہ کا ثقہ کلام ہی کیوں نہ، کچھ مناسب نہ خیال کیا جاتا تھا۔ ابھی میں اسی شش و پنج میں تھا کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ پر نظر پڑی، جو اگلی صف میں جگہ لے چکے تھے اور جن کی صدارت میں کچھ دنوں پہلے مجھے یونین ہال کے ایک جلسہ میں اپنے اشعار سنانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ مولانا مجھ سے شفقت فرماتے تھے۔ قریب گیا تو انھوں نے از راہ شفقت اپنے برابر میں بٹھالیا۔ غالب کی ایک آدھ غزلیں رواروی میں گزر گئیں کہ ابھی ماحول نہ بنا تھا البتہ جب مغنیہ نے خسرو کی غزل نمی دانم

کجار فتم شروع کی تو ایسا لگا جیسے مجلس جاگ اٹھی ہو۔ ادھر بربط کی لے پر

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم — بہ ہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم

پری پیکر نگارے سرو قدے لالہ رخسارے — سراپا آفت دل بود شب جائے کہ من بودم

کے اشعار بلند ہو رہے تھے اور ادھر اہل مجلس دم بخود، سراپا مبہوت، گویا چشم تصور میں خود ہی اس مجلس میں جا بیٹھے ہوں۔ پھر جب کہنے والے نے

خدا خود میر مجلس بود اندر لا مکاں خسرو — محمد شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

کی نوید سنائی تو شعر و نغمہ کے مارے ان سامعین کو اس بات کا اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ کہنے والے نے باتوں ہی باتوں میں کیا بات کہہ دی ہے۔

کہتے ہیں کہ نظام الدین اولیاء نے امیر خسرو کو ایک بار یہ حکم دیا کہ وہ کبھی کبھی کسبِ فیض کے لیے بوعلی قلندر کی مجلسوں میں بھی بیٹھا کریں۔ بوعلی قلندر جانتے تھے کہ خسرو نظام الدین اولیاء کے مرید ہیں۔ ایک دن انھوں نے خسرو سے برسرِ مجلس کہا کہ خسرو رسول اللہ کی مجلسوں میں میرا آنا جانا لگا رہتا ہے، وہاں میں بہت سے اولیاء اللہ کو حاضر پاتا ہوں مگر آج تک تمہارے شیخ نظام الدین اولیاء دکھائی نہیں دیے۔ کہتے ہیں کہ اپنے شیخ کی بابت یہ سن کر خسرو غمگین رہنے لگے۔ نظام الدین اولیاء کو جب ان کے حزن کا سبب معلوم ہوا تو انھوں نے خسرو سے کہا کہ بوعلی سے کہنا کہ آپ مجھے رسول مقبول کی کچہری میں پہنچا دیں وہاں میں خود اپنے شیخ کو ڈھونڈ لوں گا۔ بوعلی نے خسرو کی زبان سے جب یہ مطالبہ سنا تو اپنا ہاتھ ان کے سینے پر رکھا۔ ہاتھ کا رکھنا تھا کہ خسرو نے اپنے آپ کو رسول اللہ کی کچہری میں پایا۔ وہ اہل مجلس میں سے ہر ایک کو دیکھتے جاتے۔ ان کی پریشانی دیکھ کر رسول اللہ نے پوچھا خسرو کس کی تلاش میں ہو؟ عرض کیا اپنے شیخ کو ڈھونڈتا ہوں۔ فرمایا وہ یہاں نہیں اوپر والی کچہری میں ملیں گے۔ بالائی منزل پر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک اور کچہری قائم ہے جس میں رسول اللہ خود بہ نفس نفیس موجود ہیں البتہ اولیاء اللہ کا حلقہ بدلا ہوا ہے۔ انھیں وہاں بھی نظام الدین اولیاء دکھائی نہ دیے۔ رسول اللہ نے انہیں پریشان دیکھ کر فرمایا: خسرو اوپر کی کچہری میں جاؤ۔ اس طرح وہ مختلف کچہریوں کو عبور کرتے ہوئے بلندترین مقام پر ساتویں کچہری میں پہنچے۔ یہاں بھی رسول اللہ موجود تھے، ان کے گرد کبار اولیاء نے حلقہ بنا رکھا تھا، لیکن یہاں بھی خسرو کو مایوسی ہاتھ لگی۔ خسرو کو مایوس دیکھ کر رسول اللہ نے اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے ایک نقاب پوش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ نقاب الٹ کر دیکھو۔ اب جو نقاب الٹتے

ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ نقاب پوش کوئی اور نہیں نظام الدین اولیاء کی ذات گرامی ہے۔ خسرو اپنے شیخ کا یہ بلند مرتبہ دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ وہ ایک وارفتگی کے ساتھ اپنے شیخ کی قدم بوسی کے لیے لپکے۔ لیکن عین اسی لمحہ بوعلی نے خسرو کے سینے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور چشم زدن میں یہ مناظر ان کی نگاہوں سے غائب ہو گئے۔ یہ ہے وہ قصہ جو صوفی حلقوں میں ان اشعار کے پس منظر کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ بظاہر تو یہ ایک نعت ہے لیکن اس کا اصل مقصد مرید کے دل پر اپنے شیخ کی عظمت کا سکہ بٹھانا ہے۔ ایک ایسی مجلس جہاں خدا خود میر مجلس ہو، محمدؐ شمع محفل ہوں اور روحانیوں کے اس اجتماع میں ہمارے اولیاء مختلف سطحوں پر اپنی چلت پھرت اور مسلسل شرکت کے دعویدار ہوں، ایک ایسی مجلس کی ثقاہت پر شعر و نغمہ سے تو دلیل قائم کی جا سکتی ہے وحی اور عقل سے نہیں۔

۲۵

المرید لا یرید

رات سونے میں کچھ ایسی تاخیر نہ ہوئی تھی لیکن نہ جانے کیوں آج تھکن کا احساس کچھ زیادہ تھا۔ ویسے تو آج کوئی خاص مصروفیت نہ تھی۔ سو یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ آج زیادہ تر وقت ہوٹل میں ہی آرام کروں گا۔ آج ستمبر کی ۱۳ تاریخ تھی۔ اب اولوداغ کی چوٹیوں پر روحانیوں کے اجتماع میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ مصطفیٰ اوغلو نے کہہ رکھا تھا کہ آج کسی وقت بھی کوئی خبر آسکتی ہے۔ اولوداغ کی روحانی اسمبلی میں جہاں ہفت اقالیم کے قطب اپنے چالیس ابدال اور درجنوں اوتاد و اخیار کے ساتھ جمع ہوتے ہیں کسی ایسی مجلس میں شرکت کے خیال سے ہی دل بلیوں اچھلنے لگتا اور کبھی اندیشوں اور خطرات کے پیش نظر ایک طرح کی ہیبت طاری ہو جاتی۔ شاید یہ اس پر اسرار سفر کا اثر تھا کہ نفسیاتی دباؤ کے سبب سفر سے پہلے ہی قویٰ جواب دینے لگے تھے۔ ابھی میں چشمِ تصور میں اس سفر کی منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف ہاشم اور ان کے احباب تھے جو الوداعی ملاقات کے لیے آنا چاہتے تھے۔ پرسوں میری روانگی کا دن تھا۔ کل کا دن اولوداغ کے لیے مخصوص تھا اور آج دن کا بڑا حصہ مجھے انتظار میں گزارنا تھا۔

لیکن ابھی تو تکان کا غلبہ ہے۔ میں نے ہاشم سے کہا کہ اگر چاہو تو دوپہر کے بعد آجاؤ۔

فون رکھنے کے بعد اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ روحانیوں کے پچھلے سالانہ جلسے کی رپورٹ پر ایک نظر ڈال لی جائے جو مجھے ہوجا عثمان نے چند دن پہلے بھجوائی تھی۔ کاغذات کے انبار سے وہ رپورٹ نکالی اور چائے

کے گھونٹ کے ساتھ اس کے صفحات الٹنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس رپورٹ کے مختلف حصے مختلف لوگوں نے مل کر تیار کیے تھے، کہیں ہاتھ کی لکھی عربی تحریر تھی تو کہیں ترکی زبان میں جگہوں اور آدمیوں کے نام لکھ کر مختلف قسم کے نقشے اور زائچے بنا دیے گئے تھے۔ اور کہیں مختلف ناموں کے گرد مختلف ہندسوں کو ایک خاص ترتیب سے سجایا گیا تھا۔ جا بجا انگریزی ٹائپ میں مقامات اور بڑے شہروں کے نام لکھے تھے اور ان کے گرد خط کشیدہ دائرے بنا کر انسانی نام لکھ دیے گئے تھے۔ اس مسودے کو کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھنے سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اولوداغ کی پچھلی کانفرنس میں ہفت اقالیم کے اقطاب کے علاوہ چالیس ابدال، بارہ اہل ارشاد اولیاء اور بارہ اہل تکوین اولیاء نے شرکت کی تھی۔ ابدال کی ایک بڑی تعداد بلادشام سے آئی تھی جنھوں نے اپنے طور پر سات سو اخیار کی سالانہ کارگزاریوں کی رپورٹ پیش کی۔ یہ بھی پتہ لگا کہ سات اقالیم کے قطب کے علاوہ جن کا اپنے اقالیم میں قیام ہوتا ہے، پانچ مزید قطب بھی ہوتے ہیں، جنہیں قطب ولایت کی حیثیت حاصل ہے اور ان کا مستقل قیام بلادشام میں رہتا ہے۔ رہے ہفت اقالیم کے ہفت اقطاب تو ان کی حیثیت دراصل یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک فی زمانہ کسی نہ کسی نبی کا قائم مقام ہے اور وہ سات انبیاء جن کی قائم مقامی ہفت اقالیم کے قطب کرتے ہیں ان کے نام اس طرح ہیں۔ ابراہیم، موسیٰ، ہارون، ادریس، عیسیٰ، آدم اور یوسف۔ اس کے علاوہ چار اوتاد دنیا کے چاروں کناروں پر ہمہ وقت متعین رہتے ہیں۔ چار عماد مختلف جگہوں سے امور دنیا پر نظر رکھتے ہیں۔ ان چاروں کے نام محمد ہیں۔ غوث یا قطب الاقطاب ایک ہی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ البتہ یہی قطب الاقطاب جب قطب وحدت بن جاتا ہے تو اسے کائنات پر مکمل تصرف حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ستر نجباء حسن کے نام سے مصر کے صحرا میں رہتے ہیں۔ نقباء کی صحیح تعداد تو معلوم نہ ہو سکی البتہ یہ ضرور پتہ لگا کہ ان کے نام علی ہوتے ہیں اور ان کی سکونت عموماً مغارب میں ہوتی ہے۔ گذشتہ سال کی کارروائی کو ایک نقش کے ذریعہ بیک نظر دکھایا گیا تھا لیکن اس کا سمجھنا کچھ آسان نہ تھا۔ مختلف قسم کے وفق ونقوش کے درمیان ایک گول دائرے میں شکستہ خط میں لفظ اللہ لکھا تھا اور اس کے اوپر غالباً اس مجلس کو نظر بد سے بچانے کے لیے ایک یک چشمی علامت بنا دی گئی تھی۔ رپورٹ بند کر کے واپس بیگ میں رکھ دی۔ کبھی اس خیال سے مسرت ہوتی کہ روحانیوں کی اس مجلس میں بہ نفس نفیس شرکت کا موقعہ ملے گا۔ اور کبھی خطرات واندیشوں کے سبب دل ہولنے لگتا۔

ظہر کے بعد ہاشم، ولید اور ساجد تشریف لے آئے۔ ہاشم حسب معمول متفکر اور سنجیدہ لگ رہے تھے۔

ساجد کے چہرے پر ایک طرح کا کھلنڈرا پن تھا اور ولید نے اپنے ہاتھوں میں منقش بسم اللہ والی پورسلین کی پلیٹ تھام رکھی تھی جسے وہ بطور تحفہ مجھے دینا چاہتے تھے۔ ہاشم کو میری واپسی کا دکھ تھا۔ کہنے لگے سلوک کے اس راستے پر جب اندیشوں، وساوس اور شبہات نے آ گھیرا ہے، آپ عین دوراہے پر ہمیں چھوڑے جا رہے ہیں۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ کچھ دن مزید آپ کا قیام ہوتا اور راہ سلوک کی گتھیوں کو سلجھانے میں آپ سے مدد ملتی۔

ساجد نے حسب معمول چہکتے ہوئے مداخلت کی۔ کہنے لگا کہ کل شب دیر تک ہم لوگ آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ استنبول تو ہم لوگ ایک شیخ کی تلاش میں آئے تھے، ایک ایسے شیخ کامل کی تلاش میں جو ہمیں اپنی صحبتوں سے صیقل کر دے، جس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ہم اپنی نجات کے سلسلے میں مطمئن ہو جائیں۔ لیکن یہاں آ کر خود ادارہ مشائخت کے بارے میں ہم شبہات کا شکار ہو گئے۔ ہماری بد دلی شیخ ہشام اور عبدالکریم کے باہمی جھگڑوں کے سبب شروع ہوئی تھی۔ پھر ہم شیخ محمود آفندی کے تقدیسی ہالے میں گرفتار ہوئے۔ لیکن جب ہم لوگ محمود آفندی سے ملاقات کے لیے گئے تو ان کے شخصیت کے دو رنگ دیکھے۔ ایک طرف تو وہ عوام کے لیے مستجاب الدعوات ہیں، ان کی دست بوسی اور ان کی ایک جھلک دیکھ لینا ہی مرید کے لیے وجہ نجات ہے اور دوسری طرف جب وہ خواص میں ہوتے ہیں یا اپنے برابر کے لوگوں میں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں تو وہ بھی عام انسانوں کی طرح دوسروں کی دعاؤں کے محتاج ہوتے ہیں۔ پچھلے ہفتہ ہم ان سے ملاقات کے لیے گئے تھے۔ اس موقع پر دو مختلف مجلسوں میں ان کے یہ دو مختلف روپ نظر آئے۔ پاکستانی نقشبندیوں کے وفد میں، جسے بمشکل ہی اذن باریابی مل سکا تھا، میں بھی شامل ہو گیا تھا۔ شیخ ایک کرسی پر براجمان تھے، حاضرین مصافحہ کے بعد دعاؤں کی درخواست کے ساتھ ان کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ لوگ دعاؤں کی درخواست کرتے رہے۔ شیخ نے گاہے بہ گاہے آمین اور ان شاء اللہ کے علاوہ کوئی کلمہ زبان سے نہ نکالا۔ یہ تھی عوامی ملاقات کی ایک جھلک جس کے لیے لوگ دور دراز سے شیخ محمود کی بارگاہ میں آتے ہیں۔ دوسری طرف کچھ ہی دیر بعد افغانستان سے کبار صوفیا کا ایک گروہ آیا۔ میں بھی کسی طرح اس ملاقات میں جا گھسا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ خواص کی اس مجلس میں نشستوں کا انتظام بدلا ہوا ہے۔ شیخ محمود تو اپنی کرسی پر ہی براجمان رہے البتہ ان کے اردگرد چار پانچ کرسیاں لگا دی گئی تھیں جن پر اس وفد کے اکابرین بیٹھے تھے۔ طلباء اور خورد سالوں کو فرش پر جگہ ملی تھی۔ جس بات پر مجھے سخت حیرت ہوئی وہ یہ تھی کہ اس وفد کے سربراہ نے اپنا ہاتھ شیخ کے شانے پر رکھا اور ان کی بحالی صحت کے لیے بآواز بلند دعا کرنے لگا۔ یہ صوفی شیخ کوئی پندرہ بیس منٹ

تک مختلف آیات قرآنی پڑھ کر شیخ محمود پر دم کرتے رہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ جس شیخ کو مکاشفہ کی دولت حاصل ہو، جو کبار ارواح نقشبند، غوث اعظم حتیٰ کہ رسول اللہ سے بھی بہ نفس نفیس دعاؤں کی درخواست کرنے پر قادر ہو، اسے کسی ہم عصر صوفی شیخ کی جھاڑ پھونک کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ ہم تو یہ سمجھ کر آئے تھے کہ شیخ کا خدا سے راست رابطہ ہے۔ رسول اللہ کی مجلسوں میں ان کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ لیکن اب جو انھیں دوسروں کی دعاؤں اور جھاڑ پھونک کا محتاج دیکھا تو ان قصے کہانیوں سے اعتبار اٹھ گیا کہ فی الواقع یہ حضرات رسول اللہؐ کے مجلس نشیں ہیں۔

کیا عمر ہوگی شیخ آفندی کی؟ میں نے ساجد کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کی۔

میرا خیال ہے اسّی پچاسی سال سے زیادہ ہی کے ہوں گے۔

اسّی سال؟ یہ تو وہ عمر ہے جب، بقول شیخ ناظم حقانی، فرشتے قلم اٹھا لیتے ہیں۔

تو کیا صوفیاء سے شطحیات عمر کے اسی مرحلے میں صادر ہوتی ہیں؟ ہاشم نے مداخلت کی۔

شطحیات کے لیے عمر کی شرط نہیں بلکہ دماغ میں سیروٹونین کی سطح کی بلندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ولید نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ طرح لگائی۔

اب دیکھو جو باتیں ناظم حقانی اسّی سال کی عمر میں کہہ رہے ہیں اسی قسم کی باتیں مولانا اشرف علی تھانوی نے قلم اٹھانے سے پہلے والی عمر میں کہہ دی تھیں۔ ولید نے مزید وضاحت کی۔

تو کیا ان کے لیے قلم پہلے ہی اٹھا لیا گیا تھا؟ ساجد نے شرارت آمیز لہجے میں پوچھا۔

لگتا تو ایسا ہی ہے۔ اب دیکھو ناظم حقانی کہتے ہیں کہ ملک الموت ان کے مریدوں کی روح قبض کرنے نہیں آئیں گے۔ روح کا نکلنا چونکہ ایک تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہے اس لیے ناظم حقانی کا کہنا ہے کہ وہ خود اپنے مریدوں کی روح نکال کر ملک الموت کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کچھ اسی قسم کی بات مولانا اشرف علی تھانوی کے بارے میں کہی جاتی ہے، جیسا کہ اشرف السوانح میں لکھا ہے، انہوں نے فرمایا کہ ایک مریدنی نے عالم سکرات میں میرا نام لے کر کہا کہ وہ اونٹنی لے کر آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس پر بیٹھ کر چل پھر اس کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

واقعی؟ ساجد نے حیرت کا اظہار کیا۔

ہاشم جواب تک خاموش، سنجیدہ کہیں کھوئے ہوئے تھے، سنبھل کر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے اس قسم کے دعوں

نے بڑے مسائل پیدا کر دیے ہیں ان کو مانیں تو دین کا ناس ہوتا ہے اور نہ ماننے کا سوال نہیں کہ یہ سب باتیں بڑی مقدس ہستیوں کی زبان سے نکلی ہیں۔انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟

میرا موقف تو آپ کو معلوم ہے: اللہ تعالیٰ نے ہمیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے۔ ہمیں ہر مسئلہ کو وحی اور عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا حساب ہماری فہم وبصیرت کے مطابق لے گا۔

آپ کی بات بالکل درست ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ معتبر اور مقدس ہستیوں کی زبانی خدا کے دیدار کا دعویٰ، رسول اللہ کی زیارت کے واقعات بلکہ عین عالم بیداری میں آپؐ سے ملنے کی باتیں، جو اس تواتر کے ساتھ نقل ہوئی ہیں اسے عقل اور وحی کے ساتھ کیسے ہم آہنگ کیا جائے۔امام نسفی سے تو آپ واقف ہوں گے، ان کی شرح عقائد اہل سنت میں متداول ہے۔ان کا موقف ہے کہ یہ کہنا جائز ہے کہ خانۂ کعبہ بعض اولیاء اللہ کی زیارت کو چلا جاتا ہے۔اسی طرح غزالی جو جمہور مسلمانوں کے لیے حجۃ الاسلام کی حیثیت رکھتے ہیں، انہوں نے المنقذ من الضلال میں لکھا ہے کہ صوفیائے کرام فرشتوں اور انبیاء کی ارواح کو عین عالم بیداری میں دیکھتے ہیں، ان کا کلام سنتے اور ان سے فوائد حاصل کرتے ہیں۔اب سنیے شیخ عبدالقادر جیلانی کی کرامت، یہ کہتے ہوئے ہاشم نے اپنے دستی بیگ سے فوٹو کاپی اوراق کی ایک فائل نکالی۔مطلوبہ صفحہ کھولا پھر میری توجہ خاص طور پر مبذول کرتے ہوئے کہنے لگے۔دیکھیے روح المعانی تو اہل سنت کی معتبر تفسیر ہے نا؟ اس میں آیت ۲۲/۳۵ کے ذیل میں لکھا ہے: شیخ عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں کہ میں نے رسولؐ اللہ کو ایک دن ظہر سے پہلے دیکھا۔آپؐ نے فرمایا: بیٹا تم بولتے کیوں نہیں، تبلیغ کیوں نہیں کرتے؟ میں نے عرض کیا ابّا جان میں عجمی آدمی ہوں۔فصحائے بغداد کے سامنے اپنی زبان کیسے کھولوں، تو مجھ سے رسولؐ اللہ نے کہا کہ اپنا منہ کھولو، میں نے منہ کھولا، آپؐ نے سات مرتبہ اپنا لعاب دہن میرے منہ میں ڈالا۔پھر فرمایا کہ اب لوگوں سے کلام کرو اور انہیں اپنے رب کی طرف حکمت اور موعظۃ حسنۃ سے بلاؤ۔آگے لکھا ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی ظہر کے بعد تبلیغ کی غرض سے مسجد میں بیٹھ تو گئے لیکن ان پر ہیبت طاری ہوگئی۔تب دیکھا کہ علیؓ ان کے سامنے کھڑے ہیں، کہہ رہے ہیں بیٹا تقریر کر۔لکھا ہے: میں نے پھر عرض کیا کہ مجھ پر رعب طاری ہوگیا ہے۔فرمایا منہ کھولو! میں نے منہ کھولا، آپؓ نے چھ مرتبہ اپنا لعاب دہن میرے منہ میں ڈالا اور پھر غائب ہوگئے۔علامہ آلوسی کی اسی روح المعانی میں شیخ ابوالعباس مرسی کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے ان سے اس خیال

سے مصافحہ کرنا چاہا کہ انہوں نے بڑے بڑے اہل اللہ سے ملاقات کی ہے، اس پر شیخ نے فرمایا کہ میں نے اس ہاتھ سے کبھی کسی سے مصافحہ نہیں کیا جس ہاتھ سے میں نے رسولؐ اللہ سے مصافحہ کیا ہے۔ شیخ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر رسولؐ اللہ ایک لمحہ کے لیے بھی میرے سامنے سے اوجھل ہو جائیں تو میں اپنے آپ کو مسلمان شمار نہ کروں۔

ان واقعات کے بیان سے علامہ آلوسی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ رسولؐ اللہ اپنی قبر میں جسم اور روح کے ساتھ زندہ ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کے حجابات اٹھا لینے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو رسولؐ اللہ کی زیارت نصیب ہو جاتی ہے۔ اب ذرا علمائے ہند و پاک کے بعض حوالے بھی سنتے جائیے جسے میں نے اپنی ڈائری میں نقل کر رکھا ہے۔ تذکرۃ الرشید کے مصنف نے رشید احمد گنگوہی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بسا اوقات صبح کی نماز حرم شریف میں پڑھتے دیکھے گئے جبکہ عملاً وہ گنگوہ ہی میں ہوتے تھے۔ نقشِ حیات میں حسین احمد مدنی نے ایک نقشبندی بزرگ کی بابت لکھا ہے کہ وہ حضرت نانوتوی کے مزار پر حاضر ہو کر دیر تک مراقب ہوئے، بعد میں یہ انکشاف کیا کہ انہوں نے مراقبہ میں حضرت نانوتوی سے تحریک خلافت کے کارکنان پر حکومتی عتاب کا تذکرہ کیا تو انہوں مولانا محمود حسن کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ مولوی محمود حسن عرش خداوندی کو پکڑ کے اصرار کر رہے ہیں کہ انگریز کو جلد ہندوستان سے نکال دیا جائے۔ اب ایک واقعہ حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات سے بھی سن لیجئے۔ ان کا کہنا ہے کہ اولیاء اللہ کی صور المثالیہ متعدد مقامات میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ حالانکہ صاحب صور کو قطعاً اس کا علم نہیں ہوتا جیسا کہ حضرت مخدومی قبلہ گاہی نے فرمایا کہ کوئی انہیں مکہ میں دیکھتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ ہم نے انہیں بغداد میں دیکھا حالانکہ وہ اس دوران اپنے گھر سے نکلے ہی نہیں ہوتے۔

یہ تو چند مثالیں ہیں ورنہ ایسے دعوں کا ایک بڑا لمبا سلسلہ ہے۔ بات وہیں آ کر رک جاتی ہے کہ انہیں قبول کروں تو ایمان جاتا ہے اور اگر ان کا انکار کر دوں تو بزرگوں کا اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ ہم لوگ اس صورت حال سے بہت پریشان ہیں، سوچا کہ آپ کے سامنے مستند حوالوں کے ساتھ اپنی بات رکھیں گے، شاید آپ کچھ رہنمائی کر سکیں۔ ہاشم نے ڈائری بند کی۔ ایک لمحہ کے لیے مجلس پر خاموشی چھائی رہی۔

اور وہ فتح الربانی والی بات بھی تو بتاؤ، ولید نے جیسے ہاشم کو کوئی بھولا ہوا نکتہ یاد دلا دیا ہو، اس نے ڈائری کھولی۔ متعلقہ صفحات الٹے، کہنے لگے، اب دو ایک جملے شیخ عبد القادر جیلانی کی فتح الربانی سے بھی سنتے جائیے۔ کہتے ہیں کہ لوگو! میری بات سنو، میرا کہنا مانو، میری حیثیت تمہارے لیے کسوٹی کی ہے۔ میں تمہارے کھوٹے کھرے کو خوب پہچانتا ہوں۔ پھر آگے فرماتے ہیں کہ اے فقیہو! اے زاہدو! اے عابدو! میرے پاس

تمہاری موت اور تمہاری حیات کی خبریں ہیں۔ جب تمہارے امور کی ابتداء مجھ پر مشتبہ ہوجاتی ہے تو انجام کار تمہاری موت کے وقت کا انکشاف ہوجاتا ہے۔ ہاشم نے پھر ڈائری بند کر لی اور میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

میں نے کہا کہ مشاہدۂ حق، زیارتِ رسولؐ یا قبور وارواح کا مکاشفہ، روحانیوں کے نزدیک یہ سب تجربے کی باتیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ سمجھ کر کرنے کا کام نہیں بلکہ کر کے سمجھنے کی چیز ہے۔ تم لوگوں نے مراقبہ اور چلّہ کشی میں خاصا وقت لگایا ہے۔ اگر کبھی شیخ کا دامن چھوڑا ہے تو بہت دنوں تک اسے تھامے بھی رہے ہو۔ ان مجاہدوں سے تمہیں کیا لگتا ہے؟ کیا کبھی تصورِ شیخ بشکل حقیقت بن سکا؟ تم جن سالکین کے ساتھ اسمٰعیل آغا میں روحانی ورزشیں کرتے رہے انہیں بھی کبھی ٹٹولنے کی کوشش کی؟ کیا ان میں سے کوئی رسول اللہ کی زیارت سے مشرف ہو پایا ہے؟

جس سے بھی بات کی کوئی کھلتا نہیں۔ اکثر لوگوں کو مایوس پایا مگر وہ اپنی روحانیت کا بھرم برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

ہاں جب میں نے ایک بار اللہ یار خاں کو یہ کہہ دیا کہ میں نے کل آپ کو سلطان احمد میں مغرب کی نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ وہ اس بات کی تردید کے بجائے مسکرا کر خاموش ہوگئے۔ ساجد نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

جی ہاں! میرا بھی یہ احساس ہے کہ وہ سالکین جنہوں نے ابھی کچھ حاصل نہیں کیا ہے، اپنے بارے میں خرق عادت باتوں کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ بعض لوگ خوابوں کے بیان سے بزرگی کا تاثر دیتے ہیں۔ ہاشم نے ساجد کی تائید کی۔

مگر خواب تو آپ بھی دیکھتے ہوں گے، بزرگی والے خواب نہ سہی۔ میں نے ہاشم کو چھیڑنے کی کوشش کی۔

خواب نہیں، وہ سب nightmare ہوتے ہیں۔ میں ہر وقت اس احساس میں گھلتا رہتا ہوں کہ شاید میرے اندر ہی روحانیت کو اخذ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ چھ سات سالوں سے اس راستے میں لگا ہوں۔ مشہور شیوخ کی جوتیاں سیدھی کی ہیں لیکن اب بھی عالم یہ ہے کہ مراقبے کا ہر جال خالی جاتا ہے۔ رسولؐ اللہ کی زیارت تو دور کی بات زندہ شیخ کا تصور بھی پاسپورٹ سائز سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ شیوخ سے جب بھی شکایت

کی وہ کہتے ہیں کہ تصور شیخ کی دولت لاکھوں میں ایک کو ملتی ہے۔ جب تصورِ شیخ اتنی عنقا چیز ہے تو پھر ارواح نقشبندیہ سے توصل اور رابطہ کتنوں کی قسمت میں آتا ہوگا اور اسی پر زیارتِ رسولؐ کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

ہاشم شاید ابھی کچھ اور بولتے لیکن ولید نے سوال کو ایک دوسرے پہلو سے مرصع کیا۔ کہنے لگے: یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب یہاں نہ کوئی مکاشفہ ہوتا ہے، نہ امورِ دنیا پر تصرفات کا نسخہ ہاتھ لگتا ہے، زندگیاں شیخ کی خدمت میں گزر جاتی ہیں یہاں تک کہ سالک اپنی کبرسنی یا فطانت کے سبب خود شیخ بن جاتا ہے، تو پھر یہ سلسلہ چل کیسے رہا ہے؟ اتنے بڑے پیمانے پر بیعت وارشاد کے پیچھے آخر راز کیا ہے؟

میں نے کہا کہ تم لوگوں کے سوال میں ہی دراصل تمہارے اضطراب کا جواب پوشیدہ ہے، بس اسے برآمد کرنے کی ضرورت ہے۔

واقعی؟ ساجد اور ولید نے بیک زبان حیرت کا اظہار کیا۔

میں نے کہا: ہاں بالکل۔ سوالات کو مسلسل مرصع کرتے رہنے اور اسے مختلف پہلو سے الٹ پلٹ کر دیکھتے رہنے سے خود ان سوالات کے اندر سے جواب برآمد ہو جاتا ہے۔ اب سنو! یہ سب کچھ ہوتا کیسے ہے۔ ایک آدمی شیخ کیسے بنتا ہے، مکاشفے کی دولت کب اور کیسے ہاتھ آتی ہے۔ اہل دل اس نکتہ سے خوب واقف ہیں کہ پیراں نمی پرند مریداں می پرانند یعنی پیر نہیں اڑتا ہے بلکہ مرید اسے اڑاتے ہیں۔ مریدوں کا پروپیگنڈہ جتنا زبردست ہوتا ہے پیر کا قد بھی اسی مناسبت سے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اب رہا بے چارہ مرید، تو اس کی اہل نظر نے تعریف ہی یہ کی ہے کہ المرید لا یرید۔ یہ بڑی مسکین مخلوق ہے جو شیخ کے قدموں میں اپنی جان و مال، عزتِ نفس، دین و ایمان سب کچھ نچھاور کرنے کے بعد بھی اسی غلط فہمی کا شکار رہتی ہے کہ وہ جو کچھ بھی ہے شیخ کے لطف و کرم کے سبب ہے۔ اب تم پوچھو گے کہ یہ مسکین مخلوق تیار کیسے ہوتی ہے۔ اچھا بھلا آدمی اچانک اپنا سب کچھ، حتیٰ کہ اپنی نجات کا نازک اور حساس مسئلہ بھی اپنے ہی جیسے کسی انسان کے ہاتھ میں دے کر کیسے مطمئن ہو جاتا ہے؟ یہ راز تمہیں اگر معلوم ہو گیا تو شاید تم مرید بننے کے بجائے مرید بنانے میں دلچسپی لینے لگو۔ بات یہ ہے کہ انسان کے اندر غور و فکر، تحلیل و تجزیہ اور خیر و شر میں تمیز کی ایک فطری صلاحیت رکھی گئی ہے۔ وحی سے یہ صلاحیت مزید جلا پاتی اور صیقل ہوتی ہے، جبکہ توہمات کے زیر اثر یہ صلاحیتیں کند ہو جاتی ہیں۔ پیر کچھ اور نہیں کرتا، وہ مختلف حیلے بہانوں سے، مجاہدہ اور تربیت کے حوالے سے، آپ کی شخصیت کا عقلی سوئچ آف کر دیتا ہے۔ بعض مریدوں کا یہ سوئچ جلدی آف ہو جاتا ہے اور بعض کو عزتِ نفس کا سودا کرنے اور

عقلی رویّے کو تجنے میں خاصا وقت لگ جاتا ہے۔اس لیےتم دیکھتے ہو کہ شیخ کے بعض منظورنظر مرید سلوک کی بہت سی منزلیں ایک ہی جست میں طے کر لیتے ہیں۔ دراصل یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنکا سوئچ آف کرنا قدرے آسان ہوتا ہے یا پھر وہ جو اس راستے میں اپنا کیریئر دیکھتے ہیں، جو اس نکتے کو سمجھتے ہیں کہ شیخ کی ایک نگاہ کرم انہیں خلعت اور اجازت سے سرفراز کرسکتی ہے۔ اچھے بھلے انسان اسلام کے دھوکے میں جب روحانیوں کے جال میں پھنستے ہیں تو انہیں ابتداً اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہوپاتا کہ شیخ کی تمام تر توجہ اس کی شخصیت کا سوئچ آف کرنے پر ہے۔اس مقصد کے لیے مختلف نفسیاتی حربے اپنائے جاتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ سالک کی انا بہت بڑھی ہوئی ہے اسے قابو میں کرنے کی ضرورت ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ وہ علم کے پندار میں مبتلا ہے، اسے یہ زعم ہے کہ وہ دین کا فہم رکھتا ہے، علم کا یہ حجاب منزل سلوک میں اس کی راہ کا روڑا بن گیا ہے۔ گویا شیخ ہر اعتبار سے اس بات کا اطمینان کر لیتا ہے کہ سالک نے اپنے آپ کو پوری طرح میرے قدموں میں ڈال دیا ہے۔اب اس کے نزدیک خیر وشر کا پیمانہ شیخ کی ذات ہے۔ بسا اوقات شیخ اس بات کے اطمینان کے لئے مرید کی زبان سے خلاف ایمان کلمات کہلانا چاہتا ہے اور جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ مرید کو اتباعِ شیخ میں خلاف دین کلمات کہنے میں بھی کچھ تامل نہیں تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ اب اس کا سوئچ پوری طرح آف ہو چکا ہے۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ معین الدین چشتی از راہ امتحان اپنے مرید سے لا الٰہ الا اللہ چشتی رسول اللہ کہلانا چاہتے ہیں تو اس کے پیچھے دراصل یہی راز ہے۔اور اگر کوئی مرید اپنے شیخ اشرف علی تھانوی کو یہ عریضہ لکھ بھیجتا ہے کہ جب وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا چاہتا ہے تو اس کی زبان سے غیر ارادی طور پر اشرف علی رسول اللہ نکل جاتا ہے تو یہ سمجھ لیجئے کہ وہ چالاک مرید تملق اور چاپلوسی کے ذریعہ شیخ کی قربت اور اس سے خلافت کے حصول کے لیے سرگرداں ہے۔ بسا اوقات شیخ اپنے مرید کے بجھے سوئچ کے اطمینان کے لیے اس کی طرف اپنا جھوٹا نوالہ یا بچا کچھا کھانا بطور تبرک بڑھا دیتا ہے اور یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ مرید کے اندر کراہیت کا کوئی عنصر تو نہیں پایا جاتا اور بعضے مرید جن کا سوئچ آف ہو چکا ہوتا ہے وہ اس تاک میں بھی لگے رہتے ہیں کہ کب شیخ کی کوئی متروکہ چیز بطور تبرک ان کے ہاتھ آجائے۔بعض لوگوں نے تو خدمت شیخ میں ایسے واقعات بھی لکھے ہیں کہ وہ کس طرح حصولِ برکت کے خیال سے شیخ کی نظر بچا کر ان کا اگالدان پی گئے۔صالح طبیعتیں جن باتوں سے اِبا کرتی ہیں اسے تصوف کی دنیا میں سالک کا امتحان سمجھا جاتا ہے۔

عام طور پر شیخ سے اس درجہ کی عقیدت کے جواز کے لیے صحابہ کرامؓ کی محبت رسولؐ کو جواز بنایا جاتا

ہے۔صوفیاء کہتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ حضورؐ کے وضو کا پانی نہیں گرنے دیتے۔آپؐ کا لعاب اپنے جسموں پر مل لیتے ،اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ولید نے دوران گفتگو مداخلت کی۔

دیکھئے اول تو یہ خیال ہی لغو ہے کہ رسولؐ اللہ کی ذات سے ان صوفیاء کا کوئی مقابلہ ہوسکتا ہے۔دوسری بات یہ کہ یہ جو خلق میں مشہور ہے کہ صحابہؓ وضو کا پانی زمین پر نہیں گرنے دیتے یا اس انتظار میں رہتے کہ کب انہیں لعاب دہن ملے اور وہ اسے چہرے یا جسم پر مل لیں اور کب رسولؐ اللہ بال ترشوائیں اور موئے مبارک ان کے حصے میں آئے،تو یہ تمام روایتیں رسول اکرمؐ کی نفیس طبیعت اور اسلام کے آفاقی پیغام سے مغائر ہیں۔یہ روایتیں دراصل اسی لیے تراشی گئی ہیں کہ بعد کے مشائخ عام انسانوں کی گردنوں پر خود کو مسلط کرنے کے لیے ان تراشیدہ روایتوں میں اپنے عمل کا جواز ڈھونڈیں۔رسولؐ اللہ موئے مبارک بانٹنے کے لیے نہیں آئے تھے لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ بعض لوگوں نے شعرِ رسولؐ کو شعائر اللہ میں شامل کیا اور باقاعدہ شعائر اللہ کی اس تعبیر پر کتابیں تصنیف کیں۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ شیخ اپنے مرید کی بند دماغی کا امتحان لینے کے لیے اسے مختلف مراحل سے گزارتا ہے۔کبھی اسے شیوخ کی قبروں پر چلّہ کشی کا حکم ہوتا ہے اور وہ بے چارہ عالم مراقبہ میں ہلوسے کا شکار ہوجاتا ہے،کہتا ہے صاحب قبر سے اسے فیض پہنچ رہا ہے۔حالانکہ قرآن اس بات کی شدت سے نکیر کرتا ہے کہ مردے سنتے ہیں لیکن ان روحانیوں کا اصرار ہے کہ کبار صوفیاء اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔قرآن کا موقف اس مسئلہ پر جو کچھ بھی ہو ان کے بزرگوں کی ارواح اپنی قبروں میں اہل حاجت کی مدد کے لیے تیار بیٹھی ہیں۔مرید کو جب ان خرافات پر کامل یقین ہوجاتا ہے تو سمجھئے کہ وہ شیخ کے کام کا آدمی بن گیا ہے۔اب اسے خلعت فاخرہ سے نواز کر کسی اہم مشن پر مامور کیا جاسکتا ہے۔

معاف کیجئے گا!ہاشم نے اعتراض وارد کیا،قرآن کی یہ آیت اپنی جگہ کہ فانك لا تسمع الموتی لیکن صحیحین کی اس روایت کا کیا کیجئے گا جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مقتولین بدر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسولؐ اللہ نے ان کے نام لے لے کر کہا کہ او فلاں او فلاں کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ تم خدا اور اس کے رسولؐ کا کہا مان لیتے۔ہم نے اپنے رب کا وعدہ سچا پایا۔تمہارے خداؤں نے جو تم سے وعدہ کیا تھا اس کا کیا ہوا؟راویوں نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ جو اس موقع پر موجود تھے بولے:یا رسولؐ اللہ آپ ان مردہ لاشوں سے کیا کہہ رہے ہیں ،کیا یہ سننے پر قدرت رکھتے ہیں کہ قرآن میں تو یہ آیا ہے کہ فانك لا تسمع الموتی،راوی کہتا ہے کہ اس پر

رسولؐ اللہ نے فرمایا: خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے میری یہ باتیں تم ان (لاشوں) سے بہتر نہیں سنتے۔

اس بارے میں میرا موقف صاف اور سیدھا ہے۔ میں نے ہاشم کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ تمام روایتیں جو قرآن کی صریح آیات سے ٹکراتی ہیں، خواہ کتنی ہی اونچی کتابوں میں کیوں نہ پائی جاتی ہوں، قرآن کے مقابلے میں ان کا اعتبار اتنا بھی نہیں ہوسکتا کہ ان کی ثقاہت کے لیے راویوں کے کردار کی جانچ کی جائے۔ جس بات کے خلاف قرآن کی شہادت موجود ہو بھلا اس کے بعد کسی جرح وتعدیل کی گنجائش ہی کب باقی رہ جاتی ہے۔ دیکھئے اس قسم کی تمام روایتیں جو قرآن کے عقلی رویّے کے مغائر ہیں ان کی تشکیل سے صرف اسلام کی تصویر ہی دھندلی نہیں ہوئی بلکہ مشائخیت کے جواز کے لیے بڑا وسیع میدان ہاتھ آ گیا۔ کرامتوں کے مدعی اس بات سے خوب واقف تھے کہ جب تک اصحاب رسولؐ کی محیرالعقول کرامتوں پر شہادت قائم نہ ہو، پیروں فقیروں کے خرق عادت واقعات کے لیے کوئی دلیل ہاتھ نہ آئے گی۔ جس طرح قرآن کے علی الرغم سماعِ موتیٰ کے جواز کے لیے روایت تراشی گئی اسی طرح صوفیاء کی کرامتوں پر جواز لانے کے لیے بھی یہ بتایا گیا، جیسا کہ بخاری میں منقول ہے، کہ اُسید بن حُضیر اور عباد بن بشیر کے ہاتھوں میں لاٹھی تھی، گھپ اندھیری رات میں ان کی لاٹھی روشن ہوگئی اور وہ اس روشنی میں گھر پہنچ گئے۔ ابوبکر صدیقؓ کی کرامت کے باب میں لکھا ہے کہ ایک بار ابوبکر صدیقؓ اور ان کے مہمانوں نے کھانا کھایا۔ جس قدر کھانا کھایا گیا اس سے کہیں زیادہ نیچے سے ابھر آیا۔ کہتے ہیں کہ کھانا کھانے کے بعد وہ پہلے کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ہوگیا۔ صحابہؓ سے منسوب ان خرق عادت واقعات سے بزرگوں کی کرامتوں کو نظری جواز ملا۔ ان حضرات نے اپنی مطلب براری کے لیے صرف قصے ہی نہیں بنائے بلکہ ان قصّوں کو آیات کے شانِ نزول کے طور پر منڈھ دیا۔ مثال کے طور پر آیت اسریٰ یا آیت ہجرت کو اسریٰ والمعراج بنادیا۔ نبیؐ کو آسمانوں میں اڑایا تاکہ صوفیاء کی اڑان اور ان کے طے الارض پر جواز قائم ہو۔ کیا بتاؤں اصطلاحوں کے معانی اور مفاہیم تک بدل ڈالے۔ ہاؤ ہُو کا نام ذکر قرار پایا۔ عمل کی ساری تلقین عامل کے حصے میں گئی اور عامل وہ ٹھہرا جو شیاطین جنوں کو قابو میں کرنے کے لیے سفلی نسخوں سے واقف ہو۔ مراقبہ، گوشہ نشینی اور اس قسم کے فرار کو عملِ صالح کا نام دیا گیا۔ ولی کے نام سے پیر، فقیر، مجذوب اور ملنگ کا تصور نگاہوں میں ابھرنے لگا۔ اولیاء کی مسند پر وہ لوگ قابض ہوگئے جنہوں نے آخری دین کی معطّلی کا سارا انتظام کر رکھا تھا، جو شریعت محمدی کے علی الرغم اپنی تراشیدہ طریقت پر نازاں تھے اور اسے

حقیقت تک رسائی کا مستند طریقہ بتاتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جن کی دریدہ ذہنی کا یہ عالم تھا کہ وہ ببانگ دہل اس بات کا اعلان کرتے تھے کہ اولوالعزم نبی کی شریعت کا زمانہ ہزار سال کا ہوتا ہے، جیسا کہ داؤد قیصری شارح فصوص الحکم نے لکھا ہے، اور ہزار سال کے بعد شیخ نقشبند مجدد الف ثانی کی خدائی اسکیم کے تحت آمد پر دلیل قائم کی ہے۔

ساجد محوِ حیرت تھے۔ان کے لیے میری بہت سی باتیں شاید انکشاف کا درجہ رکھتی تھیں۔ ولید تائیدی انداز سے کبھی سر ہلاتے اور کبھی اپنے احباب کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کرتے۔ ہاشم اس دوران اپنی ڈائری اور قلم سے اشتغال کرتے رہے۔ جی تو چاہتا تھا کہ شوریدہ سر نوجوانوں سے گفتگو کا یہ سلسلہ جاری رہے لیکن اولو داغ کے سفر پُر شوق کی تیاری کے خیال سے میں نے ان نوجوانوں سے اجازت لی۔ رخصت کرتے ہوئے اقبال کا یہ شعر پڑھا:

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

۲۶

نظر بو جک

مغرب کا وقت ہو چلا تھا اور اب تک کوئی خبر نہ آئی تھی۔ اس دوران مصطفیٰ اوغلو کو کئی بار فون کرنے کی کوشش کی لیکن رابطہ نہ ہوسکا۔ مغرب کی نماز کے بعد مصلے پر بیٹھا کل کے سفر کی بابت سوچ رہا تھا۔ بار بار صمیم قلب سے دعا نکلتی کہ یہ نادر موقع ہاتھ سے پھسل نہ جائے، چالیس سال بعد اولوداغ کی چوٹیوں پر روحانیوں کا عالمی اجتماع منعقد ہو رہا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ میں اس موقع پر استنبول میں موجود تھا اور قدرت نے درونِ خانہ روحانیوں سے کچھ ایسے رابطوں کا سامان پیدا کر دیا تھا جس سے نہ صرف یہ کہ اس اجتماع کی خبر ملی بلکہ اس میں شرکت کا امکان بھی پیدا ہو گیا۔ آج دن بھر اسی بیم و رجا کی کیفیت میں گزرا۔ دن ختم ہونے کو آیا تھا۔ ہر لمحہ یہ دھڑکا لگا تھا مبادا یہ سفر محض ایک خواب بن کر نہ رہ جائے۔ دل ہی دل میں سفر کی تیاریوں کا جائزہ لیتا۔ ہدایت تھی کہ ایک ہلکے پھلکے دستی بیگ کے علاوہ کوئی اور چیز ساتھ نہ لی جائے۔ کمر بند سے بندھے پرس میں سفری کاغذات، کچھ مقامی اور غیر ملکی کرنسی اور کریڈٹ کارڈ جیسی چیزیں رکھ لیں۔ کچھ دیر بعد بالآخر مصطفیٰ اوغلو کا فون آ ہی گیا۔ کہنے لگے کہ میں راستے میں ہوں۔ سفر کا انتظام ہو گیا ہے۔ اسمٰعیل آغا سے سفر کے لئے کچھ ضروری چیزیں خریدنی ہیں۔ تھوڑی دیر میں ان شاء اللہ ملاقات ہوگی۔ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد مصطفیٰ اوغلو تھکے ہارے، ہانپتے کانپتے ہوٹل پہونچے۔ آتے ہی کرسی پر نیم دراز ہو گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا جسے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے: لیجئے یہ رہا آپ کا سامانِ سفر۔ پھر جیب سے سرخ رنگ کا ایک خوبصورت لفافہ

نکالا، بولے: یہ رہا آپ کی شرکت کا اجازت نامہ، اسے حفاظت سے رکھئے اس کے بغیر داخلہ ممکن نہ ہوگا۔ کھول کر دیکھا کہ شاید میرے نام کا اجازت نامہ بنوالائے ہوں لیکن یہاں ایسی کوئی چیز نہ تھی، یہ تو پلاسٹک کا ایک طغریٰ تھا جو نظر بد سے بچنے کے لیے استنبول میں عام طور پر دکانوں میں فروخت ہوتا ہے۔ کہنے لگے اسے الٹ کر دیکھیے۔ اس کے پیچھے ایک چھوٹی سی چپس لگی ہے۔ کانفرنس کے الکٹرونک دروازے پر آپ کے داخلہ پر سبز بتّی جل جائے گی۔ یہ نہ ہو تو سرخ روشنی جلتی رہے گی اور الارم بج اٹھے گا۔ میں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا، احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔

اور یہ اس بیگ میں کیا ہے، میں نے مصطفی اوغلو سے پوچھا۔ بولے کھول کر دیکھئے اس میں درویشوں کا لباس ہے۔ بڑی مشکل سے یہ چیزیں جٹائی ہیں۔ اسمٰعیل آغا کے علاوہ یہ چیزیں کہیں اور نہیں ملتیں۔

اور اس عصا کا کیا کام ہے؟ اب میں ان کی اسکیم سمجھا۔ اپنے آپ پر خوب ہنسی آئی۔ تو کیا کل مجھے درویشوں کے لباس میں وہاں شرکت کرنی ہوگی؟

جی ہاں اس کے بغیر داخلہ ممکن نہیں۔

کل صبح سات بجے آنے کا وعدہ کر کے وہ رخصت ہو گئے۔

دوسرے دن کوئی گھنٹہ بھر پہلے ہی میں سفر کے لیے تیار ہوگیا۔ جبے کی لمبائی کچھ زیادہ تھی، فرش تک آتا تھا۔ اچانک یاد آیا کہ میرے بیگ میں کوئی دس پندرہ سال پرانا ایک سوڈانی جبہ موجود ہے جو ان دنوں کی یادگار ہے جب میں تیجانی صوفیاء کے ساتھ حلقۂ ذکر میں بیٹھا کرتا تھا۔ اسے زیب تن کیا، نقشبندی انداز کی قبر نما ٹوپی لگائی، سفید صافے کو نیم سوڈانی انداز سے لپیٹا، دو مختلف رنگوں کی تسبیح ہزار دانہ ڈالی۔ اس کے اوپر کانسے کے چھوٹے چھوٹے وفق ونقوش اور لکڑی کے دانوں والے ہار ڈالے۔ پھر بڑی احتیاط کے ساتھ گلے میں نظر بد کی وہ علامت حمائل کی جسے میرے شناختی کارڈ کی حیثیت حاصل تھی۔ ایک ہاتھ میں عصا تھاما اور دوسرے ہاتھ میں پلاسٹک کا سفری بیگ، تیار ہو کر آئینہ کے سامنے آیا۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر خود اپنی شخصیت سے عقیدت سی ہونے لگی۔ سخت حیرت ہوئی کہ کب سے میرے اندر ایک درویش چھپا بیٹھا تھا اسے بس باہر لانے کی ضرورت تھی۔ اب جو اسے مناسب لباس کا قالب ملا تو وہ ظاہر ہوگیا۔ اسی دوران ہوجا عثمان کا ٹیلیفون بھی آ گیا۔ انہوں نے بعض ضروری ہدایات دیں، احتیاط برتنے کی تاکید کی اور یہ بتایا کہ تم اجلاس میں ایک مقامی ترک درویش کی حیثیت سے شرکت کر رہے ہو، میں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ میں ترکی زبان سے برائے

نام واقف ہوں۔صورت شکل میں بھی ترکوں سے الگ دکھتا ہوں۔ کہنے لگے اس کی فکر نہ کرو، اس درجے کے مشارک وہاں اور بھی ہونگے جو مختلف علاقوں اور ملکوں سے آئے ہوئے ہوں گے۔ وہاں گفتگو اور سوال و جواب کا کوئی موقع نہ ہوگا، اور ہاں کسی قسم کے الیکٹرونک گیجٹس حتی کہ کیمرہ اور موبائل بھی وہاں لے جانے کی اجازت نہ ہوگی۔ان باتوں کا خاص خیال رکھنا۔

مصطفیٰ اوغلو وقت مقررہ پر تشریف لے آئے۔انہیں عام دنوں کے لباس میں دیکھ کر مجھے یک گونہ حیرت ہوئی۔میں نے پوچھا کیا درویشی کا پاس صرف مجھے ہی رکھنا ہوگا۔ کہنے لگے ہاں پاس بھی تو صرف آپ کے پاس ہے۔کیا مطلب؟ میں نے پوچھا۔ کہنے لگے، ایک ہی پاس کا انتظام ہوسکا ہے اور وہ بھی بڑی مشکل سے۔ نہ جانے کس درویش نے اپنی باری آپ کو دی ہے۔ یہ ہوجا عثمان کی خاص نگاہ التفات کا کمال ہے۔

کہیں وہ درویش خود ہوجا عثمان تو نہیں ہیں، میں نے پوچھا۔

کچھ عجب نہیں، مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے، مصطفیٰ اوغلو نے اپنا شبہ ظاہر کیا۔

مگر آپ کے بغیر تو سفر کا لطف ادھورا رہے گا۔

کہنے لگے فکر نہ کیجیے میں آپ کے ساتھ وہاں تک چلوں گا جہاں تک ممکن ہوسکے گا۔

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد ہم لوگ Yenikapi Ferry Terminal پہنچ گئے۔ یہاں سے بُرسا کا سفر کوئی ایک گھنٹہ کا ہے۔اور بُرسا سے اولوداغ کی مسافت یہی کوئی تیس پینتیس کلومیٹر ہوگی۔خوش بختی سے سفینہ پر اچھی جگہ مل گئی۔موسم خوشگوار تھا۔سطح آب کو چھوتی ہوئی ہوا کی لہر جب قریب سے گزرتی تو تازگی اور فرحت کا احساس جگا دیتی۔ ہمارا سفینہ بُرسا کی طرف رواں دواں تھا۔ہم لوگ جہاز کے اگلے حصّے میں کھلے مقام پر بیٹھے تھے۔سفینہ کے ساتھ ساتھ ایک پرندہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا تھا۔وہ مسلسل منڈلاتا ہی رہا یہاں تک کہ ہمارے ساتھ Guzelyali تک آیا۔ایک درویش کے سفر میں پرندے کا ساتھ ایک طرح کی سرّیت کا حامل تھا۔میں نے مصطفیٰ اوغلو سے کہا یقیناً اس پرندے میں کسی بزرگ کی روح ہے ورنہ وہ اس طرح اولوداغ کے سفر میں میری مشایعت نہ کرتا۔ مصطفیٰ اوغلو مسکرائے، کہنے لگے سرّیت معتقدین کے دل ودماغ میں ہوتی ہے۔اگر اس سفر میں کچھ مریدین آپ کے ساتھ ہوتے تو پرندے کی مشایعت اور اس کے مستقل منڈلاتے رہنے کو اشارۂ غیبی پر محمول کرتے۔ویسے پرندے کا رنگ سبزی مائل ہے۔کیا عجب کہ کسی ابدال کی روح ہو جو جبل قاسیون کے اجتماع کے بعد اب اولوداغ کی جانب محوِ سفر ہو۔اس لیے کہ کہا تو یہی جاتا ہے کہ چودہ ستمبر کی صبح کو

جبل قاسیون پر ابدالوں کا سالانہ اجتماع ہوتا ہے اور اسی دن شام میں کسی دور دراز مقام پر قطب الاقطاب کی اسمبلی منعقد ہوتی ہے جس میں ابدال و اقطاب اور اخیار و اوتاد سبھی شرکت کرتے ہیں۔ جبل قاسیون سے اولوداغ کا سفر اس قدر سرعت کے ساتھ یا تو طئ الارض کے ذریعہ ہو سکتا ہے یا طیر الارض کے ذریعہ۔

طیر الارض؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں میں نے ابھی اس پرندے کی مناسبت سے یہ مہمل سی اصطلاح وضع کی ہے۔

تو کیا آج جبل قاسیون پر بڑی ہماہمی رہی ہوگی؟

جی ہاں بہت سے لوگ آج کے دن جبل قاسیون پر طوفانِ نوح کی سالگرہ مناتے ہیں۔ جودی داغ اسی علاقے میں واقع ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہاں کشتیِ نوح سیلاب کے بعد آٹھہری تھی۔ بعض لوگ جبل ارارات کو کشتیِٔ نوح کے ٹھہرنے کی جگہ بتاتے ہیں۔ ادھر گذشتہ چند سالوں میں ارارات کی سرّیت میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ بعض نظری گروہوں نے ارارات کی چوٹی پر کشتی کی دریافت کا خاصا پروپیگنڈہ کیا ہے، فلمیں بنائی ہیں، سیاحوں کو ایک نئی زیارت گاہ ہاتھ آ گئی ہے۔

تو کیا جبل جودی اور جبل ارارات دو الگ الگ مقامات ہیں؟ میں نے مصطفیٰ اوغلو سے پوچھا۔

ہیں تو الگ الگ، ان دونوں کے بیچ کوئی دو سو میل کی مسافت ہے لیکن ہے چونکہ ایک ہی پہاڑی سلسلہ ہے اس لیے ان دونوں ناموں میں لوگ تطبیق دے لیتے ہیں۔ ویسے کوہ قاسیون خود اپنی جگہ کم پر اسرار اہمیت کا حامل نہیں۔ کہتے ہیں کہ قاسیون کی بلندی پر دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ پرانے زمانے میں حکمراں بارش کی دعاؤں کے لیے قاسیون پر جایا کرتے تھے۔

سنا ہے اصحاب کہف کا غار بھی وہیں کہیں واقع ہے؟

جی ہاں میں وہاں گیا ہوں۔ اب تو اس علاقے میں بھیڑ بھاڑ اور تعمیرات کے سبب اس تاریخی سریت کا احساس نہیں ہوتا۔ البتہ چالیس محرابوں والی مسجد کے آثار دیکھ کر بہت سے مقامی قصے کہانیوں میں جان پڑ جاتی ہے۔ وہیں قریب خونی غار (مغارات الدم) بھی ہے، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں انسانی تاریخ کا پہلا قتل ہوا اور شاید قابیل کے استغفار کے سبب ہی یہاں دعاؤں کے مستجاب ہونے کا جواز لایا جاتا ہے۔

اچھا کبھی آپ نے اس بارے میں بھی غور کیا کہ روحانیوں کی بیشتر خانقاہیں اور مراکز پہاڑوں پر ہی کیوں قائم ہوتی ہیں؟

اس سوال پر مصطفیٰ اوغلو نے پہلو بدلا، سنبھل کر بیٹھ گئے، کہنے لگے پہاڑوں سے پیغمبروں کو ایک خاص انس رہا ہے۔ جودی پر نوحؑ کی کشتی رکی، اصحاب کہف نے پہاڑ کے غار میں پناہ لی، موسیٰؑ جبل طور پر لقائے رب کے شوق میں گئے، محمدؐ پر غارِ حرا میں پہلی وحی آئی، جبل ثور مشکل گھڑی میں آپؐ کا مسکن بنا اور جبل احد کے بارے میں یہ قول مشہور ہے کہ اُحد جبل یحبّنا و نحبہ۔ پہاڑ کی اسی تاریخی سریت کے سبب ہمیشہ سے روحانیوں نے اسے اپنا مسکن بنایا ہے۔ اب اسی اولوداغ کو لیجئے۔ اس سے سرّیت کی ایک طویل تاریخ وابستہ ہے۔ اس کا پرانا نام Misios Olympos ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یونانی دیوی دیوتاؤں نے یہیں سے ٹروجن وار کا مشاہدہ کیا تھا۔ خلافت عثمانی کے زمانے تک یہاں عیسائی راہبوں کی خانقاہیں قائم تھیں اور اسی مناسبت سے اس پہاڑ کا دوسرا نام کشش داغ، یعنی جبل الراہب بھی ہے۔ ۱۹۳۵ء سے پہلے اولوداغ اپنے اسی پرانے نام سے معروف تھا۔

گویا مصطفیٰ کمال کے سیکولرائزیشن سے راہبوں کی پہاڑیاں بھی نہ بچ سکیں؟

جی ہاں ان پہاڑیوں کے بیشتر حصے اب winter resorts کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ جاڑے کے موسم میں تین چار میٹر گہری برف جم جاتی ہے۔ دنیا بھر سے اسکیئنگ کے شائقین کا گویا یہاں میلہ لگ جاتا ہے۔

گوزی لیالی کی بندرگاہ اب قریب آ چکی تھی۔ ساحل کی ہریالی، روشن دھوپ کی خوشگوار تمازت، اٹھکیلیاں کرتے ہوئے ہواؤں کے تھپیڑے اور دور ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کے مناظر دیکھ کر بشاشت اور تازگی کا احساس ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ بُرسا شہر کے عین قلب میں واقع اولو جامع پہنچ گئے۔ مسجد کے صدر دروازے پر ایک صوفی شیخ ہمارے منتظر تھے۔ مسجد میں ان کے عمل دخل کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس مسجد کے امام ہوں لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ امام مسجد کے پیر بھائی ہیں۔ اِزمیر سے آئے ہیں اور یہاں بُرسا میں ان کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ کوئی دس بجے کا وقت ہوگا مسجد تقریباً خالی تھی۔ عین مسجد کے اندر مرکزی ہال میں ایک فوارہ لگا ہوا تھا جس کے پانی گرنے کی آواز سے مسجد کے ساکت ماحول میں ایک فطری نغمگی کا احساس ہوتا تھا۔ ہم لوگ وہیں فوارے کے قریب فرش پر دیوار کے سہارے بیٹھ گئے۔ شیخ سعود کچھ دیر تک ہوجا عثمان کی خیریت پوچھتے رہے ہر تھوڑی دیر بعد میری آمد اور ملاقات کے لئے ممنونیت کا اظہار کرتے۔ فرمایا کہ سترہ سال سے شیخ عبود کے مرید ہیں، وہی شیخ عبود کوہ قاسیون والے۔ کوئی سات سال ہوئے ہر روز بلاناغہ اکیس ہزار مرتبہ نفی اثبات کا اور سات ہزار مرتبہ اسم ذات کا ورد کرتا ہوں لیکن ایک کسک

ہے جو آپ سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ ہو جا عثمان آپ کے روحانی اور علمی مراتب کے بڑے قائل ہیں۔

شیخ سعود کی یہ باتیں سن کر میں قدرے پریشان ہوا، مبادا یہ سب کچھ میری درویشی کا امتحان نہ ہو۔ میں نے کہا ضرور فرمایئے۔ آپ جیسے اہل اللہ کا یہ اعتماد میرے لیے ایک اعزاز ہے۔ وہ چند لمحے فوارے پر نگاہیں جمائے رہے پھر بولے: دیدارِ رسول ﷺ کے لئے کوئی مجرب وظیفہ بتایئے۔ ویسے تو ہر شخص کا قلب ایک جداگانہ آلہ ہوتا ہے جس کی مناسبت سے اس کے لئے وظائف تجویز کیے جاتے ہیں لیکن آپ نے نسبتاً کم عمری میں سلوک کی اعلیٰ منزلیں طے کیں ہیں اسلئے آپ سے بلا تکلف دل کا درد کہہ بیٹھا۔

میرے لیے یہ ایک مخمصہ تھا۔ ایک طرف درویشوں کے لباس میں اولوداغ کے عازم سفر کی حیثیت سے شیخ سعود کی مدد میرا روحانی فریضہ بنتا تھا۔ دوسری طرف میں کسی مداہنت سے کام لینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے چند ثانیے خاموشی اختیار کی۔ پھر عرض کیا فکر نہ کیجئے میں آپ کو ایک وظیفہ بتاؤں گا، وظیفہ کیا دعا کہہ لیجئے۔ میرے پاس ایک دعائے کشف ہے، ایک ایسی دعا جو رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک پر بھی جاری رہتی تھی۔ آپ کثرت سے یہ دعا مانگا کریں ان شاء اللہ حقیقت آپ پر منکشف ہو جائے گی۔ میں نے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا اور اس پر یہ دعا لکھ دی: اللّٰھم أرنی الأشیاء کماھي۔

کتنی مرتبہ اس دعا کو روز پڑھنا ہوگا؟ شیخ نے پوچھا۔

تعداد کی شرط نہیں، صرف حضوریٔ قلب چاہئے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہر قلب اپنے حساب سے اور ہر حضوری اپنی کیفیت کے تناسب میں نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ ان شاء اللہ آپ نامراد نہیں ہوں گے۔

شیخ کے چہرے پر بشاشت کے آثار طلوع ہوئے۔ انہوں نے اپنے تھیلے سے سیاہ کپڑے میں لپٹا ہوا کانسے کا ایک چھوٹا سا وفق نکالا اور اسے بڑی احتیاط سے ایک نیلی ڈوری کے سہارے میری گردن میں حمائل کر دیا۔ پھر فرمایا: نظر بو جک۔

میں نے وفق کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ تلے اوپر دو چوکور خانے بنے تھے۔ بیچ میں ذوالفقار کی تصویر تھی اور اس کے چاروں کونوں پر گول دائروں میں تلے اوپر مختلف ہندسے لکھے تھے۔ تلوار کے اوپر بسم اللہ الرحمن الرحیم اور نیچے نصر من اللہ وفتح قریب کندہ تھا۔ چوخانے کی اندرونی دیوار پر نادِ علی یا مظہر العجائب لکھی تھی اور بیرونی حصے پر سورہ فاتحہ مرقوم تھی۔ جا بجا ہفت پہل اور ہشت پہل تارے بنے تھے اور ایک جگہ آ را ھم لکھ کر آسمان کی جانب ایک سیڑھی بنا دی گئی تھی۔ وفق کی پیشانی پر لال رنگ سے ۱۳۲ لکھا تھا۔ پہلے

پہل تو میں یہ سمجھا کہ شاید یہ شیخ کی ذاتی عنایت ہے پھر جلد ہی عقدہ کھلا کہ شیخ کی اس عنایت کے پیچھے دراصل ہوجا عثمان کی ایماء کارفرما ہے۔

باتوں باتوں میں گیارہ بج گئے۔ وقت کی تنگی تھی۔ ابھی ہمیں اولوداغ کے لیے ٹیلی فیرک (cable car) لینا تھی لیکن شیخ سعود کا اصرار تھا کہ روانگی سے پہلے اسکندر کباب کا لطف ضرور لیں۔ اسکندر کباب بُرسا کی خاص ڈش ہے جو ذائقے میں شاورما کی طرح البتہ شکل میں مختلف ہوتی ہے۔ جیسے تیسے شیخ کی ضیافت سے فارغ ہوئے۔ ٹیلی فیرک اسٹیشن پہونچے، جہاں مسافروں کا ہجوم تھا۔ اگلی کیبل ٹرین کا ٹکٹ حاصل کیا اور دور دور تک پھیلے ہرے بھرے مناظر کا جائزہ لینے لگا۔ وہیں Yeni Kaplica کا اشتہار آویزاں تھا، جس میں بتایا گیا تھا کہ ۱۵۵۵ء میں بننے والا رومن طرز کا یہ ترکی حمّام تب سے مسلسل اپنی خدمت میں مصروف ہے۔ اشتہار میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ بُرسا کی زیارت Yeni Kaplica کے بغیر ادھوری رہے گی، آیئے تازہ دم ہوکر بلکہ زندگی کی نئی امنگوں اور نئے ارمان کے ساتھ واپس جایئے۔ میں نے مصطفیٰ اوغلو سے کہا سودا برا نہیں ہے اگر پندرہ یورو میں زندگی پھر سے جی اٹھے۔ وہ میرے درویشانہ لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے، آپ کو اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ 'اب آپ ان لوگوں میں ہیں جو اپنی کرامتوں سے مردوں کو زندہ کرتے اور چشم زدن میں طئ الارض کے ذریعہ ہزاروں میل کی مسافت طے کرتے ہیں'

...اور یہاں بُرسا میں کیبل کار کے انتظار میں پھنسے ہیں، میں نے ان کے بیان پر یہ اضافہ کیا۔

ٹیلی فیرک کے ٹھہرے، مطمئن اسٹیشن میں اچانک ہلچل ہوئی۔ ایسا لگا جیسے سارا اسٹیشن جاگ اٹھا ہو۔ ایک طرف کچھ لوگ آنے والی ٹیلی فیرک سے اتر رہے تھے اور کچھ لوگ جانے والی ٹیلی فیرک میں جگہ لے رہے تھے۔ مصطفیٰ اوغلو نے اپنے تجربے کی بناء پر پچھلی نشستوں پر ہماری جگہ محفوظ کی تاکہ دوران سفر مناظر فطرت کا پورا پورا لطف لیا جاسکے۔ خدا کی پناہ بُرسا اور اس کے اطراف میں سبز حسن کی طناب دور دور تک کھنچی تھی۔ جوں جوں اولوداغ کی طرف بڑھتے گئے خدا کی عظمت و جبروت اور اس کائنات میں اپنی حقیقتِ واقعی پر سے نقاب اٹھتا گیا۔ کچھ دیر بعد کادیالہ نامی مقام پر ہماری کیبل کار جا ٹھہری۔ اب اگلی منزل ساریالان کی تھی جہاں سے ہمیں بذریعہ ٹیکسی کارواں سرائے اولوداغ سینٹر جانا تھا۔ دو بجے تک ہم لوگ کارواں سرائے پہنچ گئے۔ ابھی ہمارے پاس دو تین گھنٹے تھے۔ سوچا جب تک ہوٹل میں ہی آرام کیا جائے۔

۲۷

قطب الاقطاب کی مجلس میں

پانچ بجے کے قریب ایک ترک لڑکی ہوٹل آ گئی۔ لباس اور انداز و اطوار سے بظاہر وہ ہوٹل کا عملہ لگ رہی تھی لیکن آئی باہر سے تھی اور استقبالیہ پر میرے بارے میں پوچھتی تھی۔ مصطفیٰ اوغلو جو میرے ساتھ تھے، انہوں نے اشارہ کیا کہ شاید تمہاری روانگی کا وقت آ پہنچا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لڑکی میری طرف لپکی، اور ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ بولی: نظر بو جک۔ میں نے بھی جواباً کہا: نظر بو جک۔ اس کے شانے پر بھی نظر بو جک کی ایک ویسی ہی نیلی علامت آویزاں تھی جیسی میں نے گلے میں حمائل کر رکھی تھی۔ اس نے میرے سراپے پر ایک نظر ڈالی۔ پھر مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ کبھی درختوں کے بیچ، کبھی واک وے اور کبھی پگڈنڈیوں پر کچھ دور تک میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ موسم خوشگوار تھا۔ جا بجا سیاحوں کے غول نظر آ جاتے تھے۔ وہ بہت تیز چل رہی تھی۔ اس کی چال میں ہرنی کے تیور تھے اور میں ٹھہرا معصوم درویش۔ اولوداغ کے خدا شناس منظر نامے میں مغربی لباس میں ملبوس ایک ترک لڑکی کے پیچھے درویش کی بھاگ دوڑ کا بھلا کیا جوڑ تھا۔ لیکن نظر بو جک سے نظر بو جک مل چکی تھی، قسمت نے یاوری کی تھی۔ قطب الاقطاب کے جلسے میں درویش کی حاضری کو اب چند قدم رہ گئے تھے۔ اس نے میری حیرانی دیکھ کر مجھے تسلی دی۔ کچھ دور اوپر جا کر پگڈنڈی نیچے کی طرف اترنے لگی۔ اب جو پیچھے مڑ کر دیکھا تو اولوداغ کا سارا میدانی علاقہ نگاہوں سے اوجھل تھا۔

نیچے ایک بہت بڑے خیمے کا دروازہ نظر آ رہا تھا جس پر وہی نظر بو جک کی علامت آویزاں تھی۔ نیچے اترنے کا راستہ خاصا تنگ تھا اور غالباً تنگ ترین مقام پر ایک سیکوریٹی گیٹ کچھ اس طرح نصب کیا گیا تھا کہ

اس سے گزرے بغیر آگے بڑھنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ دروازہ بند تھا۔ اس لڑکی نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر نظر بوجک کے پیچھے لگے الکٹرونک چپ کی بات یاد آئی۔ قریب گیا پِک کی آواز کے ساتھ دروازے میں سبز روشنی جلی اور دروازہ کھل گیا۔ اندر استقبالیہ کا ایک بڑا اسٹال لگا تھا جہاں اسی قسم کی ترک لڑکیاں نظر بوجک کی علامتیں لگائے انتظام وانصرام میں مصروف تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی ایک لڑکی میری طرف لپکی، وفق کے نیچے بٹن کو دبا کر اسے نکال لیا، ڈوری میرے گلے میں لٹکی رہ گئی۔ کاغذات کا ایک پلندہ اس کے ساتھ تھا۔ سیریل نمبر ۱۳۲ کے خانے میں وفق کا ویسا ہی نقشہ مطبوعہ تھا۔ اس نے میرا وفق لے کر ایک بڑی ٹوکری میں ڈال دیا، کاغذ پر حاضری کی علامت بنادی اور مجھے خیمے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ مختلف کاؤنٹر پر مجھ جیسے کچھ اور بھی درویش نظر آئے، لیکن اس سے پہلے کہ کسی سے دعا سلام کی گنجائش پیدا ہوتی انتہائی سبک رفتاری کے ساتھ میری میزبان نے مجھے خیمے کے دروازے تک پہنچادیا۔ یہاں بھی اسی قسم کے سیکوریٹی گیٹ سے سابقہ تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ نظر بوجک کی علامت کے سہارے یہ دروازہ بھی کھل جائے گا سو اس مرتبہ بے دھڑک داخل ہوا۔ دروازہ کھلتے ہی دوسری طرف ایک میزبان خاتون نے مسکراتے ہوئے نظر بوجک کہا اور کمالِ سرعت کے ساتھ نظر بوجک کے پیچھے ہک کو دبا کر اسے نکال لیا۔ ڈوری پھر میرے گلے میں لٹکی رہ گئی۔ پھر شاید پہلے سے طے شدہ اسکیم کے مطابق مجھے ایک نشست پر بٹھا کر رخصت ہوگئی۔

اب جو میں نے خیمے کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ اس کی ہیئت ایک طرح کے اوپن ایئر تھیٹر کی ہے۔ پہاڑی کے نشیب وفراز نے کچھ اس طرح کی صورت حال پیدا کر رکھی تھی کہ تھیٹر کے انداز سے ناظرین کی کرسیاں ایستادہ تھیں۔ نیچے خالی پلیٹ فارم تھا جس کے بالمقابل قدرے بلند پہاڑی پر ایک اسٹیج بنایا گیا تھا۔ اسٹیج کے پیچھے ایک بہت بڑی سفید اسکرین لگائی گئی تھی اور اسٹیج کے دونوں طرف تقریباً آدھے حصے تک اسی طرح کی اسکرین سے اسے گھیر دیا گیا تھا۔ دونوں جانب اسکرین کے باہر اولمپک انداز کی بڑی بڑی دیوہیکل مشعلیں جل رہی تھیں جس سے غالباً بیک وقت روشنی اور گرمی دونوں کا کام لیا جارہا تھا۔ کھلے آڈیٹوریم میں جابجا مختلف کناروں پر چھوٹی چھوٹی مشعلیں آویزاں تھیں۔ گویا ماحول نیم روشن تھا۔ اسٹیج کے قریب بڑی مشعلوں سے روشنی کے جاہ وجلال کا سماں تھا اور اس پس منظر میں اسٹیج پر بیٹھے لوگ ایک طرح کی سریت اور نور کے ہالے میں گھرے نظر آتے تھے۔ اندازہ ہوا کہ کاروائی اب شروع ہوا چاہتی ہے کہ مجلس حاضرین سے تلے اوپر پر تھی۔ اچانک بانسری کی ایک لَے کے ساتھ اسٹیج پر لگے وسیع اسکرین پر مختلف رنگوں کے گول دائرے طلوع

ہونے لگے۔ دائرے گھٹتے، بڑھتے اور پھیلتے سکڑتے رہے۔ پھر بجلی کی کڑک کے ساتھ تیز روشنی کا منظر دکھایا گیا پھر تاریکی چھا گئی اور تب ہی اسٹیج پر بیٹھے ایک شخص نے اللہ ہو کا نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ کلمۂ ہو کا بلند ہونا تھا کہ چہار جانب سے ہو ہو کی صدا بلند ہونے لگی۔ اسی دوران موسیقی کے آلات بھی ہو کی اس ترنگ (symphony) میں شامل ہو گئے۔ کچھ دیر میں یہ نغمہ اللّٰھم صل علیٰ میں بدل گیا پھر آیتِ قرآنی ألا إن اولیاء اللّٰہ لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون کی تلاوت ہوئی، کوئی آٹھ دس منٹ تک مختلف آیتیں اس تلاوت میں جڑتی رہیں۔ اختتام آیت نور پر ہوا، جس کے بعد کچھ دیر تک فضا یا نُور یا نُور کے نعروں سے معمور رہی۔ پھر ختمِ خواجگان کے سے انداز میں طروقِ تصوف کے ستر سلسلوں پر صلوٰۃ و سلام کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس عمل میں کوئی آدھ گھنٹہ صرف ہو گیا۔

پروگرام چونکہ میرے بیٹھتے ہی شروع ہو گیا تھا اور اس کے بعد کبھی موسیقی کی ترنگ اور کبھی یا نُور کے نعروں نے پوری طرح مشغول کر لیا تھا اس لیے ابتداً ماحول کا بھرپور جائزہ نہ لے سکا تھا۔ اب جو یہ سلسلہ تھما تو میں نے اپنے قرب و جوار کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اب تک آنکھیں نیم تاریک ماحول کی عادی ہو چکی تھیں لیکن پھر بھی اسٹیج پر بیٹھی شخصیات کے چہرے بشرے کچھ تو دوری کے سبب اور کچھ مخالف سمت سے مشعل کی روشنی اور اسٹیج کے آدھے حصے پر نیم تاریکی کے سبب، واضح طور پر دکھائی نہ دیتے تھے۔ ہاں اتنا پتہ چل رہا تھا کہ پہلی صف میں کل سات کرسیاں ایستادہ ہیں جن پر مختلف صوفیانہ لباس میں غالبًا سات اقالیم کے قطب بیٹھے ہیں۔ البتہ ایک شخص جس کی نشست قطب الاقطاب کے بائیں جانب تھی مغربی طرز کے سوٹ میں داڑھی مونچھ سے مبرّا تھا۔ قطب الاقطاب کی مرکزی کرسی دوسری کرسیوں سے قدرے نمایاں تھی۔ ان کے سر پر پگڑی کے بجائے اونچی دیوار کی ٹوپی تھی جس پر دور سے مختلف قیمتی پتھروں کے ٹکے ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ ان کے عصا کے دستہ سے اس وقت روشنی سی پھوٹتی جب وہ اسے خاص زاویے پر گھماتے۔ اسے دیکھ کر بزرگوں کی وہ کرامتیں یاد آئیں کہ کس طرح وہ اپنے عصا سے اندھیرے میں روشنی کا کام لیا کرتے تھے۔

جلسہ کی نظامت خود قطب الاقطاب کے ہاتھوں میں تھی۔ اب کلیدی خطبہ کی باری تھی۔ مغربی سوٹ میں ملبوس وہی قطب، جو اب تک قطب الاقطاب کے پہلو میں بیٹھا تھا، اپنی جگہ سے اٹھا، ڈائس پر آیا۔ ایک ہاتھ سے چشمے کو درست کیا اور دوسرے ہاتھ سے خطبے کی کاپی اپنے سامنے رکھی۔ پھر حاضرین پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولا: یا علیؓ مدد۔ اس کے جواب میں مختلف قسم کی آوازیں آئیں۔ بعض گوشوں سے نعرۂ حیدری بلند ہوا اور

اگلی صفوں سے کچھ لوگ اچھل اچھل کر علی دے دم دم اندر کا دھمال ڈالنے لگے۔ کچھ دیر تک افراتفری کا ماحول رہا۔ جب شور تھما تو فاضل مقرر نے اپنے خطبے کی باقاعدہ ابتدا کی۔ فرمایا:

بزرگو اور دوستو! یہ مولا علیؑ کا کرم ہے کہ چالیس برس کے بعد ہم اپنے سالانہ اجتماع کے لیے ایک بار پھر لستم پوخ کی سرزمین پر جمع ہوئے ہیں۔ لستم پوخ سے ہمیں پیار ہے اور لستم پوخ ہم سے پیار کرتا ہے۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ چالیس سال پہلے بھی لستم پوخ میں کلیدی خطبہ کا قرعہ میرے ہی نام نکلا تھا۔ تب میں نوجوان تھا اور میری بہت سی تجاویز کو اس وقت کے بزرگوں نے حیرت اور تشویش کے ساتھ دیکھا تھا۔ میں شکرگزار ہوں ان بزرگوں کا کہ انہوں نے اپنے تحفظات کے باوجود ہماری بعض تجاویز کو قبول کیا۔ تب میں نے بڑی شد و مد کے ساتھ یہ بات رکھی تھی کہ مشائخیت کے مستقبل کے لیے ضروری ہے کہ اسے خدمت خلق کے کاموں سے جوڑا جائے۔ آج میں پھر اس بات کو دہرانا چاہتا ہوں کہ وہ دن گئے جب صاحب قبر کے فیض کے بھروسے خلقت ہمارے پیچھے چلا کرتی تھی۔ اب اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو فیض کو ایک زندہ اور محسوس شکل دینی ہوگی۔ تعلیمی اور فلاحی اداروں کا جال بچھانا ہوگا، شفاخانے قائم کرنے ہوں گے۔ آرٹ، شاعری اور موسیقی کی خدمت اور اسلامی تہذیب کے فروغ کے پردے میں آلِ بیت اطہار کی فضیلت کا غلغلہ بلند کرنا ہوگا۔ ہمیں خوشی ہے کہ صوفی تحریک نے نئے دور کے نئے تقاضوں کو سمجھا ہے اور بہت سے سجادہ نشینوں نے اپنی آمدنی کا ایک معقول حصہ فلاحی کاموں پر خرچ کرنے کی اسکیم بنائی ہے۔ بعض ممالک میں مشائخ کانفرنسوں کے ذریعہ بھی یہ پیغام عام ہوا ہے کہ ہر درگاہ اور مزار سے ملحق کوئی مدرسہ یا تعلیمی ادارہ ضرور قائم کیا جائے تاکہ اہل صفا کے دامن پر نذرانوں اور فتوح کی وصولیابی کا داغ کچھ ہلکا ہو سکے۔

یاد رکھئیے! دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ اب صرف جبّہ و دستار کے مظاہر سے یا خود کو آل بیت قرار دے کر ہم بہت دنوں تک اپنا بھرم قائم نہیں رکھ سکتے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں نسل پرستی کو عیب سمجھا جاتا ہو ہم خود کو سادات بتا کر لوگوں کو اپنی اتباع کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔ ہاں! خدمت خلق کے سہارے ہم ان کے اندر پلنے والی بغاوت کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔

لستم پوخ کے اس اجلاس میں آپ حضرات کے لیے میں ایک خوشخبری لایا ہوں۔ آنے والے دنوں میں اہل صفا کے سماجی اور سیاسی قد کاٹھ کو بلند کرنے کے لیے آلِ بیت کی بعض حکومتوں کے تعاون سے ہم نے مغرب کی بعض دانشگاہوں میں ایسی فہرستوں کے اجراء کا انتظام کیا ہے جو دنیا کی مؤثر شخصیات میں ہماری

شمولیت کا خاص طور پر اہتمام کریں گی۔ دنیا میں اس وقت صرف دو حکمراں سلسلۂ آلِ بیت سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں، ہمیں اس سلسلے کو وسعت دینے کی کوشش جاری رکھنی ہے۔ بعض حکمرانوں سے ہمارے مشائخ کی راہ ورسم بڑھی ہے اور بعض جگہوں پر بڑی کامیابی کے امکانات ہیں۔ میں چاہوں گا کہ آئندہ اطلاقی پروگراموں میں اسے ترجیحی بنیادوں پر شامل کیا جائے۔

یاد رکھیئے! مغرب ہمارے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ نہ صرف اس لیے کہ اس کے اثرات فی زمانہ ساری دنیا پر مرتب ہوتے ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ مغرب میں غیر عقلی رویّے (unreason) کا جو عمومی ماحول پایا جاتا ہے اس میں تصوف، قبالہ، tarrot card اور اس قسم کی دوسری چیزوں کے لیے خاصی گنجائش ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ گزشتہ چالیس سالوں میں مغرب کے اس سازگار ماحول سے ہم نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے لیکن اب بھی کرنے کو بہت کچھ باقی ہے۔ میں ابتدا ہی سے اس بات کا قائل رہا ہوں کہ جدید مغربی تعلیم ہمارے مقاصد سے مغائر نہیں ہے بلکہ یہ تعلیم جو روحانی خلا پیدا کرتی ہے اس میں ہمارے لیے کام کا بڑا امکان ہے۔ شرط یہ ہے کہ ہم اس امکان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں۔

آنے والے دنوں میں مشرق میں اتھل پتھل کے اندیشے ہیں۔ ہمیں جاننا چاہیئے کہ جمہوریت اور حریت فکری کے نعرے ہمارے مقاصد سے مغائر ہیں۔ ہمیں زیر زمین پنپتی ان تحریکوں کا سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہیئے۔ توقع ہے کہ اطلاقی اجلاس میں ان امور پر کھل کر گفتگو ہوگی۔ ایک اور بات جس کی طرف میں آپ حضرات کی توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ تصوف کے نئے تنظیمی ڈھانچے سے متعلق ہے۔ بعض صوفی سلسلوں نے بیسوی صدی کی ابتداء میں مغربی انداز کے تنظیمی فرنٹ قائم کیے، اس سے ہمارے ماننے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا، دین کی صوفیانہ تعبیر عامۃ الناس کی رگ وپے میں سرایت کر گئی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دین کے ان حاملین پر یہ بات پوری طرح واضح نہیں کہ ان کی اصل حیثیت صوفی تحریک کے توسیعہ کی ہے۔ اندیشہ ہے کہ کل کوئی طالع آزما یا کوئی تحریک اصلاح ناواقفوں کی اس بھیڑ کو بالکل ہی مختلف کام پر لگادے۔ اس بارے میں بھی ٹھوس منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

اور ہاں آخر میں ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلانا اپنا فریضۂ منصبی جانتا ہوں گو کہ آپ میں سے بعض صاحبان کو میری ان معروضات سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ ادھر گذشتہ چند سالوں میں ہمارے بعض حلقوں نے مہدی کی آمد کا کچھ زیادہ ہی شور کر رکھا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ بعض لوگ دن اور سال کے تعین کے ساتھ

مہدی کی آمد کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال ایک عمومی بددلی کا موجب ہوسکتی ہے۔ میں ایک بار پھر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ دن گئے جب آپ صرف اساطیر اور جبہ و دستار کے سہارے آلِ بیت کا نام لے کر جمہور عوام کے دلوں کو اپنی مٹھی میں رکھا کرتے تھے۔ اب اس پرانی اسٹریٹجی پر اصرار تباہ کن ہوسکتا ہے۔ اگر صوفی تحریک کو زندہ رہنا ہے اور آل بیت کے نام لیواؤں کو اپنی گرفت بنائے رکھنی ہے تو ہمیں نئے دور کے نئے تقاضوں کو سمجھنا ہوگا۔

قطب نورانی آقا اسمٰعیل کا کلیدی خطبہ یا علی مدد کے کلمات پر ختم ہوا لیکن اس دفعہ حاضرین کی جانب سے پہلی سی گرمجوشی نہ تھی۔ نہ تو نعرہ ہائے حیدری بلند ہوئے اور نہ ہی کسی نے دھمال ڈالنے کی ضرورت محسوس کی البتہ خطبہ کے دوران گاہے بگاہے حاضرین کی صفوں سے اللہ اللہ کی صدا سنائی دیتی رہی جو دراصل کسی تائید کے بجائے اظہارِ اختلاف کا ایک شائستہ طریقہ سمجھا جاتا تھا۔

تیسری تقریر قطب آخر زمانی آیت اللہ مجتہدی کی تھی۔ انھوں نے بہت واضح الفاظ میں متصوفانہ لباس کے سلسلے میں آقا اسمٰعیل کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا۔ فرمایا لباس کے بارے میں ہمیں کسی احساس کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہماری روحانیت کے سارے کرشمے جبہ و دستار کے سہارے ہی قائم ہیں۔ یہ ہمارے اسلاف کی سنت ہے۔ اسے ترک کرنا اصحاب باطن کے مسلک سے انحراف ہی نہیں بلکہ غداری بھی ہوگی۔ انھوں نے مزید فرمایا: میں فاضل مقرر کو مشورہ دوں گا کہ وہ اہل باطن کے لباس میں ایک بار اپنی نورانی شخصیت کو ملاحظہ فرمائیں اور اپنے اسلاف کی طرح ریش مبارک کو اختیار کریں تو آئینہ میں ہی نہیں بلکہ آئینہ سے باہر بھی انھیں محسوس ہوگا کہ تقدس کا ایک نورانی ہالہ ان کے گرد قائم ہوگیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم اہل باطن ہیں اور ظاہر کی پاسداری ہمارا شعار نہیں لیکن جمہور عوام کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے روحانی لباس اور انداز و اطوار کی پاسداری ضروری ہے۔ ہماری ہزار سالہ تاریخ میں لباس نے ایک اہم رول انجام دیا ہے اور آج بھی ہمارے جاہ چشم میں لباس کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔

قطب آخر زمانی کی اس بات کی اہل مجلس نے پرزور تائید کی۔ کچھ دیر تک فضا یا علیؑ یا علیؑ کے نعروں سے گونجتی رہی۔ شور تھما تو قطب آخر زمانی نے فرمایا:

معزز سامعین! ہمیں اس نکتہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ عرفان اور تصوف کے بغیر یہ ایک خشک دین تھا۔ ہم نے عرفان کا عنصر ڈال کر اس دین کو جاذب نظر بنایا۔ عامۃ الناس میں اس کی مقبولیت کا سامان پیدا ہوا

اور ہمارے اس نفوذ کو ہمارے آسمانی لباس نے ممکن کر دکھایا۔ کچھ یہی حال مہدی اسطورہ کا بھی ہے جس نے صدیوں سے ڈوبتے دلوں کی مسیحائی کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اب اس انتظارِ مسلسل سے اور ماضی میں کچے پکے مہدیوں کے ظہور کے سبب اس غبارے سے ہوا نکلتی جا رہی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ماضی کے مقابلے میں آج مہدی کی آمد پر یقین کرنے والے اور اس کے انتظار میں آہیں بھرنے والے کہیں زیادہ ہیں۔ ہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اب اس اسطورہ کو آگے کس طرح طول دیا جائے۔ ایک نئے اجتہاد کی ضرورت کا میں انکاری نہیں لیکن مہدی کے اسطورہ کو یکسر مسترد کرنا ہماری نظری تاریخ سے بغاوت ہوگی۔ یاد رکھیے! اگر ایک چیز بھی شبہ کے دائرے میں آ گئی تو پھر مجاہدہ، مکاشفہ، توصل، طے الارض، طریقت، حقیقت گویا ہر چیز پر سوالیہ نشان لگ جائے گا اس لیے اس بارے میں کسی بڑی اسٹریٹیجک تبدیلی سے پہلے بہت کچھ غور و فکر کرنے کی ضرورت ہوگی۔ امید ہے کہ اطلاقی اجلاس میں ہم ان امور پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ ہمارے بزرگوں کی ارواح مقدسہ ہمارے ساتھ ہیں، بلکہ مستقل ہم پر نگاہیں رکھے ہوئی ہیں۔ امید ہے ہم ان کی پاسداری کا ہر ممکن خیال رکھیں گے۔

چوتھی تقریر قطب روحانی سلطان الاولیاء شیخ ہاشم کی تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ ان کی تقریر ترکی زبان میں تھی اور میری ترکی زبان سے واقفیت واجبی سی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ غالباً اپنی کبرسنی کے سبب الفاظ کی مکمل ادائیگی اور جملوں کی ترتیب و تنظیم پر پوری طرح قادر نہ تھے۔ دو تین جملے بولتے، پھر کچھ توقف فرماتے، پھر کچھ اس انداز سے گویا ہوتے جیسے یہ باتیں ان پر نازل ہو رہی ہوں۔ تقریر کے دوران ہی کئی بار اہل بیت کے تذکرے پر ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ انھوں نے کئی بار مہدی منتظر کا تذکرہ کیا اور ہر تذکرے پر جانبِ آسماں کچھ اس امید بھری نگاہوں سے دیکھا گویا اب نزولِ مہدی کی ساعت قریب ہو۔ ان کی گفتگو میں ترک وزیراعظم کے حوالے بھی آئے اور ایک بات جس پر مجھے سخت حیرت ہوئی وہ یہ تھی کہ علی گڑھ اور جماعتِ تبلیغ کا لفظ بھی کئی بار ان کی زبان پر آیا۔ آدھ گھنٹہ کی طویل تقریر کے دوران میں صرف دو ہی باتیں سمجھ سکا۔ اولاً ایک ایسے عہد میں جب حکومت پر در پردہ نقشبندیوں کو کنٹرول حاصل ہوتا جا رہا ہے ظہور مہدی کا غلغلہ کرنا انتہائی نامناسب بلکہ خلاف حکمت ہے۔ سلطان الاولیا نے اس بات کی وضاحت کی کہ مہدی اسطورہ پر یقین ایک چیز ہے اور نامناسب وقت پر اس کا غلغلہ بلند کرنا بالکل ہی دوسری چیز۔ انھوں نے اس بارے میں پالیسی ریویو کی ضرورت پر زور دیا۔ دوسری بات جو میرے لیے خصوصی دلچسپی اور حیرت کا باعث تھی وہ بار بار علی گڑھ کا حوالہ

تھا۔ پوری بات تو سمجھ میں نہ آئی، ہاں اتنا اندازہ ہوا کہ روحانیوں کی داخلی سیاست کے سبب علی گڑھ کے کوئی صاحب جو قطب کے منصب پر فائز تھے انھیں نئے تنظیمی ہیکل میں نمائندگی سے محروم ہونا پڑا ہے۔ سلطان الاولیاء کو اس بات کا بڑا قلق تھا۔ وہ اسے نقشبندی طریقہ کی حق تلفی پر محمول کر رہے تھے اور اس بارے میں سراپا احتجاج تھے۔ ایک تو زبان کا حجاب دوسرے علی گڑھ کے حوالے سے پیدا ہونے والا تجسس میں نے سوچا کیوں نہ کسی سے پوچھوں کہ اس قصہ کا پس منظر کیا ہے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ ہم کیبن نما بالکونی میں بٹھائے گئے تھے اور اس لیے ہم جلیس شرکاء سے بھی تبادلۂ خیال کا کوئی موقع نہ تھا۔ چند برسوں پہلے وینس کے ایک تاریخی تھیٹر میں جب مجھے اسی قسم کے ایک کیبن میں بیٹھنے کا موقع ملا تھا تو اس وقت واقعی خصوصی شرف و اعزاز کی بات معلوم ہوئی تھی۔ آج کیبن کا یہ انتظام مجھے ایک طرح کی قید تنہائی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ تو کہیے کہ اگلی تقریر پنجابی زدہ اردو میں تھی اور مقرر نے سلطان الاولیاء سے اس بارے میں اپنے اختلاف کا کھل کر اظہار کیا تھا۔ سو جو باتیں مجھے ترکی زبان کے سبب کم کم سمجھ میں آئی تھیں وہ علامہ بحرالعلوم کی اردو تقریر کے سبب بڑی حد تک واضح ہو گئیں۔

سفید اونچی دیوار کی ٹوپی اور شانوں پر سبز دوشالہ علامہ بحرالعلوم کے لحیم شحیم جثّے پر خوب جچ رہی تھی۔ دوسرے مقررین کی طرح ہاتھ میں کوئی نازک چھڑی لینے کے بجائے انھوں نے پورے چھ فٹ کا عصا سنبھال رکھا تھا۔ اب جو انھوں نے یا علیؑ کے نعرے کے ساتھ اپنا عصا ہوا میں بلند کیا تو ایسا لگا جیسے وہ اسٹیج پر نہیں بلکہ میدان جنگ میں دشمنوں کے خلاف نبرد آزما ہوں۔ ابتداً تو انھوں نے مشائخ کانفرنس کے حوالے سے اپنی خدمات جلیلہ کا تذکرہ کیا۔ پھر اس بات پر اپنی ناراضگی ظاہر کی کہ نقشبندی شیوخ حلقہ قادری کے مریدوں کو اپنی بیعت سے کیوں نواز رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے حلقۂ اثر میں دخل اندازی کے سبب ایک طرح کی تجارتی مسابقت نے جنم لیا ہے اس کا سختی سے نوٹس لینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اس مسابقت کا سبب نسبتوں کے اس تصّور کو بتایا جس کے مطابق اہل صفا نے ایک شخص کو بیک وقت کئی سلسلوں میں بیعت کی اجازت دے رکھی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر لوگ اپنے اپنے حلقہ میں کام کریں ایک دوسرے کے حلقے میں سیندھ نہ ڈالیں تو اس سے اہل صفا کے سماجی وقار میں اضافہ ہوگا۔ رہی یہ بات کہ علی گڑھ کے جن صاحب کی معزولی کا سلطان الاولیاء کو اس قدر قلق ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ ان کی تقرری ہی سراسر غلط تھی۔ ہیکل تنظیمی میں کسی ایسی جماعت یا تنظیم کی نمائندگی کا کوئی حق نہیں بنتا جہاں عوام کی سطح پر بیعت کا التزام نہیں کیا جاتا ہو۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم

انھیں سلسلہ نقشبندیہ کا پروردہ تو ضرور سمجھتے ہیں، ان کے ہاں خواص کی گردنیں بیعت کے نظام سے مربوط بھی ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے دین نقشبندی کو قبولیت عامہ بخشنے، بزرگوں کے کشف و کرامات کے قصے عام کرنے، کشف قبور، زیارت رسولؐ، مشاہدۂ حق، طئے الارض اور ثواب کے ارسال و ترسیل جیسے مسئلے کو جمہور عوام میں متعارف کرانے میں کلیدی رول انجام دیا ہے۔ ہم ان کی خدمات جلیلہ کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ کسی بڑے سے بڑے عرس کے مقابلہ میں ان کے سالانہ اجتماع میں عوام کا اژدہام کہیں زیادہ ہوتا ہے بلکہ اب تو اس اژدہام کا مقابلہ منیٰ میں جمع ہونے والے حاجیوں کی تعداد سے کیا جانے لگا ہے۔ لیکن جب تک جمہور عوام باقاعدہ بیعت کے سلسلے سے وابستہ نہیں ہوتے ہم انھیں اپنی ہیئت تنظیمی کا حصہ سمجھنے سے قاصر ہیں اور اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ کم از کم قطب کی کرسی پر ان حضرات کا حق نہیں بنتا۔

حاضرین کی اگلی صفوں میں یقیناً متبادل ترجموں کا انتظام تھا کہ شارکین کی صفوں میں بہت سے لوگوں نے ہیڈفون لگا رکھے تھے لہٰذا جب علامہ بحر العلوم کی پنجابی زدہ اردو میں یہ تقریر ختم ہوئی تو اس پر مجلس میں ملا جلا ردعمل سامنے آیا۔ کسی جانب سے احسنتَ احسنتَ کی صدا بلند ہوئی، کسی نے یاعلی کا نعرہ لگایا اور ایک گوشہ سے خطا خطا کی آواز سنائی دی۔

اگلے مقرر قطب مکانی سلطان المشائخ سالک العلوی بلد الامین سے تشریف لائے تھے۔ ان کی گفتگو کا بیشتر حصہ وہابیوں کے خلاف گلہ وشکوہ کی نذر رہا۔ نجدی فتنے کے خلاف ان کی زبان زہر اگلتی رہی۔ البتہ ایک بات جو مجھے قابل ذکر معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ انھیں اہل صفا کے حلقے میں عورتوں کے داخلے پر سخت اعتراض تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ مولوی رقص میں عورتوں کا داخلہ ہماری روایت سے مغائر ہے۔ ہمارے ہاں اگر انحراف بھی ہوا ہے تو امرد پرستی کی سطح پر۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر اسی حوالے سے انجام پاتا رہا ہے۔ عورتوں کا رقص وسماع کی محفلوں میں داخلہ دراصل ان لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہے جن کی نگاہوں کو تہذیب مغرب کی مصنوعی چمک نے خیرہ کر رکھا ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ مراقش سے لے کر ملیشیا تک ہمیں اس وقت ایک بڑا چیلنج وہابی مغنیوں کی طرف سے درپیش ہے۔ ابوشعر کا نغمہ:

جل الذي سواك　　　يامصطفي محلاك

أنت حبيب الروح　　روحي العزيزه فداك

جواب تک حاضرین کو بے تابانہ رلاتا، زیارت رسول کا شوق بیدار کرتا اور جس کے زیر اثر رسول اللہ کی ایک

جھلک دیکھنے کو سماع کی مجلسوں میں لوگ تڑپتے، آج اس نغمہ کو وہابی مغنیوں مثلاً عایدہ الایوبی کے مقبول عام نغموں سے خطرہ ہے۔ شعر ونغمہ ہم اہل صفا کا خصوصی میدان رہا ہے۔ عربی، فارسی، پنجابی، اردو اور عالم اسلام کی مختلف زبانوں میں ہم نے حب رسول اور حب آلِ بیت کا غلغلہ شعر ونغمہ کے سہارے ہی بلند کیا ہے۔ قوالی سے قصیدہ اور دف سے بانسری کی لے کے ذریعہ ہم نے جمہور عوام کے دل اپنی مٹھی میں رکھے ہیں۔ لیکن اب بعض وہابی مغنیات شعر ونعت کا متبادل ایڈیشن تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ ان میں سے بعض کو بڑی تیزی سے مقبولیت مل رہی ہے۔ یہ ایک تشویش کی بات ہے اس کا فی الفور نوٹس لیا جانا چاہئے۔ اگر یہ میدان ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا تو نہ میلاد کی مجلسیں باقی رہ پائیں گی، نہ حسینؓ کی محبت میں آنسو بہانے والے رہیں گے اور نہ ہی سماع کی مجلسوں میں حب رسول کے دیوانوں کا جم غفیر نظر آئے گا۔ دوستو! اس سے پہلے کہ قافلہ آگے بڑھ جائے بیدار ہو جاؤ۔ آل بیت کی محبت تمہارے ساتھ ہے، نئے چیلنجوں کے مقابلے کی تیاری کرو۔

اب باری تھی قطب الاقطاب کی۔ سلام وصلوٰۃ کے بعد وہ کچھ اس طرح گویا ہوئے:

عزیزانِ من! آل بیت اور سنت کا خادم آپ سے مخاطب ہے۔

ان کے اس پہلے ہی جملے پر تائید واثبات کا وہ شور بلند ہوا کہ خدا کی پناہ۔ یا غوثاہ، یا غوثاہ، یا قطب الاقطاب کی صداؤں سے دیر تک مجلس گونجتی رہی۔ شور تھا تو انھوں نے باقاعدہ اپنے صدارتی خطبہ کا آغاز کیا۔ فرمایا: لستم پوخ کے اس اجلاس میں آپ حضرات کی شرکت پر میں صمیم قلب سے آپ تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرنا اپنا فریضہ منصبی جانتا ہوں۔ میں اپنے اقطاب واعوان کا بھی شکرگزار ہوں کہ انھوں نے کمال صفائی اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ کلیدی خطبے پر تصویب وتائید اور تنقید وتجزیہ کا اظہار فرمایا۔ ایک بڑی ہیکل تنظیمی میں اختلاف فکر ونظر کا پایا جانا ایک صحت مند علامت ہے۔ اس سے ہمیں مختلف تناظرات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ امید ہے کل کے اطلاقی جلسوں میں آج کی یہ گفتگو مشعل راہ کا کام انجام دے گی۔ دل چھوٹا نہ کیجیے۔ آل بیت کے خادموں کو چیلنجز تو ہر دور میں پیش آئے ہیں۔ سقوط قاہرہ ہو یا سقوط الموت، عباسی بغداد کا زوال ہو یا ملتان کی ولایت کا خاتمہ ہم نے بحران کے ہر لمحہ میں کام کا نیا میدان ڈھونڈ نکالا ہے۔ ذرا غور کیجیے! کیا کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات آتی تھی کہ امویوں کی باجبروت حکومت کا تختہ الٹا جا سکتا ہے۔ ہم نے اس کام کے لیے ایک طرف تو آل عباس کے علم کو ایستادہ کیا اور دوسری طرف شمالی افریقہ سے آل فاطمہ کے چاہنے والوں کو منظم کر کے قاہرہ میں لا بٹھایا۔ عین عباسی سرپرستی میں آل بویہ کے پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا۔ تاریخ اس بات

پر شاہد ہے کہ عباسی، فاطمی اور اموی تینوں متبادل خلافتیں بالآخر ہمارے افکار ونظریات اور عزائم کا توسیعہ بن گئیں۔ اور جب سیاسی نظام کو سنبھالنا ہمارے لیے ممکن نہ رہا تو ہم نے روحانی خلافت کا تار و پود تیار کیے۔ دیکھتے دیکھتے در پردہ ایک ایسی غیر محسوس ہیکل حاکمیت قائم کر دی کہ اس کے اثر سے اب دنیا کا کوئی خطہ اور مشرق ومغرب کی کوئی حکومت پوری طرح آزاد نہیں۔

عزیزان من! قرآن مجید کی دعوت نسل پرستی کے سخت مغائر ہے یہاں تک کہ قرآن مجید رسول اللہ کی اولاد نرینہ کے وجود سے بھی انکاری ہے۔ اس کا موقف ہے کہ محمدؐ تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، لیکن ہماری ہمت کی داد دیجیے کہ ہم نے نہ صرف یہ کہ آل رسولؐ کا فلسفہ گھڑا، ذریت رسولؐ کی فضیلت کا پرشور پروپیگنڈہ کیا بلکہ علیؓ کی فاطمی اولاد کو رسول اللہ کے نسلی جانشین کی حیثیت سے پیش کر دیا۔ ہمارا پروپگینڈہ اتنا پرشور تھا کہ جمہور عوام نے آلِ علیؓ کو آل رسولؐ کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ اب پنجتن تمام مسلمانوں کے مشترکہ عقیدے کا حصہ ہے۔ ہمارے شعراء وادباء نے قرآن کے بالمقابل بہت سے قرآن بنا کر رکھ دیے۔ راحت القلوب سے لے کر حکمتِ اشراق، فصوص الحکم، کشف المحجوب، عوارف المعارف، احیاء العلوم، اور ام الکتاب تک اور سب سے بڑھ کر مثنوی معنوی جسے قرآن بزبان پہلوی کے لقب سے شہرت حاصل ہے، ہم نے ایسی کتابوں اور اوراد و وظائف کے مجموعوں کے انبار لگا دیے جس نے بالآخر دین کے ایک متبادل قالب کا ہیولا تیار کر ڈالا۔

عزیز دوستو! ہم نے خدا کے بالمقابل رسول کو تقدس کے اعلیٰ مقام پر پہنچایا، یہاں تک کہ مسجد کے محرابوں پر اللہ اور محمدؐ کے نام ایک دوسرے کے مقابل کندہ ہونے لگے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم نے اس امت کو درود جیسا تحفہ عطا کیا اور اسے رسول سے استعانت طلبی اور دعاؤں کے مستجاب ہونے کا نسخہ بتایا۔ اس مقصد کے لیے ہمیں رسولؐ کو ان کی قبر میں زندہ کرنا پڑا۔ ہمارے پروپیگنڈے کا کمال دیکھئے کہ آج جمہور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس بات کی قائل ہے کہ نبی اور ولی اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں جن سے ہم روحانیوں کو ایک خاص تعلق خاطر ہے۔ ہم نے رسول اللہؐ کی حیاتِ قبری کے حوالے سے ملاقاتوں اور حدیثوں پر شہادت قائم کی۔ اور اس طرح حدیثِ رسول کی وصولیابی کا سلسلہ جاری رکھا۔ رسول اللہ سے راست فیض کا جاری سلسلہ ہمارا وہ طرۂ امتیاز ہے جس کے آگے علمائے ظاہر کے قیل وقال پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں میں یہ ایک ایسا ہتھیار ہے کہ ہم جب چاہیں اس کی مدد سے ایک نئی شریعت ایجاد کر سکتے ہیں، تعبیر کی ایک نئی دنیا

سجاسکتے ہیں۔

ہم نے خودکواولیاءاللہ کی فہرست میں شامل کیااوراپنے اکابرین کی قبروں کوفیوض وبرکات کے کارخانے قراردے کرانہیں فتوحات ونذرانے کاذریعہ بنادیا۔ دیکھتے دیکھتے قرآن کی انکشافی تحریک قبوں اور قبرستانوں کی تہذیب بن گئی۔ دنیا کی کسی بھی تنظیم کے پاس اتنے بڑے پیمانے پر ایسے کارگرتنظیمی دفاترنہیں ہیں جن پر معاشی طور پربھی خودکفالت بلکہ مرفہ الحالی کا دوردورہ ہو۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ مجموعی آمدنی اور assets کی شکل میں جو کچھ ہم درویشوں کے پاس ہے اس کا مقابلہ دنیا کی امیرترین حکومتیں، نامی گرامی سرمایہ دار اور billionire club کے اراکین بھی نہیں کرسکتے۔

عزیز دوستو! ہماری کارگزاریوں کے اثرات مغرب کی غالب تہذیب نے بھی قبول کیے ہیں۔ گذشتہ چند دہائیوں میں غیرعقلی رویےاورتوہم پرستی کا جو بول بالامغرب میں ہوا ہےاس سے آپ ناواقف نہیں۔ صوفی سینٹرز، قبالہ مراکز، یوگا عاملین اور فال نکالنے والوں کو جوقبولیت عامہ ملا ہےاس میں ہمارے لیےامکانات کی ایک نئی دنیا پیدا ہوئی ہے۔ ہمیں ان امکانات سے حتی المقدور فائدہ اٹھانا ہے۔ آنے والے ایام پر ہنگام اور پرخطر ہوں گےلیکن ہمیں ان ہی خطرات میں اپنے کام کا میدان تلاش کرنا ہے۔ آج کی اس گفتگو میں صرف دو باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں؛ اولاً یہ کہ آنے والے دنوں میں مشرق سے کہیں زیادہ مغرب میں ہماری کامیابی کےامکانات ہیں۔ ایک ایسے لمحۂ تاریخ میں جب معاشی اور سیاسی پنڈت مشرق کےعروج کی پیشن گوئی کررہے ہیں، ہماری توجہ مشرق سے کہیں زیادہ مغرب پر ہونی چاہیے۔ ایسااس لیے کہ ہرزوال پذیرمعاشرے میں نفوذاورکامیابی کےامکانات بدرجہابڑھ جاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگزنہیں کہ ہم مشرق سے پہلوتہی کریں گے۔ مشرق ہماراروایتی قلعہ ہےاسےتوہرحال میں مستحکم رکھنا ہے۔

مغرب کی فتح کے لیے اور خود مشرقیوں میں اپنی گرفت مضبوط تر کرنے کے لیے پچھلے دنوں بین المذاہب ڈائیلاگ کی جواسکیم تشکیل دی گئی تھی اس کے خاطرخواہ نتائج سامنے آرہے ہیں۔ آنے والے دنوں میں ویدانتی، سامی، مانوی، عیسائی اور یہودی رہبانیت کا ملغوبہ روحانیت کا ایک نیا مقبول عام ایڈیشن تشکیل دے سکتا ہے۔ یہ بات آپ سے مخفی نہیں کہ ہم اہل تصوف، روحانیت کا مذہب سے ماوراءتصور رکھتے ہیں جب ہی ہمارے اکابرین کی قبریں مرجع خلائق بنی ہیں۔ ہاں، البتہ یہ نکتہ نگاہوں سےاوجھل نہ ہو کہ ہم بین الادیان مکالمے کے توپرجوش حامی ہیں لیکن خودمسلمانوں کے اندر کسی بین المسلکی مکالمے کی حمایت نہیں کرسکتے کہ

inter-faith ہمارے دائرے کو مزید وسعت دینے کا امکان رکھتا ہے، جبکہ اس کے برعکس کوئی intra-faith مکالمہ ہمارے لئے سمِ قاتل ہے۔ ایسی کوئی کوشش ہمیں ہمارے اندرون سے منہدم کردے گی۔

جلسے میں بعض احباب نے تبلیغی نقشبندی سلسلہ پر اعتراض وارد کیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بیعت کی ہیکل تنظیمی کے بغیر ہم انھیں پوری طرح اپنا نہیں سمجھ سکتے۔ اس بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ کوئی شخص مرید صرف بیعت کے سبب نہیں ہوتا بلکہ مرید ہونا تو ایک ذہنی سطح کا نام ہے، اگر کسی تنظیم سے وابستگان ذہنی طور پر اس کیفیت کے حامل ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ انھیں محض ضابطے کی کاروائی کا بہانہ بنا کر مسترد کردیا جائے۔ بلکہ ہمارا کام تو دوسری تنظیموں کو بھی شیخ پرستی کی اسی سطح پر لانا ہے، انھیں اس بات کا یقین دلانا ہے کہ علم وحکمت کی فراوانی ان کے اکابرین اور بانیوں پر ختم ہوئیں۔ مشائخ پرستی جہاں بھی ہو، جس شکل میں بھی ہو، ہمارے کام کی ہے۔ اور ہاں آخر میں بڑے قلق کے ساتھ ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ گذشتہ سال بھی میں نے آپ حضرات کی توجہ اس طرف دلائی تھی کہ انٹرنیٹ کا استعمال جہاں ہمارے لیے نوعمروں میں پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے وہیں بڑا صبر آزما امتحان بھی۔ ایسی سائٹوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے جہاں ارادت میں داخلے اور فیوض وبرکات کے حصول کے لیے رقوم کی طلبی کی بھوک بڑھتی جاتی ہے۔ یہ چیزیں اہل صفا کے بارے میں کچھ اچھا تاثر قائم نہیں کرتیں۔ کاش کہ ہم فتوح ونیاز کے روایتی سلسلے کو روایتی انداز سے ہی جاری رکھتے۔ لستم پوخ کا یہ اجلاس تمام ستر طرقِ تصوف کے بانیوں کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہے اور اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اہل بیت اطہار کا علم ہمیشہ بلند رکھے گا۔

قطب الاقطاب نے اپنی گفتگو کے بعد فضا میں ہاتھ لہرا کر یا علیؑ کا نعرہ بلند کیا جس کے جواب میں پوری مجلس یا علیؑ یا علی کے پرجوش نعروں سے گونج اٹھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈائس سے اپنی نشست پر واپس جاتے، اسٹیج پر بیٹھے دوسرے تمام قطب اٹھ کھڑے ہوئے اور یکے بعد دیگر فدویانہ انداز میں ان کی دست بوسی کرتے رہے۔ مجلس یا غوثاہ! یا غوثاہ! یا قطب الاقطاب کے نعروں سے گونجتی رہی۔ اس دوران حاضرین کی اگلی صفوں میں سے کچھ لوگ اسٹیج پر پہنچ چکے تھے۔ قرائن بتا رہے تھے کہ افتتاحی اجلاس اب اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ دریں اثناء اسٹیج کی بائیں جانب سے، جہاں میدانی علاقہ کا احساس ہوتا تھا، ایک سیاہ رنگ کی کار نمودار ہوئی۔ میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ اکابرین مجلس جلسہ گاہ سے رخصت ہوں، سلام وکلام اور مصافحہ کی سعادت حاصل کرلی جائے سو اس خیال سے میں تیزی سے اپنی نشست سے اٹھا اور اسٹیج کی جانب ناہموار ڈھلان طئے

کرنے لگا۔لیکن یہ جان کر سخت افسوس ہوا کہ جلسہ گاہ کے اگلے حصہ کو ہم درویشوں کی آمد کے لیے بند رکھا گیا تھا۔اوپر سے اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے، بے رنگ فائبر کے اس پارٹیشن کا اندازہ نہ ہوسکا تھا۔ میں تیزی سے اوپر چڑھتا ہوا دوبارہ اپنی نشست پر پہنچا۔ میرے حواس پر قطب کے گرد روحانیوں کا ہجوم اور وہ سیاہ کار چھائی ہوئی تھی جو چند ہی ثانیے بعد وہاں سے نکلنے والی تھی۔ میں اس محرومی سے بچنا چاہتا تھا۔ سو تیز تیز قدموں کے ساتھ خیمے سے باہر آیا اور تیزی کے ساتھ بیرونی گیٹ کی طرف لپکا۔ مجھے دیکھ کر وہی ترک لڑکی میری طرف تیز قدموں سے چلتی آئی لیکن میرے پاس ابھی اس سے گفتگو کے لیے وقت نہ تھا اور اب میری چال اس کی رفتار سے کہیں تیز تھی۔ میں آناً فاناً بیرونی دروازے سے باہر آیا لیکن نکلتے ہی اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا کہ یہاں سے نیچے اترنے یا اسٹیج تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

۲۸

اولوداغ سے واپسی

اولوداغ کے میدانی علاقے میں واپس آ کر مجھے ایسا لگا جیسے میں اب تک جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ موسم قدرے خنک تھا۔ سیاحوں کے غول، نوجوان جوڑے، ہنستے کھیلتے بچے، جنہیں میں آتے وقت ان پگڈنڈیوں پر چھوڑ آیا تھا وہ سب غائب ہو چکے تھے۔ برقی روشنی کی ایک سبز لکیر ان پگڈنڈیوں کو ہوتی ہوئی واک وے کو جاتی تھی۔ واک وے پر چلتے ہوئے گو کہ میں بآسانی اپنی قیام گاہ پہنچ گیا لیکن پگڈنڈیوں کے برعکس یہ راستہ خاصا طویل تھا۔ مصطفیٰ اوغلو بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگا لیا، پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولے:

mission accomplished!

رات دیر تک ہم لوگ اس اجلاس کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے گفتگو کرتے رہے۔ میں چاہتا تھا کہ صبح دوبارہ اس مقام پر چلا جائے تا کہ اطلاقی اجلاس کے محل وقوع کا کچھ پتہ چل سکے لیکن مصطفیٰ اوغلو کا کہنا تھا کہ اب وہاں کچھ بھی نہ ہوگا ٹورسٹ ایجنسیاں پروگرام کے فوراً بعد کمال سرعت کے ساتھ راتوں رات جلسہ گاہوں کو لپیٹنے میں ید طولیٰ رکھتی ہیں۔

اگلی صبح ہم لوگوں نے اولوداغ کو خیر باد کہا۔ آج شام استنبول سے میری واپسی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ جلد سے جلد استنبول واپس پہنچوں لیکن ٹیلی فیرک کی پہلی سروس صبح آٹھ بجے سے شروع ہوتی تھی۔ برسا واپسی پر شیخ

سعود کی یاد آئی۔ اسکندر کباب کی ضیافت کو پھر جی چاہا۔ خواہش تھی کہ کچھ دیر رک کر ترک عثمانیوں کے پرانے دارالحکومت کے بعض آثار کو ملاحظہ کروں۔ لیکن تنگیٔ وقت کے سبب صرف اسکندر کباب پر اکتفا کرنا پڑا۔

گوزی لیالی سے استنبول کے بحری سفر پر اب ہمارے سروں سے وہ سبز مائل پرندہ غائب ہو چکا تھا۔ سفر کی سریت ختم ہو چکی تھی۔ زندگی عام انسانی شب و روز میں لوٹ آئی تھی۔ ساحل کا نظارہ، آرکی پلیگو کا حسن، آفتاب کی تمازت میں سطحِ آب کو چھوتی ہوئی ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے انبساط کی وہی کیفیت پیدا کر رہے تھے حتیٰ کہ گاہے بگاہے عرشے پر پرندوں کی آمد بھی دکھائی دے جاتی تھی۔ لیکن اب یہ سب کچھ کسی صوفیانہ سریت سے خالی تھا۔ جب ابدال واوتاد کی کانفرنس میں اور قطب الاقطاب کے سالانہ جلسے میں ان آنکھوں نے عام انسانی ہیولے دیکھے جو ہر اعتبار سے اصحاب تدبیر وترکیب تھے، اصحاب کشف وکرامت نہ تھے تو بھلا سبز پرندے کی سرّیت کیوں کر برقرار رہ پاتی۔ روحانیوں کی داخلی سیاست، ان کے باہمی اختلافات اور ان کے عزم بالجزم کے آنکھوں دیکھے حال نے سرّیت کی وہ نقاب اتار پھینکی تھی، وہ احساسات زائل ہو گئے تھے جو بچپن سے کسی مجذوب کے بارے میں یہ سن کر پیدا ہوتے تھے کہ ان صاحب کا تعلق قطب وابدال کے اندرونی حلقے سے ہے۔ البتہ یہ بات کل رات سے مجھے مسلسل پریشان کر رہی تھی کہ قطب الاقطاب کا یہ دعویٰ کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے کہ درود ان کی ایجاد ہے۔ ہم بچپن سے ہی درودِ براہیمی پڑھتے آئے ہیں حتیٰ کہ یہ نماز میں شامل ہے۔ روحانیوں کی یہ اسمبلی اس کے ایجاد کا سہرا اپنے سر کیسے لے سکتی ہے؟

مصطفیٰ اوغلو کافی کا پیالہ لے آئے تھے۔ مجھے خاموش اور متفکر دیکھ کر کہنے لگے: لگتا ہے آپ ابھی اجلاس کے ماحول سے نکل نہیں پائے ہیں۔ میں نے ان سے اپنی الجھن کا ذکر کیا۔ کہنے لگے مجھے ان کے اس ادعا پر بالکل حیرت نہیں ہوئی۔ میں بہت دنوں سے اس سوال پر غور کرتا رہا ہوں۔ اس بارے میں تاریخ وآثار اور تفسیر وتاویل کی ساری کتابیں دیکھ ڈالیں لیکن کوئی فیصلہ کن بات کہنے میں تذبذب کا شکار تھا۔ اب جو آپ نے یہ بات بتائی کہ درود کی ایجاد پر ان حضرات کا دعویٰ ہے تو مجھے کچھ حیرت نہ ہوئی، بلکہ اس دعوے سے میرے تحقیقی نتائج کی توثیق ہوئی ہے۔ یہ جو آپ مختلف قسم کے درود عامۃ الناس کی زبان پر جاری دیکھتے ہیں؛ کوئی درود تاج پڑھ رہا ہے کوئی درود لکھی کے ورد میں مصروف ہے، کسی نے درود سریانی اور کسی نے درود ہزیانی لکھ رکھی ہے اور کسی کا دعویٰ ہے کہ اس نے درود کا سب سے بڑا مجموعہ ترتیب دیا ہے یا اسی قبیل کی دعائے گنج العرش، دعائے جمیلہ اور نہ جانے کیسے کیسے دعا و درود کے بے شمار مجموعے امت میں شائع ومقبول ہیں، یہ سب کچھ ایجاد بندہ کی

قبیل ہی سے تو ہیں۔

لیکن ان مجموعوں کو تو ثقہ علماء مستند نہیں جانتے، میں نے مصطفیٰ کو لگام دینے کی کوشش کی۔

بولے: اول تو ثقہ علماء کا رویہ اس بارے میں واضح نہیں۔ مثلاً بعض لوگ درود تاج کو شرکیہ کلمات کے سبب نا قابل التفات جانتے ہیں لیکن بعض کہتے ہیں کہ اگر اس کی کوئی اچھی سی تاویل کر لی جائے تو کچھ حرج نہیں۔ دوسری بات یہ کہ جو لوگ ان تراشیدہ دعاء و درود کے قائل نہیں وہ بھی درودِ براہیمی کو تو مستند جانتے ہیں نا؟ وہ اسے اپنی نمازوں میں شامل کرتے ہیں۔

تو کیا آپ درودِ براہیمی کو روحانیوں کی ایجاد سمجھتے ہیں؟ میں نے مصطفیٰ اوغلو سے پوچھا۔

جی ہاں میں تو اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں، انھوں نے کہا۔ پھر فرمایا: دیکھئے درودِ براہیمی دو وجہوں سے تاریخ اور وحی کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ قرآن میں دعائے براہیمی پڑھیئے۔ حضرت ابراہیم نے اپنی ذریت پر فضل و انعام کی بارش کی دعا کی۔ لیکن خدا کے ہاں سے صاف جواب آ گیا کہ محض ذریت کا حوالہ فضل و انعام کی ضمانت نہیں بن سکتا: لا ینال عهدي الظالمين۔ اب دوسرا سوال آل سے متعلق ہے۔ ابراہیم کی آل پر تاریخ اور وحی دونوں سے شہادت ملتی ہے جبکہ محمدؐ کی آل کے متعلق قرآن اور تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ بسب مصلحت خداوندی آپ کا نسلی سلسلہ آپ پر ہی ختم ہو گیا۔ قرآن کا اعلان ہے کہ محمدؐ تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں: ما كان محمد أبا أحد من رجالكم۔ جب آل محمدؐ ہی دنیا میں موجود نہ ہوں تو پھر ان پر صلوٰۃ وسلام کے کیا معنی؟

پھر آپ قرآن کی اس آیت کا کیا کریں گے جس میں مومنین سے کہا گیا ہے کہ خدا اور اس کے فرشتے رسولؐ پر صلوٰۃ وسلام بھیجتے ہیں سوائے مومنو! تم بھی ان پر صلوٰۃ وسلام بھیجو۔

میرا یہ اعتراض سن کر مصطفیٰ اوغلو مسکرائے۔ بولے سارا مسئلہ تو اسی آیت کی تاویلات باطلہ کا پیدا کردہ ہے۔ اب دیکھئے قرآن نے سیدھی سی بات کہی تھی: إن اللـه و مـلائكته يصلون على ا لنبي کہ اللہ اور اس کے فرشتے نبی کی صلوٰۃ کرتے ہیں سوائے مومنو! تم بھی ان کی صلوٰۃ و اتباع کرو۔ اب دیکھئے پانی مرتا کہاں ہے۔ قرآن مجید میں صلوٰۃ کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک تو یہی نماز والی عبادت کے معنی میں؛ جیسے فرمایا إذا نـو دي لـلـصلوٰة من يوم الجمعة فاسعوا إلـي ذكرالله کہ جب تمہیں جمعہ کی نماز کے لیے پکارا جائے تو خدا کے ذکر کے لیے دوڑ پڑو۔ صلوٰۃ کے دوسرے معنیٰ پشت پناہی اور نصرت کے ہیں۔ یہاں اس

آیت میں یہی دوسرا مفہوم مراد ہے۔ یعنی خدا اور اس کے فرشتے رسول کی پشت پناہی کرتے ہیں، مومنوں سے مطالبہ ہے کہ وہ بھی رسول کی پشت پناہی اور اتباع کا کام جاری رکھیں۔ اب دیکھئے خدا اور اس کے فرشتوں کی پشت پناہی صرف یصلون یعنی نصرت وحمایت تک ہے جبکہ مومنین سے نصرت وحمایت یعنی صلوا علیہ کے علاوہ سلموا تسلیما یعنی اتباع کامل کا بھی مطالبہ کیا جارہا ہے۔ اب قرآن کے اس سیدھے سے مفہوم پر روایت نے کچھ اس طرح پردہ ڈالا کہ اس کا مفہوم مسخ بلکہ بے معنی ہو کر رہ گیا۔

اس روایت کی شان نزول یہ بتائی گئی کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو بعض صحابہ نے رسول اللہ سے پوچھا کہ اے خدا کے رسول ہمیں خدا نے آپ پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کا حکم دیا ہے۔ بتایئے کہ ہم یہ کیسے کیا کریں۔ راوی کہتا ہے کہ آپؐ اس سوال پر کچھ دیر خاموش رہے پھر انھوں نے ہمیں دعائے براہیمی کی تعلیم دی۔ اب اگر آپ اس قصہ پر ایمان لے آئیں تو اس آیت کا بنیادی پیغام اور مومنین سے خدا کا یہ مطالبہ محو ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس آیت کی تفہیم میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر خدا کا مطالبہ مومنین سے محض زبانی صلوٰۃ وسلام کا پڑھنا ہے تو کوئی بتائے کہ خدا کی صلوٰۃ کا کیا مفہوم ہے۔ کیا خدا بھی اپنے رسول پر اللھم صل علی محمد پڑھتا ہے۔ ہے نا یہ ایک لغو سی بات! لیکن اکثر لوگ جوشِ عشق رسول میں ان باتوں پر غور نہیں کرتے اور ان قصے کہانیوں پر ایمان لے آتے ہیں جن کا مقصد رسول اللہ اور ان کے مشن کی عملی حمایت اور نصرت کے بجائے لوگوں کو زبانی جمع خرچ کے عمل میں مبتلا کرنا ہے۔ اب آپ لاکھ درود لکھی پڑھتے رہیں، اس عمل میں آپ کو اپنی نجات یا دنیا میں مال و دولت سمیٹنے کی ترکیب تو نظر آسکتی ہے، رسولؐ اللہ اور آپؐ کے مشن کی نصرت وحمایت کا کوئی سامان پیدا نہیں ہوتا۔

مصطفیٰ اوغلو کی یہ باتیں میرے لیے انکشاف کا درجہ رکھتی تھیں۔ ان کی باتوں میں وزن تھا۔ میں نے سوچا کہ جب ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو کیوں نہ ان کی تاریخی معلومات سے فائدہ اٹھایا جائے کہ ابتدائی صدیوں کی مسلم دانشوری پر ان کی گہری نظر ہے۔ میں نے ان کی تحقیق کو فی الفور قبول کرنے کے بجائے ان سے پوچھا کہ اچھا یہ بتایئے، کیا ابتدائی صدیوں میں درود براہیمی ہماری نماز کا حصہ نہ تھا؟

بولے: تاریخی مصادر اس بات پر شاہد ہیں کہ کم از کم ابتدائی دو صدیوں میں مسلمان تشہد کے بعد کوئی اور دعا پڑھتے یا بس یوں ہی اٹھ جاتے۔ روایات و آثار کی متداول کتابوں میں بھی عبداللہ بن مسعود کے حوالے سے منقول ہے کہ رسول اللہ نے انھیں تعلیم دی کہ اگر نماز کے درمیان میں ہو تو تشہد سے فارغ ہوتے ہی

کھڑے ہو جاؤ اور اگر نماز کے آخر میں ہو تو تشہد کے بعد جو دعا چاہو مانگو پھر سلام پھیر دو: ان كان في وسط الصلوة فانهض حين تفرغ من تشهدك و إن كنت في آخرها ادع بعدتشهد بما شاء الله ان تدعو ثم سلم۔ بعض دوسری روایتوں میں الفاظ یوں آئے ہیں: و يستخير أحدكم من الدعاء ماأعجبه الله ثم ليدع الله عزوجل یعنی پھر اختیار کرلو کوئی دعا جو تمہیں پسند ہو اور مانگو اللہ عزوجل سے۔

آل محمدؐ ایک منضبط نظریے کی حیثیت سے دعوت فاطمی کی کامیابی کے بعد سامنے آیا۔ وہاں بھی سارا زور آل فاطمہؓ پر تھا البتہ رسول اللہ کے وہ اقارب جو قرابت داری کے حوالے سے خلافت پر اپنا حق سمجھتے وہ اپنے آپ کو اہلِ بیت کی وسیع اصطلاح سے مزین کرتے۔ اس میں عباسی بھی تھے اور علوی بھی، حضرت علی کی فاطمی اولاد بھی تھی اور غیر فاطمی بھی۔ اسلام کی ابتدائی ڈھائی صدیوں میں مولود نبیؐ اور عیدِ فاطمہ جیسی چیزیں متشکل نہ ہوئی تھیں۔ فاطمی خلافت کے قیام کے بعد سرکاری سطح پر آل بیت اطہار کی فضیلت کے پرشور چرچے ہوئے۔ آنے والے دنوں میں آلِ محمدؐ اور اہل بیت کے تصور کو مذہبی اور تقدیسی حیثیت مل گئی، اور جب آل محمدؐ پر صلوٰۃ و سلام بھیجنا جزوِ دین بن گیا تو پھر ان کی روحانی سیادت کو کون چیلنج کر سکتا تھا۔ لہٰذا عالم اسلام کے مختلف حصوں میں سادات کی وہ فراوانی ہوئی کہ مت پوچھیے۔ صلوٰۃ وسلام کا یہ سلسلہ اس حد تک وسیع ہوا کہ ہر شخص نے درود و وظائف کا ایک مجموعہ تیار کر ڈالا۔ پیروں نے اپنے مریدوں کو قرآن مجید کے بجائے قصیدہ بردہ، دلائل الخیرات اور حزب البحر جیسی کتابوں کی تلاوت کی تلقین کی۔ یہ تمام قصائد دراصل درود ہی کا توسیعہ تھے، ہر درود، ہر قصیدے اور ہر دعا سے کثیر فوائد کا حصول یقینی بتایا جاتا تھا۔ ان دعاؤں اور قصائد میں رسول اللہ سے استعانت طلب کی جاتی۔ بعض سمجھ دار لوگ اس پر ناک بھوں چڑھاتے۔ لیکن سکہ بند علماء نے ان کتابوں کو سند بخش رکھی تھی، ان کا کہنا تھا کہ انھوں نے اپنے بزرگوں کو ان کتابوں سے اشتغال کرتے دیکھا ہے۔ درودوں کے یہ مجموعے اور قصائد و وظائف کے یہ دفاتر آج بھی امت کے خواص و عوام میں یکساں مقبول ہیں۔ سو یہ جو ان کا دعویٰ ہے کہ ہم نے درود ایجاد کیا، رسول کو خدا کے برابر رکھ دیا، یہ دعویٰ صداقت سے خالی نہیں۔

تو کیا آپ اوراد و وظائف کے مجموعوں کے پیچھے بھی کسی باضابطہ اسکیم کی کارفرمائی دیکھتے ہیں؟ میں نے اپنی مداخلت جاری رکھی۔

بولے: فاطمی تحریک سے لے کر آج تک جب آل بیت کے حوالے سے امت کے نظری اور فکری سرمایے پر شب خون مارنے کا سلسلہ جاری ہو تو اس امکان سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اوراد و وظائف اور

شعر وقصائد کا یہ سارا دفتر میرے نزدیک اسی درودی اسلام کا توسیعہ ہے جس میں استعانت طلبی کے لیے خدا کے ساتھ ساتھ رسولؐ کی ذات کو بھی شامل کیا گیا۔ رسولؐ کی شمولیت بھی اس خیال سے ہوئی تا کہ آل رسول کے حوالے سے سادات کا روحانی اقتدار مستحکم ہو سکے۔ قصیدہ بردہ، دلائل الخیرات اور حزب البحر جیسی کتابیں بے شمار فضائل کی حامل بتائی گئیں۔ گویا یہ کتابیں نہ ہوں بلکہ ثواب تیار کرنے کے سریع الحرکت کارخانے ہوں جہاں مومنین کو ایک ہی جست میں بے شمار مالی فوائد اور اخروی نجات کی بشارت دی گئی۔ مثال کے طور پر بوصیری کو لیجیے، کہا جاتا ہے کہ اس قصیدے سے خوش ہو کر رسول اللہ نے خواب میں ان کے مفلوج جسم کو چادر سے ڈھک دیا۔ صبح جب یہ اٹھے تو ان کی بیماری جاتی رہی۔ جزولی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بار ایک کنویں کی منڈیر پر وضو کے لیے گئے۔ پانی کی سطح کافی نیچے تھی۔ مایوس لوٹنے لگے تو ایک نوعمر لڑکی نے انھیں یہ طعنہ دیا کہ جس شخص کے زہد و تقویٰ کا اتنا شہرہ ہوا سے کنویں سے پانی نہ ملے اور یہ کہتے ہوئے اس نے کنویں میں تھوک دیا۔ اس لڑکی کا تھوکنا تھا کہ کنویں کا پانی ابلتا ہوا منڈیر تک آ گیا۔ جزولی نے وضو کیا اور پوچھا کہ تیری اس کرامت کا راز کیا ہے۔ بولی: اس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ میں رسول اللہ پر بے شمار درود بھیجتی ہوں۔ تبھی جزولی نے طے کیا کہ وہ درود کا ایک بے مثل مجموعہ مرتب کریں گے۔ دلائل الخیرات جو مراقش کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک غیر معروف صوفی کے ہاتھوں مرتب ہوا، زیرزمین صوفی تنظیم کے ذریعہ دیکھتے دیکھتے بڑے پیمانے پر شائع اور مقبول ہو گیا۔ حکمرانوں نے اس کے قیمتی منقش نسخے تیار کروائے اور اسے اپنے پاس رکھنا باعث خیر و برکت سمجھا۔ عوام و خواص کا بیشتر وقت ان جیسی کتابوں سے اشتغال کی نذر رہا۔ اور خدا کی منزل وحی طاق نسیاں کی زینت بن گئی۔

مصطفیٰ اوغلو کا بیان جاری تھا اور میں محو حیرت تھا کہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ مجھے ہمہ تن متوجہ اور خاموش دیکھ کر بولے: معاف کیجیے گا میں تو تقریر کرنے لگا۔

میں نے کہا: آپ نے بڑے اہم مسائل چھیڑ دیے ہیں۔ ہماری پوری مذہبی ثقافت پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ دیکھیے بڑا نازک اور حساس معاملہ ہے۔ رسول اللہ کی محبت ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ اسے روحانیوں نے جس طرح patent کر رکھا ہے اور اس پر اپنے فریب اور عزائم کا جس خوبصورتی کے ساتھ پردہ ڈال رکھا ہے اسے ہٹانا بڑی احتیاط کا طالب ہے۔

انھوں نے میری اس بات سے اتفاق کیا۔ بولے: آپ کا اندیشہ بجا ہے۔ آج عام مسلمان تو کجا بڑے

بڑے اہل فکر کے لیے بھی اس بات کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ عشقِ رسولؐ کے یہ سماجی مظاہر، جنہیں ہم مذہبی سرگرمیوں پر محمول کرتے ہیں، رسول اللہ کے مشن سے مغائر بلکہ اس کی معطّلی پر دال ہیں۔ بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی روبہ عروج ہے۔ میلاد کی مجلسیں، عرس کے ہنگامے، چِلّے، گشت، نعت، منقبت، قوالی، نوحے، اجتماعات... گویا مذہبی زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جاری ہے۔ شعر و نغمہ کی اثر انگیزی کا یہ حال یہ ہے کہ سماع کی محفلیں اب بلاد مغرب کے باسیوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔ بعض دینی تنظیموں کے اجتماعات میں اژدہام کا یہ عالم ہے کہ اب اس پر حج کے عالمی اجتماع کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن یہ تمام مظاہر ایک فریب نظر کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ درودی اسلام کے مظاہر ہیں۔ روحانیوں کا تراشیدہ اسلام--- جس کے پیدا کردہ التباسات کی دھند میں اصل اسلام کی بازیافت اب کچھ آسان نہیں۔

مصطفیٰ اوغلو آج موڈ میں تھے۔ ان کا بیان ایک آبشار کی طرح جاری تھا۔ جی تو چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح بولتے رہیں اور میں سنتا رہوں، لیکن ہمارا سفینہ اب Yenikapi پہنچ چکا تھا۔ ہمیں ہوٹل پہنچنے کی جلدی تھی، واپسی کے لیے سامان سفر درست کرنا تھا۔ مصطفیٰ اوغلو کو یہ فکر ستا رہی تھی کہ قدیم عربی کتابوں کا وہ تحفہ جو مکتبہ الحقیقہ کی طرف سے میرے لیے موصول ہوا تھا وہ یہیں استنبول میں نہ رہ جائے۔ Yenikapi سے میں سیدھا ہوٹل پہنچا اور وہ کتابوں کے ساتھ ائیر پورٹ پر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے۔ ائیر پورٹ جاتے ہوئے راستہ بھر خیالات کا ہجوم رہا۔ استنبول میں گزرے ہوئے وہ پچھلے گیارہ دن، جن میں پچھلی گیارہ صدیوں کے جیتے جاگتے تہذیبی اور فکری منظر ناموں کی جھلک نظر آتی تھی، اب ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کی حقیقت گیارہ ساعت سے زیادہ نہ رہی ہو۔ کسے معلوم تھا کہ پلک جھپکتے یہ گیارہ دن اس طرح گزر جائیں گے۔

۲۹

آخری اعلان

ٹرکش ائیرلائنز کے کاؤنٹر پر مصطفیٰ اوغلو کو کتابوں کے پیکٹ کے ساتھ اپنا منتظر پایا۔ جیسے تیسے چیک اِن کی رسمی کارروائی سے فارغ ہوئے۔ بوجھل دل اور نم آنکھوں کے ساتھ اپنے میزبان سے رخصت لی۔ ایمیگریشن کی کارروائی سے فارغ ہوکر متعلقہ جہاز کی انتظارگاہ میں آیا۔ جلدی جلدی کتابوں کا پیکٹ کھولا۔ بعض نادر عربی کتابوں کے نئے ایڈیشن پا کر یک گونہ خوشی ہوئی۔ کتاب مواقیت الصلوٰۃ الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کتاب میں ریاضی کے بعض دقیق مسائل، مثلث کروی کے حل اور مختلف پیچیدہ دائروں کے ڈائیگرام دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ اوقات صلوٰۃ کے تعین کا یہ باریک بیں اور پیچیدہ چارٹ جو آج ہماری مسجدوں میں کرم خوردہ دفتی پر قدامت کی علامات کے طور پر آویزاں رہتا ہے، مسلمان ریاضی دانوں نے اس کی ترتیب و تشکیل میں کتنی مشقتیں جھیلیں، کتنے ایکوئیشن ایجاد کیے، تب کہیں جا کر قطب کے گرد مدارِ شمس کا صحیح اندازہ ہوا اور اس طرح اطراف واکناف سے قبلہ کا تعین ممکن ہوسکا۔ ایک قدیم عربی کتاب جس سے کبھی ہماری مسجدوں کے موقّیت اشتغال کرتے، بلکہ اپنی فنکارانہ مہارت کے سبب اسے خوب تر بنانے کی کوشش جاری رکھتے، مسلمانوں کا یہ علمی ورثہ خود ان کے لیے آج کتنا اجنبی بن گیا ہے؟ میں جوں جوں اس کتاب کے اوراق الٹتا گیا، اپنے قدیم علمی ورثے کی اس تابانی پر میری حیرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ کبھی وہ دن تھے جب ہم قطب سے مدارِ شمس کا زاویہ معلوم کرتے۔ تب لیل ونہار کی ہر گردش پر ہمیں اپنی گرفت محسوس ہوتی۔ آج ہم قطب و

ابدال کے جال میں پھنسے خود کو گردشِ ایام کے رحم وکرم پر پاتے ہیں۔ روحانیوں نے رفتہ رفتہ ہمارے اکتشافی ذہن کو کچھ اس طرح متاثر کیا کہ ہم نے قرآن کی دعوتِ اکتشاف سے منھ موڑ کر مکاشفے اور مجاہدے کو اپنا ہدف قرار دے ڈالا۔ دین کے نام پر ایک ہلوسہ ہمارے تعاقب میں رہا۔ نتیجتاً حقیقی دنیا میں ہم اقوام عالم پر اپنی سبقت برقرار نہ رکھ پائے۔ بحیثیتِ امت سیادت کے منصب سے ہماری معزولی عمل میں آ گئی۔ روحانیوں کی سلطنت اپنی تمام تر جاہ وحشم کے ساتھ آج بھی قائم ہے بلکہ اس کی فتوحات کے سلسلے مسلسل وسیع ہوتے جا رہے ہیں۔ البتہ اسلام کی آفاقی دعوت اور مسلمانوں کا اکتشافی ذہن صدیوں سے منجمد اور معطل ہے۔

جب تک عام مسلمانوں پر یہ حقیقت منکشف نہیں ہوتی کہ دینی زندگی کے مروجہ مظاہر، روحانیوں کی بیعت وکرامت کے سلسلے، دراصل اسلام نہیں بلکہ اسلام کی نفی کے پختہ انتظامات ہیں، جب تک رسالہ محمدی کی بازیافت کے لیے ایک عمومی بے چینی پیدا نہیں ہوتی، ایک نئی ابتدا کا سامان کیسے ہوسکتا ہے؟ حقیقت پر التباسات کی دھند مسلسل گہری ہوتی جاتی ہے۔ عرصہ سے وحی کے صفحات بند ہیں۔ عقل مکاشفوں کی زد میں ہے، اور تاریخ کے روایتی مطالعہ میں یہ دم خم نہیں کہ وہ اسلام پر روحانیوں کے شب خون سے پردہ اٹھا سکے۔

مقبول عام تاریخ جب یہ بتانے سے قاصر ہو کہ اہل صفا کی تمام دوڑ دھوپ بلکہ ان کا ظہور دراصل سیاسی اقتدار کے استحکام کے حوالے سے ہوا تو پھر تاریخ کے ایک عام طالب علم کو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ شمس کے پردے میں رومی دراصل اپنے اسمعیلی امام شمس الدین کی اتباع کا دم بھرتے ہیں جو سقوط الموت کے بعد اپنی اصل شخصیت پر پردہ ڈالنے پر مجبور تھے۔ مقبول عام تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ صوفیا ہمیشہ سیاسی اقتدار سے گریزاں رہے، حاکم وقت سے انھوں نے دوری بنائے رکھی۔ لیکن تاریخ کا گہرا مطالعہ اور تاریخی وثائق کا تحلیل وتجزیہ ہمیں اس بات پر مطلع کرتا ہے کہ فرقہ مولویہ کے صوفیاء کے ترک خلفاء سے قریبی تعلقات رہے ہیں بلکہ بعضوں نے ان سے قرابت داری کے رشتے بھی پیدا کیے۔ ان کی ایماء پر حساس عہدوں پر تقرریاں عمل میں آتی رہیں۔ حتیٰ کہ خلافت کے آخری ایام میں مولوی بٹالین نے مسلح جدوجہد کی اپنی سی سعی بھی کر ڈالی۔ حلاّج سے شہاب الدین مقتول تک کبار صوفیاء کے قتل کے پیچھے نظری سے کہیں زیادہ سیاسی اسباب کارفرما تھے۔ سرمد، مخالف سیاسی کیمپ میں ہونے کے سبب تختہ دار تک پہنچے اور سلاطین دہلی کو نظام الدین اولیاء سے جو پرخاش تھی، اس کے پیچھے بھی سیاسی اسباب کارفرما تھے۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ غزالی پر جب دنیا کی بے وقعتی ظاہر ہوگئی تو انھوں نے نظامیہ بغداد کی کرسی چھوڑ کر تصوف کے دامن میں پناہ لی۔ غزالی نے المنقذ من الضلال میں یہی

تاثر دینے کی کوشش کی ہے۔ البتہ اس عہد کے مختلف سیاسی وثائق پر جن لوگوں کی گہری نظر ہے وہ اس بات سے واقف ہیں کہ غزالی کا ترک دنیا اور نظامیہ بغداد سے ان کی کنارہ کشی دراصل اچانک تبدیل ہوتے ہوئے سیاسی منظرنامے کے سبب تھی۔ غزالی فضائح الباطنیة کے مصنف تھے، اسمٰعیلیوں کے خلاف ان کے قلم نے بڑے جوہر دکھائے تھے۔ جب ان کے مربی نظام الملک اسمٰعیلی فدائین کے ہاتھوں اپنی جان کھو بیٹھے تو غزالی کے لیے ایسی صورت میں بغداد سے فرار ہونے کے علاوہ اور کوئی چارا نہ رہا۔ وہ حج کے بہانے ترکِ دنیا کا پروپگنڈہ کرتے ہوئے بغداد سے نکل گئے۔ اس سفر میں وہ مکہ تک تو نہ پہنچے البتہ ان کے زہد وتقویٰ اور ترک دنیا کا وہ چرچا ہوا کہ فریق مخالف کے لیے ان کی ذات میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ حقیقت کیا کچھ ہوتی ہے اور نظر کیا کچھ آتی ہے۔ بارالہا! یہ کیسا بھید ہے۔

ابھی میں ان ہی خیال میں کھویا تھا کہ مائکروفون پر لاسٹ کال کی صدا بلند ہوئی۔ ائیر لائنز کے ایک کارندے نے میرا شانہ تھپتھپایا: بورڈنگ مکمل ہو چکی ہے، آپ آخری مسافر ہیں!

میں چونک کر اٹھا، تیز تیز قدموں سے جہاز تک آیا۔ استنبول چھوڑتے ہوئے میری نگاہوں میں وہ گیارہ دن اور ان سے ملحقہ گیارہ صدیاں جھلملانے لگیں۔ لاسٹ کال کے اعلان پر اگر میں بروقت بیدار نہ ہوا ہوتا اور کوئی میرا شانہ نہ تھپتھپاتا تو شاید میرا جہاز چھوٹ جاتا۔ کاش کہ یہ خوابیدہ امت بھی لاسٹ کال کا بروقت اعلان سن سکے۔ کوئی اس کا شانہ تھپتھپائے اور کہے کہ مراقبہ اور مکاشفہ میں صدیاں گزریں، اگر اب بھی بیدار نہ ہوئے تو ایک بار پھر سیادت وامامت کا جہاز چھوٹ جائے گا۔